سیداحمد شہید

کی

صحیح تصویر

AFGHANISTAN
PAKISTAN
INDIA
BURMA

وحید احمد مسعود

سیّد احمد شہید

کی

صحیح تصویر

وحید احمد مسعود

رضا پبلی کیشنز لاہور

بیاد : امام اہل سنت مجدد دین وملت، نائب غوث اعظم

امام احمد رضا خان قادری بریلوی قدس سرہ العزیز

بفیضان نظر: حکیم اہل سنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری علیہ الرحمۃ

کتاب ------- سید احمد شہید کی صحیح تصویر

مصنف ------- وحید احمد مسعود

تعارف ------- پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری

صفحات ------- 244

تعداد ------- گیارہ سو

اہتمام ------- صاحبزادہ میاں زبیر احمد علوی گنج بخشی قادری ضیائی

اشاعت چہارم ------- ماہ غوث اعظم ۱۴۲۴ھ، جون 2003ء

ناشر ------- رضا پبلی کیشنز۔ لاہور

قیمت ------- ۱۲۰/- روپے

تقسیم کار

فرید بکسٹال۔ اردو بازار۔ لاہور

اس کتاب کے اس سے قبل تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، تیسرا ایڈیشن اکتوبر ۱۹۶۷ء میں مکتبہ مسعود، مسجد گراؤنڈ رام گڑھ لاہور نے شائع کیا تھا، پھر کچھ عرصہ بعد کتاب کے مصنف شیخ وحید احمد مسعود فریدی صابری بدایونی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۹۷۷ء) نے اس کتاب میں ترمیم و اضافہ کے بعد تصحیح شدہ و مستند نسخہ حضرت مخدومی حکیم محمد موسیٰ امرتسری علیہ الرحمۃ، لاہور (متوفی ۱۹۹۹ء) کو ارسال فرمایا۔ اسی تصحیح شدہ نسخہ کو احقر راقم الحروف نے بڑی دیدہ ریزی سے دوبارہ صاف کر کے نقل کیا، تصحیح شدہ نسخہ بقلم مصنف علیہ الرحمۃ جناب میاں زبیر احمد علوی گنج بخشی قادری ضیائی مدظلہ لاہور کے پاس محفوظ ہے۔

خلیل احمد رانا

جہانیاں

پیش گفتار

جناب "سید احمد شہید" اور ان کی "تحریک جہاد" کے بارے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ ان کے عقیدت مندوں اور ان کی تحریک جہاد کے روح رواں جناب شاہ محمد اسمٰعیل صاحب کے مقلدوں کے اذہان کی پیداوار ہے اور ہر تذکرہ نگار نے اپنا نیا راگ الاپا ہے، کسی نے بھی عقیدت کی عینک اتار کر اصلیت تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ سارا زور قلم سید صاحب کو مامور من اللہ، معصوم عن الخطاء، مجدد وقت، امام زمان اور تحریک آزادی کا ہیرو ثابت کرنے میں صرف کر دیا ہے، مگر پھر بھی نتیجہ لاحاصل اور ہر ذی شعور انسان ان ضخیم و حجیم تذکروں کو بہ نظر غائر پڑھ لینے کے بعد اسی نتیجے پہنچتا ہے، کہ اس تحریک کے مایہ ناز مؤرخوں سے بات نہیں بنی، اور ان سے وہ بات بھی چھپائی نہیں جا سکی، جس کو چھپانے کے لئے انہوں نے اس قدر مغز مارا ہے اور بے چارے محمد جعفر تھانیسری کو تحریف کا مرتکب "ثابت" کر کے اس کے کفن کو داغدار کیا ہے۔

ہاں یہ تذکرے عقیدت مندوں اور اندھے مقلدوں کے قلوب کو بہلا سکتے ہیں، گو ان کے دماغوں کو اپیل نہ کریں، مگر دل کا بہل جانا بھی تو بڑی بات ہے۔

ایسے تذکروں کو لکھ اور پڑھ کر اگر ایک خاص گروہ کے دل بہل جاتے ہیں تو یہ اپنی جگہ ٹھیک، مگر تاریخ کو مسخ کرنے اور زید کی پگڑی بکر کے سر رکھنے کی اجازت دے دینا، بہت بڑا ظلم ہے، چنانچہ تاریخ کو مسخ ہونے سے بچانے کی خاطر جناب مولانا وحید احمد مسعود مصنف کتب کثیرہ نے ان موقع شناس قلم کاروں کے خلاف اپنے قلم حقائق رقم کو حرکت میں لا کر ان کی مصلحت آمیز تحقیقات کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا، اور جناب "سید احمد شہید" کی صحیح صحیح تصویر کھینچ کر عوام کے سامنے پیش کر دی ہے، محترم مولانا وحید احمد مسعود صاحب یہ عظیم کارنامہ سرانجام دے کر اپنے فرض سے

سبکدوش ہونے کے علاوہ اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہو گئے ہیں۔ جزاہ اللہ تعالیٰ خیرا۔

پیش نظر کتاب ''سید احمد شہید کی صحیح تصویر'' جناب مولانا مسعود صاحب نے ماہ نامہ ''منادی'' دہلی بابت ستمبر ۱۹۶۵ء کے خاص نمبر کی صورت میں شائع کروائی تھی اور مدیر ''منادی'' نے اپنے ادارتی نوٹ (۱) میں بڑی فراخدلی سے دعوت دی تھی، کہ اگر کوئی صاحب اس کا جواب لکھنا چاہیں تو ''منادی'' کے صفحات اس کے لئے حاضر ہیں، مگر آج تک مدیر صاحب کی دعوت کو کسی نے شرف قبولیت نہیں بخشا، ظاہر ہے کہ ان سے ان کے مریدین نے وجۂ خاموشی ضرور دریافت کی ہوگی، مگر منطقیانہ جواب دے کر ٹال دیا ہوگا۔ لیکن جواب نہ دینے کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں عافیت اسی میں سمجھی کہ جواب نہ دے کر جواب الجواب کی زد سے بچا جائے اور بذریعہ خاموشی اس اٹھ کھڑے ہوئے مسئلے کو ختم کر دیا جائے، ورنہ بنا بنایا کھیل خراب ہو جائے گا، (۲) مگر یہ خیال خام ہے۔

جملہ تذکرہ نویسوں کے بقول جناب سید صاحب متنوع خوبیوں کے مالک بزرگ تھے، لیکن ان کی بنیادی اور سب سے اہم خوبی ان کی بے پناہ روحانیت اور کمال ولایت ہے اور ان ہی کمالات عالیہ کی بدولت انہوں نے تسخیر خلائق کی تھی اور روحانیت کے زور سے لوگوں کو آمادۂ جہاد کیا تھا، اور سلاسل فقر میں ایک نئے سلسلے (طریقہ محمدی) کا اضافہ کیا تھا۔۔۔۔ لہذا سید صاحب کی ذات کو پہچاننے کے لئے سب سے اول ان کی اس مبینہ حیثیت کو زیر بحث لایا گیا ہے، اور حاصل بحث یہ ہے کہ جناب کی یہ حیثیت بھی مشتبہ ہے، اور جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ آج محمدی سلسلہ معدوم ہے اور اس وقت اس ''عظیم'' سلسلے کا کوئی شیخ نظر نہیں آتا، اور اسی معدومیت کی بنا پر خود معتقدین سید صاحب میں سے دیوبندی گروپ کے لوگ دوسرے سلسلوں میں بیعت ہوتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ فیضان ولایت محمدی

۱۔ یہ نوٹ افتتاح سخن کے زیر عنوان ص: ۹ پر درج ہے۔

۲۔ اب یہ کتاب تیسری بار شائع ہو رہی ہے، مگر تا حال کسی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ (محمد موسیٰ)
اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے چوتھا ایڈیشن مفید اضافوں کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے، مگر اس کا جواب ابھی تک نہیں آیا۔ (میاں زبیر احمد)

نہیں تھا لکہ جناب شاہ صاحب کے علم وفضل کی کرشمہ سازیاں تھیں، غرض کہ جناب مصنف نے سید صاحب کی روحانی کیفیت کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ اس کی داد نہیں دی جاسکتی۔

مسائل تصوف عوام تو کجا بہت سے مولویوں کے فہم سے بھی بالا ہوتے ہیں، لہذا اس بحث کو پڑھ کر وہی لوگ پورے طور پر محظوظ ہو سکتے ہیں جنہوں نے تصوف کی حقیقت کو سمجھا ہے لیکن عوام کی دلچسپی کے سوالات یہ ہیں:۔

-----سید صاحب کے جہاد کا رخ انگریزوں کی جانب تھا یا سکھوں کی طرف؟

-----سید صاحب نے تحریک جہاد کا آغاز انگریزوں کے اشارے پر کیا تھا یا حکم الہی سے؟

-----سید صاحب نے انگریزی علاقے میں کھلے بندوں جہاد کی تیاری کی اور چندہ جمع کیا، مگر انگریز آڑے کیوں نہیں آئے؟

-----سید صاحب اگر انگریز کے مخالف تھے تو انہیں انگریزی عملداری سے سرحد میں مدد کیوں پہنچتی رہی؟

-----سید صاحب کو انگریزی عملداری سے باہر ہر مقام پر انگریزوں کا جاسوس کیوں سمجھا گیا؟

-----سید صاحب کی دعوتیں انگریزوں نے کیوں کیں؟

-----سید صاحب نے غیر ملکی انگریزوں کو نکالنے کے لیے سکھوں سے کوئی بات چیت کی تھی؟

-----سید صاحب نے سکھوں کے علاوہ سرحدی وقبائلی پٹھانوں کا جو خون بہایا کہاں تک جائز تھا؟

-----سید صاحب مجدد تھے تو انہوں نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح مسلمانوں کی اصلاح کر کے انہیں متحد و متفق کیا یا بیسیوں اختلافی مسائل پیدا کر کے باہمی سر پھٹول میں مبتلا کر دیا؟

-----سید صاحب کے حکم سے بیوگان کے زبردستی نکاح کر دیئے گئے

کون سی دانشمندی تھی؟

ان سب سوالوں کے جواب اس کتاب میں موجود ہیں، مگر تفصیل کے بجائے اشاروں کنائیوں سے دیئے گئے ہیں جو حقیقت کے متلاشی کو مطمئن کرنے کے لئے کافی ہیں، ہٹ دھرمی، ضد اور تعصب بے جا کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔

''سید احمد شہید کی صحیح تصویر'' کی اشاعت یہاں بے حد ضروری تھی، کیونکہ پاکستان ہی میں سب سے زیادہ اس تحریک کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے، کارکنان رضا پبلی کیشنز۔ لاہور مستحق صد ستائش و مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے، اس کتاب کی اشاعت سے تصویر کا صحیح رخ عوام کے سامنے آجائے گا، محققین کے لئے غور و فکر کی نئی راہیں کھل جائیں گی اور یہاں کے عقیدت مند مصنفین جانبدارانہ تحقیقات کو چھوڑ کر حقیقت کو تلاش کرنے کی سعی فرمائیں گے۔

محمد سعید نعمانی
(محمد موسیٰ عفی عنہ)

۲۴ر جولائی ۱۹۶۶ء
لاہور

زیر حوالہ کتاب: "سید احمد شہید کی صحیح تصویر" از وحید احمد مسعود (لاہور۔ مکتبہ مسعود ۱۹۶۶ء) کا اندراج "فہرست ذخیرۂ کتب حکیم محمد موسیٰ امرتسری (مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)" مرتبہ سید جمیل احمد رضوی کی جلد چہارم (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۱ء) کے صفحہ ۹۹ پر کیا گیا ہے (شمارہ اندراج: ۲۴۷/۷)۔ مرتب نے اس اندراج کے ذیل میں ایک نوٹ دیا ہے:

"اس کا پیش گفتار (از صفحہ ۳ تا ۶) محمد سعید نعمانی کے نام سے شائع ہوا۔ ۲۵ جون ۱۹۹۸ء حکیم صاحب نے اس نام کے سامنے خط دے کر اپنا اسم گرامی (محمد موسیٰ عفی عنہ) لکھا ہے۔ گویا یہ تحریر حکیم صاحب کی ہے (دیکھئے ۶)"

فہرست کی جلد چہارم پر تبصرہ رسالہ "نقطہ نظر"، اسلام آباد (اپریل۔ ستمبر ۲۰۰۲ء) کے صفحات ۱۰۱ اور ۱۰۲ پر شائع ہوا۔ تبصرہ نگار نے درج بالا اقتباس کا حوالہ ان الفاظ میں دیا ہے (ص ۱۰۲)

"جناب سید جمیل احمد رضوی نے ترتیب فہرست میں اس امر کا خیال رکھا ہے کہ اگر کسی کتاب پر حکیم صاحب نے کوئی اہم یادداشت لکھی ہے تو اسے نقل کر دیا جائے۔ اس حوالے سے زیر نظر "جلد چہارم" میں "صاحب ذخیرہ" کے بارے میں یہ اطلاع غالباً پہلی بار سامنے آئی ہے کہ وحید احمد مسعود کی تالیف "سید احمد شہید کی صحیح تصویر" (مکتبہ مسعود۔ لاہور، ۱۹۶۶ء) کے دیباچہ نگار "محمد سعید نعمانی" کے پردے میں اصلاً حکیم محمد موسیٰ امرتسری کی ذات گرامی تھی (ص ۹۹)"۔

میاں زبیر احمد علوی گنج بخشی قادری ضیائی

افتتاح سخن

اس حقیقت سے کوئی انصاف پسند آدمی انکار نہیں کر سکتا کہ برصغیر کے صوفی بزرگ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے عقائد ان عقائد سے مختلف تھے جو آج ان کے مبینہ پیروکاروں کا طرۂ امتیاز ہیں اور جن کی وجہ سے چشتی صابری نسبت کے باوجود دیوبندی اسکول کو تصوف اور چشتیت کے لئے ایک تہمت سمجھا جانے لگا ہے، پیر و مرشد کے عقائد اور طریقہ کار سے ایسا اختلاف حیرت انگیز بھی ہے اور تصوف کی تاریخ میں اس کی اور کوئی مثال بھی نہیں ملتی، تاہم عام لوگ اب تک اس اختلاف کی وجوہات سے ناواقف تھے اور انہیں اس تاریخی پس منظر کی بھی خبر نہ تھی، جس میں یہ اختلاف رونما ہوا، لیکن حال میں حضرت مولانا وحید احمد صاحب فریدی قطبی کا ایک بصیرت افروز مقالہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ایسا شائع ہوا، جس نے ہر چیز کی وضاحت کر دی اور عقائد اور طریقہ کار کا یہ اختلاف عام لوگوں کے لئے بھی کم از کم حیرت انگیز نہیں رہا۔

ناظرین کو مولانا فریدی کا یہ مقالہ یاد ہوگا، کیونکہ اسے ''منادی'' میں بھی شائع کیا گیا تھا اور اس کے بعد مشہور صحافی مولانا غلام رسول مہر کے جواب اور مولانا فریدی کے جواب الجواب کے طویل سلسلے کو بھی ناظرین نے فراموش نہ کیا ہوگا جس کا ''منادی'' میں باقاعدگی سے اندراج ہوتا رہا، اور جس سے عوام وخواص سب نے بے انتہا دلچسپی لی، اس دلچسپ بحث میں سب سے زیادہ گفتگو حضرت سید احمد شہید کے بارے میں رہی، کیونکہ ان کے متعلق مولانا فریدی کے بعض ریمارکس مولانا مہر کو شاق گزرے تھے، اور انہوں نے بڑی شد و مد کے ساتھ مولانا فریدی کو اس کا جواب دیا تھا، منادی اس ساری بحث کو غیر جانبداری کے ساتھ چھاپتا رہا اور موافقت مخالفت

میں کوئی رائے نہیں دی اور نتائج اخذ کرنے کے لئے ناظرین کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔

حضرت مولانا وحید احمد صاحب فریدی کا زیر نظر جامع مقالہ بھی (جس پر منادی کا یہ خاص نمبر مشتمل ہے) اسی بحث کا ایک حصہ ہے اور سابق کی طرح اب بھی منادی غیر جانبداری کو قائم رکھتے ہوئے اور کوئی رائے دیئے بغیر اسے بے کم و کاست ناظرین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے، اب تک منادی میں مولانا مہر کے جوابات بھی چھپتے رہے تھے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ مولانا فریدی کا یہ مقالہ ہندوستان پاکستان کی موجودہ جنگ کے باعث مولانا مہر کی نظر سے جلدی نہ گزر سکے گا۔ تاہم مولانا مہر کے ہم خیال ہندوستان اور ان غیر ممالک میں بھی کم نہیں جہاں منادی جنگ کے دوران میں بھی بھیجا جا سکے گا۔ ان میں سے اگر کوئی صاحب مولانا فریدی کی رائے سے اختلاف کرنا چاہیں تو ان کے لئے منادی کے صفحات حاضر رہیں گے اور امن ہونے کے بعد مولانا مہر بھی اگر اس کا جواب لکھنا چاہیں گے تو اس کو بھی شکریے کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔ تا کہ پڑھنے والوں کے سامنے تصویر کے دونوں رخ رہیں اور وہ کسی صحیح فیصلے پر پہنچ سکیں۔

یہ ایک علمی اور تاریخی بحث ہے، اس سے کسی کو برا نہیں ماننا چاہیے، سنجیدگی سے غور کیا گیا اور لوگ تعصب میں مبتلا نہ ہوئے تو ان شاء اللہ اس سے افہام و تفہیم کی راہ نکلے گی اور اختلافات کی خلیج پاٹنے میں مدد ملے گی، کیونکہ اب تو حالت یہ ہے کہ تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم نامی کتابوں کا ذکر کرتے ہی خانقاہی حلقہ ولایت کے خطرے سے چونک پڑتے ہیں اور ان کے سامنے وہ روایت آ جاتی ہے کہ شاہ اسماعیل جب سکھوں سے لڑنے جانے لگے تو دلی میں انہوں نے درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی بابت کہا کہ "سکھوں کی مہم سے فارغ ہو جاؤں تو اس بت خانے کو بھی ڈھاؤں گا"۔(۱)

۱۔ شاہ صاحب نے یہ بات اس لئے کہی ہوگی کہ انہیں یہ یقین تھا کہ انگریز ان کی اس خواہش کو پورا کر دیں گے، کیونکہ ان کے تعلقات انگریزوں سے ایسے ہی تھے۔ (محمد موسیٰ)

اس طرح سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل وغیرہ سے ذہنی طور پر وابستہ طبقہ اور دیوبندی اسکول، خانقاہ اور درگاہ کا نام آتے ہی بدعت اور شرک کے ڈراؤنے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ اور ذرا نہیں سوچتا کہ جس چیز کو وہ بدعت اور شرک سمجھ رہا ہے وہ در حقیقت بدعت اور شرک ہے بھی یا نہیں اور اس کے ذہن میں اس واہمے نے کس طرح اور کیوں جگہ پائی ہے، اس سلسلے میں یہ دلچسپ بات بیان کرنے کے قابل ہے کہ مولانا قاری طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے مجھ سے خود بیان فرمایا کہ میں اجمیر شریف گیا تو ڈر رہا تھا کہ ابھی کوئی خادم آئے گا اور زبردستی میری گردن پکڑ کر مزار کے سامنے سجدہ کرنے کے لئے مجبور کرے گا، لیکن جب میں وہاں پہنچا تو گردن پکڑنا تو الگ رہا کسی نے زبان سے یا اشارے کنائے تک میں مجھ سے سجدے یا آستان بوسی کے لئے نہیں کہا اور سب لوگ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور میں نے اپنے عقیدے کے مطابق حاضری دی۔

ناظرین ''منادی'' حضرت مولانا وحید احمد صاحب سے بخوبی واقف ہیں، ان کو حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد امجاد میں سے ہونے کا فخر حاصل ہے اور مشرقی و مغربی قدیم اور جدید دونوں تعلیمات سے بہرہ ور ہیں، ایک عرصے تک انگلستان میں رہے، تحریک خلافت میں نمایاں حصہ لیا، حکومت یو۔ پی کی پارلیمنٹری سیکرٹری کی حیثیت سے بیش بہا خدمات انجام دیں، گوشہ نشینی، ترک و تجرید اور مجاہدات سے بھی آشنا رہے، غرض یہ کہ وہ ہمہ صفت موصوف بزرگ ہیں اور ایک دنیا ان کی دیکھی ہوئی ہے، ان کے سوچنے اور نتیجہ اخذ کرنے کا انداز تقلید سے آزاد ہے، ان کے نزدیک تاریخ ایک پس منظر کی حیثیت رکھتی ہے، وہ تاریخ کو بس گواہ اور شاہد سمجھتے ہیں اور اس کے طے شدہ اور ریڈی میڈ فیصلے نہیں مانتے اور جو تاریخ اس قسم کے فیصلے دیتی ہے، اس کو ایجاد بندہ سمجھتے ہیں، وہ دروغ کو راوی کی گردن پر رکھ کر بے فکر نہیں ہو جاتے بلکہ راوی کی گردن کو اس کے بوجھ سے ہلکا کرنا چاہتے ہیں اور آخری فیصلے اور حکم کا حق راوی کے بجائے اپنے لئے محفوظ رکھتے ہیں اور فیصلہ دیتے

وقت کسی قسم کی رو رعایت پسند نہیں کرتے، ان کا فیصلہ تذبذب سے پاک اور دوٹوک ہوتا ہے، اکثر اوقات اس سے سنگدلی ٹپکتی ہے اور قائم شدہ عقیدوں اور تصورات کو ٹھیس پہنچتی ہے، عدل وانصاف میں فریدی صاحب رحم دلی جائز نہیں سمجھتے، شاید اس لئے کہ یہاں کرپشن کا روپ دھار لیتی ہے۔

زیر نظر مقالے میں مولانا فریدی نے حضرت سید احمد شہید کی ایک نئی تصویر پیش کی ہے، لیکن یہ تصویر کسی قدر دھندلی ہے، اس کے نقوش واضح نہیں، مولانا کا زیادہ وقت ان تصویروں کو ضائع کرنے میں صرف ہوا ہے جو دوسروں کی بنائی ہوئی ہیں اور جن کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اصلیت سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں اور لوگوں کے تصورات کی پیداوار ہیں، ان تصویروں سے محروم ہونے پر لوگ کڑھیں گے، کیونکہ یہ تصویریں بہت خوبصورت اور بڑی دلکش تھیں، ان کے بدلے میں فریدی صاحب کی بنائی ہوئی جو تصویر لوگوں کو ملے گی وہ بری نہ سہی لیکن اتنی حسین بھی نہیں ہے لیکن حقیقت پسند آدمی کے لئے اس کے سوا چارۂ کار بھی کیا ہو سکتا ہے؟

اگر مولانا فریدی کی رائے مان لی جائے اور ان کے فیصلے کو صحیح اور قطعی اور آخری فیصلہ سمجھا جائے تو ہندوستان کی تمام "نیم وہابی" تحریکوں کا سرچشمہ ایک ایسی تحریک قرار پائے گی، جس کو ایک غیر مسلم اور غیر ملکی اقتدار یعنی انگریزوں کی شہ پر شروع کیا گیا تھا اور جس کے بعد کے آنے والے بے سمجھے بوجھے باپ دادا کا قابل احترام ورثہ سمجھتے رہے اور جس کی خاطر اپنے اصل راستے سے بھٹک جانے میں بھی انہوں نے کوئی قباحت محسوس نہ کی۔

امید ہے مولانا فریدی کے اس بصیرت افروز مقالے سے کماحقہ فائدہ اٹھایا جائے گا۔

حسن ثانی نظامی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فاتحہ

حمد بے حد ہے خدائے پاک کی اور نہایت ادب سے مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ہے، ایسا شکر جس کی نہایت نہیں، رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مہربانی ہے، ایسی مہربانی جس سے اخلاق الٰہی حاصل ہوتے ہیں اور بزرگان دین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی توجہ ہے، جو ہر وقت ہدایت کرتی رہتی ہے کہ یہ رسالہ تکمیل کو پہنچ سکا، میں اپنے احباب و معاونین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، مگر اسمائے گرامی ظاہر کرنے کی ممانعت ہے، حکمت اسی میں ہے کہ ید بیضا بغل میں رہے، مگر میری دعائے خیر ان تک پہنچ جائے گی، میں ان حضرات سے معافی کا خواستگار ہوں جو میری اس کاوش کو منجملۂ مخالفت واعتراض سمجھیں، ان سے میری یہی التجاء ہے کہ اپنے گمان کو دور کریں اور قابل اعتراض امور کی میری کوتاہی مجھ کو اصلاح فرمادیں، ان کا یہ کرم میرے اور ان کے بلکہ سب کے حق میں مفید ہوگا، ورنہ میری تسلی کے لئے یہی کافی ہے کہ یہ تنقید عقیدت مندی کی تاریکیوں کو کسی قدر چھانٹ دے گی یا انہیں اور زیادہ تنگ نظر بنادے گی۔ میرا مدعا بیت بازی نہیں ہے بلکہ اتحاد بین المسلمین ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

یہ رسالہ حضرت سید احمد شہید کی سوانح عمری نہیں ہے بلکہ ان تذکروں کی جو ان کے متعلق اس وقت تک لکھے گئے ہیں، ایک تنقید ہے، سوانح نویسوں نے حضرت

سید احمد کو نہیں سمجھا اور کریکٹر کو ناپنے کی طرف توجہ نہیں کی، عقیدت مندی نے ذم کے پہلو کو سمجھنے نہیں دیا، کبھی آسمان کی کہہ دی اور کبھی زمین کی لکھ دی، یہ اپنے دعوے کو ثابت کرنے میں قطعی ناکام ہیں، لہذا سید صاحب کی عظیم شخصیت معمہ بن کر رہ گئی، ان کے سوانح یہی ظاہر کرتے ہیں کہ پیش ہر دو پیچ، نہ انہیں ملا سمجھا جا سکتا ہے نہ طبیب بتایا جا سکتا ہے، نہ ولی کہا جا سکتا ہے اور نہ عالم، ضرورت ہے کہ سب سے پہلے ان کی شخصیت کا تعین کیا جائے کہ وہ کس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، پھر اسی معیار سے ان پر روشنی ڈالی جائے۔

وہ [illegible] تھے؟ شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحی (بڈھانوی) ان کی پالکی پکڑ کر ادبا پیدل چلا کرتے تھے، لیکن بعد میں یہی ادب گستاخیوں میں منتقل ہوتا چلا گیا، ان کے احکامات کی تعمیل [illegible]، گویا سید صاحب کی روحانیت شاہ اسماعیل کے ظاہری علم کی تعظیم کرنے لگی، اگر وہ ولی تھے؟ تو ان کی کرامتیں معجزات سے مقابلہ کرتی نظر آتی ہیں، باوجود ان کی بے نفسی و عجز کے غصہ و غضب کے آثار بھی دکھائے گئے ہیں، مدینہ منورہ میں بحالت خواب سید الکونین ﷺ سے جو بے تکی گفتگو کی ہے، اس میں ادب کا شائبہ نہیں، واقعہ پشاور کے بعد، وقت وداع سب کو بیعت سے آزاد کر کے یہ ارشاد فرمایا کہ:۔

”مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جیسے کسی کو قے سے ہو“، معصومیت اور ولایت کی مکمل تردید ہے، اگر وہ بہادر اور سپاہی تھے تو سرحد میں وہ اپنی بہادری اور سپہ گری کے جوہر نہ دکھا سکے، اگر ان کو عالم سمجھ لیا جائے؟ تو انہیں وہبی علم حاصل تھا، مگر وقت ضرورت ان کی علمیت روپوش ہوگئی، اخلاق کریمانہ کی دھوم ہے مگر جب داغ لگا ہوا گوشت سامنے آیا تو دال پر گزر کی اور پکانے والے کو سخت الفاظ سے یاد کیا، ان کے جو اوصاف بتائے گئے ہیں، ان میں تناقص پایا جاتا ہے، ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے ہیں مگر یہاں جہاد نہیں کرتے، انہوں نے سکھوں سے جہاد کیا لیکن اس جہاد کے متعلق جتنی پیشین گوئیاں کیں ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں نکلی، پنڈاریوں میں رہ کر شب خون مارنا سیکھا، حالانکہ حدیث اس کی ممانعت کرتی ہے کہ بے خبری میں حملہ نہ کیا

جائے،مسلمانوں کی درخواست کہ جہاد ہندوستان میں انگریزوں سے کیا جائے، مسترد کر دیا، اس لئے کہ ان کے خیال میں انگریزوں سے جہاد کرنا بلوہ کے مترادف تھا، ظاہر ہوا کہ وہ انگریزوں کے مداح ومعترف تھے۔

سید صاحب کا پہلا تذکرہ ''سوانح احمدی'' یعنی ''تاریخ عجیبہ'' ہے، اس کے مصنف محمد جعفر تھانیسری کی قابلیت ودیانت میں کلام نہیں، اس نے خود لکھا ہے کہ:

''میں نے دس برس کی عمر تک کوئی تعلیم حاصل نہیں کی، بارہ برس کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد میری والدہ نے مجھے تعلیم دلوائی۔ ۱۸۵۶ء میں عرضی نویسوں کے زمرہ میں داخل ہوا، تمام وکیل مجھ سے قانونی مشورے لیتے۔''

آمدنی خاصی تھی مگر عدالتوں سے حاصل کئے ہوئے روپیہ کو وہ اپنے صرف میں نہیں لاتا تھا اور اس کو حرام سمجھتا تھا، بعد غدر وہ پٹنہ کے مولوی یحیٰ علی کا شریک کار ہو گیا، ان دونوں نے ۱۸۶۴ء کی مذہبی سازشوں کے قیدیوں میں نمایاں جگہ حاصل کی۔ یہ دونوں مخلص وبا اصول انسان تھے، انہیں سزا ہوئی، سر ہربرٹ ایڈورڈ نے مقدمہ انبالہ کے فیصلہ میں جعفر کی قابلیت کا اعتراف کیا ہے اور سزا کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے جرم میں کوئی شک نہیں، لہذا اس کی سزا میں تخفیف نہیں ہو سکتی، جب کالے پانی سے رہائی پا کر ۱۸۸۳ء میں ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے کتابیں لکھیں، سوانح احمدی ان کی مشہور کتاب ہے اور مستند ہے، انہوں نے خود اعلان کیا ہے کہ قریب چار سو صفحوں کے مختلف مؤلفوں کے لکھے ہوئے سوانح میرے سامنے ہیں، مگر میں نے ان پھلوں سے عطر کھینچ لیا ہے تاکہ ہر کہ ومہ اس کا پھویا لے کر معطر ہو جائے، بایں اختصار اہم مطالب کو فوت نہیں ہونے دیا ہے، گو کہ قیمتی کراماتی واقعات کو دانستہ چھوڑ دیا ہے۔

ا۔ سید صاحب کے متعلق جتنا مواد ممکن تھا، وہ انہوں نے فراہم کر لیا، ان کی تحقیق قابل داد ہے، ان کے تدین کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سید صاحب کی ناکامی کے اسباب جو ان کی سمجھ میں آئے وہ صاف صاف لکھ دیئے، برخلاف ان کے دوسرے تذکرہ نویس سخن سازی وتاویل کے ذریعے ناکامی پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، سولہ برس کی عمر میں انہوں نے شاہ اسماعیل کی تقویۃ الایمان پڑھی اور اس جماعت پر

ایمان لے آئے، مولانا ولایت علی عظیم آبادی کی جماعت میں شمار کئے جاتے ہیں، کالے پانی کی سزا ان کو دی گئی تھی۔

۲۔ حیات طیبہ میں مرزا حیرت دہلوی نے تمام سہرے شاہ اسماعیل کے سر باندھے ہیں اور اس کے ضمیمہ میں ادب وعقیدت مندی کے ساتھ سید صاحب کا ذکر خیر کیا ہے اور بات بھی یہی ہے کہ ولی اللہی تحریک کے اجراء میں مولوی عبدالحی (بڈھانوی) اور شاہ اسماعیل کو سید صاحب پر تقدم حاصل تھا، اس تذکرہ کی روایات میں بعض جگہ اختلاف ہے، لیکن اس کی وجہ سے یہ رائے قائم کرنا کہ ان کا ذریعہ معلومات غلط تھا صحیح نہیں (اور نہ ان کی رائے اور معیار کو غلط سمجھا جا سکتا ہے)

مرزا حیرت نے خود لکھا ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے۔۔۔ سمجھ لیا جائے گا کہ میں نے بزرگ سید کے صحیح حالات لکھے ہیں اور دوسرے سوانح نویسوں کی طرح ڈھکوسلہ بازی نہیں کی ہے، چاہے اس سے دلچسپی لے اور چاہے تسکین کرے، اور سید صاحب سے (نواب ٹونک) وزیر الدولہ کو جب اعتقاد تھا تو (پنجاب سے واپس آنے والے ہمرائیوں کو) وقعت پیدا کرنے کی اور کوئی صورت نہ تھی، سوا اس کے کہ ان کے غائبانہ پیر کی مدح سرائی کریں اور ایسی ایسی کرامتیں اس بزرگ سید کے سر چپکیں جن سے ان کی ذات مبرا تھی۔ (حیات طیبہ ص ۵۲۹)

۳۔ سیرت سید احمد شہید، مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے، وہ سید صاحب کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں، سید صاحب کے متعلق جو خانگی روایات تھیں، وہ بھی درج کی ہیں، اسی لئے دوسرے تذکرہ نویسوں پر انہیں فوقیت حاصل ہے، نہایت خوبی واحتیاط سے انہوں نے حالات لکھے ہیں، مگر کیلنڈر نہ نباہ سکے اور تناسب جاتا رہا۔

۴۔ ''منظورہ'' سید جعفر علی گورکھپوری کی غیر شائع شدہ تصنیف ہے، اس میں انہوں نے اپنے ذاتی چشم دید واقعات درج کئے ہیں، جناب مولانا غلام رسول مہر صاحب کا اصل ماخذ یہی ہے۔

۵۔ مولانا غلام رسول مہر صاحب کی ''سید احمد شہید'' معرکۃ الآرا ضخیم تالیف

ہے۔ بڑی جانکاہی سے معلومات فراہم کروائی ہیں اور بڑے ذوق وشوق کے ساتھ مفصل حالات لکھے ہیں، ان کا ذخیرہ معلومات لاجواب ہے، اور ہر معاملہ وواقعہ کو اتنی وضاحت وقابلیت سے لکھ دیا ہے کہ پڑھنے والوں کو اپنی ذاتی رائے قائم کرنے کی زحمت نہیں گوارہ کرنی پڑتی، مبالغہ آمیز مدح کرنا اور قصیدے پڑھنا شاعر کا کام ہے مگر سوانح نگار کے لئے یہ طرز مناسب نہیں ہے، مگر جناب مہر صاحب کی عقیدت مندی اس عیب کی روادار ہے، انہوں نے سید صاحب کو افسانوی ہیرو بنانے کی کوشش کی ہے، تخ رابط و مدارج کا ان کے یہاں بھی پتا نہیں چلتا جس کی وجہ سے تصویر بھدی ہو گئی ہے، ان سب کتابوں کو ایک ساتھ پڑھا جائے اور موازنہ کیا جائے تو دماغ چرخ ہو کر رہ جاتا ہے اور کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی، معلوم ہوتا ہے کہ یہ کل داستان طلسم ہوش ربا کا نمونہ ہے، ہر مؤلف نیا ترانہ الاپ رہا ہے۔ ان حضرات نے محض اپنے نظریہ اور عقیدت کے مطابق روایات کا انتخاب کیا ہے اور بقیہ کو نظر انداز کر دیا ہے، ضرورت تھی کہ دقت نظر سے جملہ روایات پر تنقید کر کے نتیجہ نکالا جاتا، سید صاحب کی ہستی برگزیدہ تھی، وہ اپنی کیفیات میں محو ہو کر اصلاح کرنا چاہتے تھے، اپنی وآس کی انہیں پرواہ نہیں تھی، مگر حاشیہ نشین اور ارادت مندان کی اصلاح کو مادی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور عجیب انداز میں بیان کیا کرتے تھے، لہٰذا یہ مضمون صادق آیا!

”ولیکن قلم در کف دشمن است“

شاہ اسماعیل کو ترجمانی کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا، سید صاحب کے اصولوں کو انہوں نے اپنی قابلیت سے اپنی زبان میں ادا کیا، معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحی (۱) (بڈھانوی) کی حیات میں شاہ اسماعیل احتیاط سے کام لیتے تھے، مگر مولوی عبدالحی کی عدم موجودگی میں اور ان کی وفات کے بعد وہ مختار کل بن گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ سید صاحب کے حالات مولوی عبدالحی کی وفات سے پہلے اور وفات

۱۔ مولوی عبدالحی ابن شیخ ہبۃ اللہ، بڈھانہ ضلع مظفر نگر (یو۔ پی، بھارت) کے رہنے والے تھے، شاہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کے داماد تھے، سید احمد رائے بریلوی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، ۸/ شعبان ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء بروز اتوار کو عارضہ بواسیر میں انتقال ہوا۔ (تذکرہ علماء ہند، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء، ص: ۲۸۷) خلیل احمد رانا۔

کے بعد دولخت نظر آتے ہیں، مولانا عبید اللہ سندھی نے اسی حقیقت کو اپنی سیاسی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ مولوی عبدالحی کی وفات کے بعد مرکز دہلی کی اہمیت جاتی رہی، دہلی سے یعنی شاہ محمد اسحاق سے تعلقات منقطع کر لئے گئے اور نیا مرکز سرحد میں بنالیا گیا، مطلب یہ ہوا کہ شاہ اسماعیل کی علمیت و مصلحت اجازت دیتی تھی کہ سید صاحب کی تصویر جس رنگ میں چاہیں کھینچیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے جب شاہ اسماعیل کے بجائے شاہ محمد اسحاق کو اپنا جانشین بنایا تو کوئی وجہ نہیں کہ شاہ اسماعیل کو تحت شعور میں مایوسی نہ ہوئی ہو، ایسی حالت میں شاہ اسماعیل کو اپنی وجاہت قائم رکھنے کے لئے نیا راستہ بنانا تھا اور وہی بنا بھی لیا، اسلئے میں مولوی عبدالحی کی سرپرستی حاصل کر کے شاہ اسماعیل، شاہ محمد اسحاق سے ملتے رہے اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے جہاد کا منصوبہ گانٹھا، سید صاحب کے مرید ہونے کے بعد تعلقات ترک نہیں کئے، بلکہ ایک قسم کا بعد اختیار کیا، باوجود سید صاحب سے بیعت کر لینے کے ان کی فضیلت علمی اور مصلحت بینی نے سید صاحب کا کلی طور پر اتباع نہیں کیا، اور اس کو اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ جہاد کو جاتے ہوئے مولوی عبدالحی کو اجمیر سے دہلی بھیج دیا اور تمام تر ذمہ دار شاہ صاحب ہی بنا دیئے گئے۔

ضرورت ہے کہ سید صاحب کے حالات علیحدہ کر کے خالص سید صاحب کے رنگ میں دکھائے جائیں، سید صاحب صلح کل تھے، امن کے حامی تھے اور اتحاد بین المسلمین کو فروغ دے کر توحید کی لا انتہا و بے پناہ وسعت کو چمکانا چاہتے تھے، مگر اتنی مدت مدید کے بعد تاریکیوں میں سے ان کے درخشاں اصول کو علیحدہ کرنا بہت مشکل ہے، مگر ممکن ہے۔ عجائب پرستی نے ان کے حالات پر پردہ ڈال رکھا ہے، اب یہی ہوسکتا ہے کہ ان تذکروں سے خرافات دور کر کے سید صاحب کی خصوصیات کا لحاظ رکھ کر ان کے حالات جمع کئے جائیں، تا کہ سید صاحب کی عظمت نمایاں ہو سکے، میں نے ان تذکروں کے خس و خاشاک کو چھانٹنے کی کوشش کی ہے، کوئی اہل ہمت جس کو اللہ تعالیٰ توفیق دے، سید صاحب کے گوہر گرانمایہ کو صاف صاف منظر عام پر پیش کر دے تو بعید نہیں۔

اس صاحبان نے فروعی مسائل میں اپنی جدتوں سے جو انقلاب پیدا کرنا چاہا، اس کی تردید علماء اہل سنت نے کی ہے اور جواب میں حدیث و قرآن سے استدلال کر کے بہترین مواد جمع کر دیا، لیکن نتیجہ نہیں نکلا، اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ علماء اہل سنت فروعات کا جواب دینے میں مبتلا ہو گئے، انہوں نے نہ سید صاحب کی حیثیت کو سمجھا اور نہ اس تعلیم پر غور کیا جو سید صاحب سے منسوب کی گئی ہے، سید صاحب کو گوشہ نشین ہونے کی وجہ سے ولی کہا جا سکتا ہے، ایسے لوگ اپنی جگہ بیٹھ کر ہدایت کیا کرتے ہیں اور منظر عام پر نہیں آیا کرتے، اگر کوئی بڑا اور ظاہری کام کرنا ہوتا ہے تو اپنے خلفاء اور مریدوں کے ذریعہ کروا دیتے ہیں، یہ تعلیم جو سید صاحب سے منسوب کی ہے، شریعت اور طریقت دونوں سے مرکب ہے، مگر ان کے اصحاب تعلیم، طریقت کے اصولوں سے سطحی طور پر واقف تھے، لہذا علم معقول کے ذریعہ طریقت کی جو گت انہوں نے بنائی وہ بے تکی اور ناقص ہے، علمائے اہل سنت نے ان کے طریقت والے جز پر توجہ نہیں کی، اگر وہ اس کا بھی لحاظ رکھتے تو یقین ہے کہ خلیج پٹ جاتی اور افہام و تفہیم کی شکل نکل آتی، اصلاح کی خاطر یہ کام آج بھی کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ فریقین کٹ حجتی اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لیں، اصلی مقصد چھوڑ کر فروعات کی خاطر وحدت اسلامی کو خطرے میں ڈالنا مذہب اسلام کی توہین اور انسانیت کی تذلیل ہے، تقاضائے وقت طرح طرح سے شیر و شکر ہو جانے کی ہدایت کر رہا ہے، اب بھی اگر آیات الٰہی پر توجہ نہیں کی اور ذاتی خود مطلبی و اغراض پر قائم رہے تو پتہ معلوم، ڈوبنے والی کشتی ڈوبنے سے بچ نہیں سکتی۔

فاعتبروا یا أولی الأبصار۔

فقیر

وحید احمد مسعود قطبی صابری

شیخوپور۔ بدایوں

یکم جولائی ۱۹۶۵ء، مطابق یکم ربیع الاول ۱۳۸۵ھ

فاتحہ ثانی

ہم سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی

''سید احمد شہید کی صحیح تصویر'' پر یہ نظر ثانی رواداری میں بغیر یکسوئی، سکون و قرار کے کی گئی ہے، یہ مضمون رسالہ منادی دہلی کے خاص نمبر بابت ستمبر ۱۹۶۵ء میں چھپا تھا، پھر جولائی ۱۹۶۶ء میں مکتبہ مسعود، لاہور سے کتابی صورت میں شائع ہوا، اور اس کی جلدیں ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں، مجھے مسرت ہے اور ممنون ہوں کہ یہ جسارت قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی، اب اتنی جلد نظر ثانی کے لئے اصرار اس لئے ہے کہ بعض اشارے تفصیل چاہتے ہیں، اور اس لئے بھی کہ جہاد کے متعلق میری رائے واضح طور پر نہیں سمجھی گئی اور میرے علم میں یہ بات بھی لائی گئی کہ ابھی تک سید صاحب کے معتقدین نے کوئی جواب نہیں لکھا ہے۔

میں نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ مجھے بیت بازی منظور نہیں ہے اور اگر میری کسی رائے سے اختلاف ہو اور وہ صحیح بھی ہو تو مجھے تسلیم کرنے میں کوئی تکلف نہ ہوگا، گزشتہ مرتبہ اپنے خیال میں سید صاحب کے جہاد کے متعلق میں نے واضح بحث کی تھی، مگر شاید میری بے بضاعتی کی وجہ سے میرا مفہوم واضح نہ ہوا، اس مرتبہ مزید تشریح کر رہا ہوں، اب بھی کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو میں معذور ہوں۔

جو اشارے محتاج تفصیل ہیں، ان کی بھی وضاحت حتی المقدور کر دی ہے، ترمیم و تنسیخ کے علاوہ تین باب اور لکھے ہیں، جن سے عقائد اور ماحول کے متعلق کچھ واقفیت حاصل ہوگی۔۔۔۔ والسلام مع الاکرام

بندۂ محبت

وحید احمد مسعود

شیخوپور۔ بدایوں۔ یوپی۔ نومبر ۱۹۶۶ء

ابتدائی حالات

رائے بریلی کا مشہور ومعروف قطبی خاندان سادات کسی تعارف کا محتاج نہیں ،شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ ،شیخ آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے تھے ،ان کی اولاد میں متعدد بزرگ علوم ظاہری وباطنی میں کمال رکھتے تھے ،سید نعمان کے بھائی سید محمد عرفان زہدوتقوی میں مشہور تھے ،ان ہی کے صاحبزادے جناب سید احمد تھے ،یہ یکم ماہ محرم یا ماہ صفر ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء کو یہ عہد شاہ عالم ثانی (۱۸۰۶ءتا۱۸۵۹ء) میں پیدا ہوئے تھے ،اور اسی سال لارڈ کارنا والس نے ہندوستان کی حکومت کی عنان اپنے ہاتھ میں لی تھی ،ان صاحبزادے میں عام بچوں کی سی باتیں نہیں تھیں ،خصوصیت یہ تھی کہ من موجی تھے اپنی کہتے تھے اور جو کہتے تھے مختصر کہتے تھے اور خود ہی سمجھتے تھے ،زبان صاف نہیں تھی اور آخر تک صاف نہیں ہوئی ،مسکینی ،غریبی ،کم سخنی اور آہستہ بات کرنا آپ کی خصوصیات تھیں ۔(حیات طیبہ)

ان کے بڑے بھانجے سید محمد علی ان سے عمر میں بڑے تھے ،انہوں نے اپنی کتاب ''مخزن احمدی'' میں لکھا ہے کہ سید صاحب کی تعلیم مکتب میں شروع ہوئی ،تحصیل علم سے رغبت نہ تھی ،''حیات طیبہ'' کا بیان ہے کہ غیر معمولی سکوت کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کے غبی مشہور تھے ،بچپن میں ہی نہیں بلکہ جوانی میں بھی پڑھنے لکھنے کی طرف رغبت نہیں تھی ،قرآن پاک ناظرہ پڑھا تھا ،اس کی چند سورتیں یاد ہوگئی تھیں ،کریما کا پہلا مصرع دعائیہ ہے ،مگر یاد کرکے نہیں دیا ،تین برس کی تعلیمی کوشش کے بعد ان کے والد سید محمد عرفان صاحب نے فرمایا:

''انہیں خدا پر چھوڑ دو ،وہ ان کے حق میں جو بہتر سمجھے گا ،کرے گا۔''

بہر حال ان صاحبزادے کی حرکات وسکنات سے بے رغبتی ظاہر تھی، انہیں این وآں کی پرواہ نہیں تھی، لہذا ان کی غور وپرداخت پر کسی نے توجہ نہیں کی اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

تعلیم سے نجات پا کر ان کے دو شغل تھے، قلم کے بجائے ڈنڈا ہاتھ میں لئے ہوئے گھومتے پھرنا اور ہمسایوں کے گھروں کا سودا سلف بازار سے لا دینا، اس خدمت گزاری نے انہیں بستی بھر کا محبوب بنا دیا تھا، وہ کسی کے ہنسنے کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور اچھی بری نظروں کو بھی نہیں پہچانتے تھے، انہیں محض اپنی دھن سے کام تھا، جیسا پہننے کو مل جاتا پہن لیتے، جیسا کھانے کو دے دیا جاتا کھا لیتے، البتہ کلیجی کھانے کا شوق تھا، جب سترہ اٹھارہ سال کے ہوئے تو مشفق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اس کے بعد کچھ عرصہ جوں توں گزارا، آخر کار تنگ جو اٹھی تو بغیر کسی کو خبر کئے اپنے سات عدد ہم جولیوں کو ساتھ لے کر اصحاب کہف کی طرح چل دیئے، چلتے چلتے بجائے غار کے شہر لکھنؤ پہنچ گئے، غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا، وہاں کی معاشرت سے ناواقف تھے، وہ شیعہ سنی جھگڑوں کو نہیں جانتے تھے اور کچھ پتہ نہ تھا کہ وہاں سنیوں کو خارجی کہہ کر نفرت سے دیکھا جاتا تھا، سابقہ پڑا تو کھو گئے، وہاں تسلیم و کورنش کو گوارا کر لیا، از راہ ترحم شریف اور سادہ سمجھ کر اگرچہ ان کی مدارت ہوئی، مگر دل ہی دل میں وحشت ہوئی اور جی نہ لگا، چھ سات مہینے گزار کر ایک دن بے علم واطلاع ساتھیوں کو چھوڑ کر لکھنؤ سے جدھر سینگ سمایا چل پڑے۔

کہا جاتا ہے کہ اس تنہائی و بے کسی کے سفر میں لوگوں نے ان کی کرامات کا بھی مشاہدہ کیا اور ہر ایک نے اپنے یہاں ٹھہرانے کی کوشش کی مگر یہ رکنے والے نہیں تھے، گردش روزگار نے ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں چلتے چلاتے انہیں دہلی پہنچا دیا، دہلی پہنچ کر انہیں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا خیال آیا، کیونکہ گھر والوں سے ان کا ذکر سنا تھا لہذا پوچھتے پوچھتے شاہ صاحب کے ہاں پہنچ گئے، شاہ صاحب ان کے خاندان سے

واقف تھے، ہاتھوں ہاتھ لیا اور شاہ عبدالقادر کے پاس اکبری مسجد بھیج دیا'' مقالات سر سید'' جلد ۱۶، صفحہ ۲۴۵ پر مذکور ہے کہ سید صاحب پہلے شاہ عبدالقادر کے پاس پہنچے تھے اور انہوں نے تعلیم کے لئے بٹھال لیا تھا مگر تعلیم پر توجہ کرنے کے بجائے وہ ان درویشوں کی خدمت زیادہ کرتے تھے جو مسجد میں مقیم تھے، بعد میں شاہ عبدالعزیز نے ان پر توجہ فرمائی، اس زمانہ میں شاہ اسماعیل بھی مدرسہ میں درس دیا کرتے تھے، لہذا کچھ دن سید صاحب نے شاہ اسماعیل سے بھی تعلیم پائی تھی، قیام دہلی میں جب شاہ صاحب کے خاندان میں آداب عرض کرنے کا رواج دیکھا تو اعتراض کر دیا کہ السلام علیکم کہنا چاہیے، یہاں جتنی بھی کتابیں پڑھی ہوں مگر حسب معمول نتیجہ صفر تھا، کہتے ہیں کہ کافیہ تک پڑھا تھا، اور یہ بھی مشہور ہے کہ مشکوۃ شریف کا بھی مطالعہ کیا تھا، مگر بے دلی و بے رغبتی کا حال معلوم کر کے شاہ عبدالعزیز نے انہیں اپنے پاس بلایا اور جائزہ لے کر یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ اس دنیا کے آدمی نہیں ہیں، اس کے بعد انہیں روحانی تعلیم دینے کے لئے مرید کیا اور مجاہدات کروانے کے لئے حجرے میں بٹھا دیا، قیام دہلی کی مدت ڈیڑھ سال بتائی جاتی ہے، مجاہدات سے انہیں فائدہ ہوا، اس خوش آئندہ تبدیلی کا باعث شاہ صاحب ہوئے، لہذا ان کے فیض صحبت سے وہ کچھ سے کچھ ہو گئے:

اتنی سی بات تھی اسے افسانہ کر دیا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بیعت کا فسانہ

بیعت معمول کے مطابق لی گئی تھی، مگر اس کو اہمیت دے کر عجائبات کا ایک ڈھکوسلہ بنادیا ہے۔ اقرار ہے کہ طریقہ نقشبندیہ میں بیعت لی تھی، مگر تشریح غرابت کے ساتھ کی ہے۔ لکھا گیا ہے کہ بیعت لیتے وقت شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ:

"اگرچہ اس صاحب باطن کو رشد وہدایت کے لئے وسیلہ کی احتیاج نہیں ہے، مگر اہل ظاہری رعایت کے لئے بیعت لئے لیتا ہوں۔"

شاہ صاحب کے طریقہ میں رشد وہدایت کے لئے وسیلہ کی احتیاج لازمی ہے۔ اگر شاہ صاحب سمجھتے کہ وہ کامل ہیں تو بیعت لے کر فعل عبث نہ کرتے۔ مرید اقرار کیا کرتا ہے کہ مرشد کی فرمانبرداری کیا کروں گا، بیعت کے معنی ہیں:۔

"دل بدستے دگرے دادن وحیران بودن"۔ بیعت ہوجانے کے بعد مرید کی کوئی مرضی نہیں رہتی اور چون وچرا کا اسے کوئی حق نہیں رہتا۔ بیعت صفائی باطن کے لئے لی جاتی ہے۔ بیعت کے وقت ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں سید صاحب کی عمر اکیس سال کی تھی، ظاہر کیا گیا ہے پہلے دن لطیفہ قلب کی تعلیم فرمائی گئی۔ دوسرے دن پانچوں لطیفے کھل گئے۔ تیسرے دن سلطان الاذکار کی منزل طے ہوئی۔ چوتھے جلسہ میں نفی و اثبات حاصل ہوگیا۔ پانچویں دن کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے، غالبًا چھٹی رہی ہوگی۔ چھٹے جلسہ میں طریق یادداشت پر عبور ہوگیا، معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے محض اصطلاحیں جانتے تھے اور طریقت سے واقف نہ تھے ورنہ ایسی بے تکی روایت نہ کرتے۔ حضرت شیخ مجدد سرہندی قدس سرہ نے باوجود علم وفضل رکھنے کے یہ منازل ڈھائی مہینے میں طے کی تھیں، اس داستان کو سن کر یہی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ سید صاحب کا ظرف نہایت درجہ عالی تھا، جو توجہ کو برداشت کرکے چھ دن میں یہ مرحلے طے کر گئے، ورنہ اتنی تیزی میں حواس ہی نہیں جان بھی جاتی رہتی ہے، جب شاہ

صاحب نے شغل برزخ یا تصور شیخ کے لئے کہا تو سید صاحب نے سادگی سے عرض کیا کہ یہ از قسم بت پرستی ہے، شاہ صاحب نے اس پر حافظ شیرازی کا شعر سنایا کہ" بہ مئے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید"، یہ سن کر سید صاحب نے ادب کے ساتھ سر تسلیم خم کر دیا اور کہا اگر چہ مئے نوشی حرام ہے مگر میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا، مگر خدا کے واسطے شغل برزخ سے مجھے معاف کر دیا جائے، ان کی فہم و فراست کو سمجھ کر، سید صاحب کو اپنی بغل میں لے کر ان کے رخسار اور پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے انہیں خوش خبری سنائی کہ اے فرزند ارجمند حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ولایت اولیاء اور ولایت انبیاء تم کو مرحمت کی ہے۔(۱)

بغل گیری اور بوسہ بازی تو صحیح ہے مگر ولایتوں کے عطیہ کا ایک مبتدی سے ذکر کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، یہ حیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدہ است، اب یہ صاحب باطن نابلد ہونے کا اقرار خود کر رہا ہے کہ براہ کرم بتا دیجئے کہ یہ ولایت اولیاء اور ولایت انبیاء کس چڑیا کا نام ہے۔

یا تو تصور شیخ سے وہ انکار یا یہ لاعلمی کہ ولایتوں کے معنی و فرق کو دریافت کرنا پڑا، لکھنے والے شاید خود بیعت سے نابلد ہیں ورنہ ایسی بے سروپا نہ اڑاتے، یا پھر ان امور سے یہ بھی ترشح ہوتا ہے کہ سید صاحب نے خود شیخ کی اصلاح کرنا چاہی تھی لیکن ایسی حجت بازی مدرسوں میں ہوتی ہے، خانقاہ میں نہیں ہوا کرتی، شاہ صاحب نے قال کا جواب حال سے دیا یعنی بغل میں لے کر رخسار و پیشانی کو بوسہ دیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہ صاحب نے اپنی روحانی قوت کا اثر ڈالا۔ یہ بوسہ بازی بذات خود راز بستہ ہے جس کو ناواقف راہ طریقت نہیں سمجھ سکتے۔ مہر صاحب نے سید احمد شہید کے صفحہ ۷۷ کے نوٹ میں طریقت سے اپنی ناواقفیت کا اقرار کرتے ہوئے اپنا قیاس ظاہر کیا ہے کہ:۔

۱۔ کتاب نور محمدی، مصنف نسیم احمد علوی جھنجھانوی میں ہے کہ سید صاحب رائے بریلی سے حضرت شاہ عبدالعزیز نے فرمایا کہ آپ کے خاندان میں تو منصب ولایت موروثی ہے، ان شاء اللہ آپ بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح رتبہ خصوصی پر فائز ہوں گے۔ (منقول از نقش حیات ،ص:۳۹) مسعود

”شاہ صاحب سمجھ گئے کہ یہ دوا سید صاحب کے مزاج کے سازگار نہیں آ سکتی۔ کیونکہ سید صاحب کی طبیعت اتنی پاک اور مزکی تھی کہ تصور شیخ کو قبول نہ کر سکی۔ لہذا اسے چھوڑ دیا۔ اور تصور شیخ کی ضرورت نہ سمجھی۔“

جس علم سے واقفیت نہ ہونے کا اقرار ہو۔ اس کے متعلق قیاس کرنا عقلمندی سے بعید ہے۔ ورنہ کہہ دیا جائے گا کہ ھذا بھتان عظیم۔ شیخ طبیعت کو پاک و مزکیٰ بنانے کے لئے یہ تمام پاپڑ بیلا کرتا ہے۔ اگر جناب مولانا غلام رسول مہر صاحب کے قیاس کو تسلیم کر لیا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ شاہ عبدالعزیز نے اپنے اصول سے شاہ ولی اللہ کی تعلیم سے حضرت مجدد سرہندی کے طریقہ سے اور چاروں سلاسل کے معمولات سے انحراف واختلاف کر دیا، کیونکہ یہ سب تصور شیخ کے عامل و قائل ہیں، محمد عاشق پھلتی۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اس کو صحیح سمجھتے ہیں اور سید صاحب نے خود صراط مستقیم میں اس کو جائز لکھا ہے۔ اسی اصول پر مولوی مرتضٰی کو سینہ سے لگا کر سید صاحب نے خود تسکین دی ہے اور میاں محمد حسین کا اقرار ہے کہ:

”جس وقت میں نے سید صاحب سے بیعت کی مجھ پر میرا وجود منکشف ہو گیا اور پھر دل میں نظر ڈالتا تھا تو سید صاحب ہی سید صاحب نظر آتے تھے۔“ (سیرت سید احمد شہید ص ۲۷۵)

مولوی رشید احمد گنگوہی ”ارواح ثلاثہ“ کے صفحہ ۲۹۰ پر رقمطراز ہیں کہ:۔

”تین سال کامل حضرت حاجی امداد اللہ کا چہرہ قلب میں رہا اور میں نے بغیر اس سے پوچھے کوئی کام نہیں کیا۔“

اس آخری فقرہ کے معنی یہ ہوئے کہ تصور بولتا تھا اور جواب دیتا تھا، تصور کو بت اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ تصور بول سکتا ہے۔ بہر حال مفہوم کچھ ہی ہو مگر بغل گیری اور بوسہ شختی کے بعد سید صاحب کو ولایت اولیاء اور ولایت انبیاء کا مژدہ سنایا گیا، معلوم نہیں یہ مبارک باد ہے یا پیشین گوئی ہے۔ استحکام محبت کے لئے تصور

ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس کو شرک فی العلم سمجھنا سمجھ کی غلطی ہے۔ اس سے جملہ وساوس دفع ہو جاتے ہیں۔ اس کے کامل ہو جانے پر عالم ملکوت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ حدیث احسان تصور کے دو طریقے بتاتی ہے۔ یا یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ یا یہ خیال جماؤ کہ تم اللہ جل شانہ کو دیکھ رہے ہو۔ پھر یہ تو واقعہ ہے کہ تصور شیخ کے متعلق تو اتر اجماع امت کی دلیل ہے۔ حضرت مجدد سرہندی، شاہ ولی اللہ، شیخ کلیم اللہ جہان آبادی۔ یہ سب تصور کے قائل ہیں۔ مولانا روم فرماتے ہیں:۔

چوں خلیل آمد خیال یار من
صورتش بت، معنی او بت شکن

اب بھی اگر دھاندلی، ضد اور ہٹ کی جاتی ہے تو اعلانیہ اقرار ہے:۔

آرے آرے میکنم باعقل و واعظ کار نیست

بہت اچھا! تصور شیخ شرک ہی سہی، تو حدیث احسان کے دوسرے حصہ پر کہ نماز پڑھتے میں یہ سمجھو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے، عمل کیجئے اس عمل میں، التحیات اور درود شریف پڑھتے وقت رسول ﷺ کا خیال ضرور آئے گا، اگر اس کو ہٹانا چاہا تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اس کو قائم رکھا تو شاہ اسماعیل کے مسلک سے خارج ہونا پڑے گا۔ فاعتبروا یا أولی الأبصار۔

یہ انکار تصور ہی اس نئے مسلک کی بنیاد ہے، جس کی تردید خود سید صاحب کے طرز عمل سے ہو جاتی ہے۔ پھر اس سنگ بنیاد کو ولایتوں کے فرق سے تقویت پہنچائی گئی ہے۔ اور شاہ صاحب کی توجیہ وتشریح تقویۃ الایمان میں وضاحت کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ مجاہدات کے ذریعہ ولایت اولیاء حاصل کی جاتی ہے۔ اس کے بعد جب سالک تکمیل کر لیتا ہے تو مخلوق کی تبلیغ کرنے کو متعین کیا جاتا ہے، اس خدمت تبلیغ کی اہلیت کو ولایت انبیاء کہا جاتا ہے۔ یہ مرتبہ جملہ ولایت سے افضل ہے۔ اتنا لکھنے کے بعد ارشاد کیا گیا ہے کہ:۔

''اس میں ایک نکتۂ باریک ہے جس کو اس زمانہ کے لوگ نہیں سمجھتے ، اور وہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث سے تحصیل کر کے جب ولایت انبیاء میں پکے ہو جاتے تھے تو ولایت اولیاء کو شروع کرتے تھے۔ دونوں ولایتوں میں تخالف نہیں ہے اور دونوں کی جو تعریف کی گئی ہے وہ ہر طرح صحیح ہے۔ مگر قابل لحاظ یہ امر ہے کہ ولایت انبیاء جڑ۔ بنیاد اور اصل ہے اور ولایت اولیاء مثل نقش ونگار کے ہے، جب ولایت انبیاء کی عمارت تیار ہو جاتی ہے اس پر ولایت اولیاء کے گل بوٹے لگانے جاتے ہیں۔ مگر اب جاہل فقراء اور نادان سالکوں نے ثانی کو اول مقرر کر کے ولایت انبیاء کو ہاتھ سے کھو دیا ہے اور شروع ہی سے ولایت اولیاء میں پڑ کر برباد ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ''آمن ثم جاهد'' کی حدیث مشہور ہے کہ پہلے ایمان لاؤ پھر مجاہدہ کرو۔''

اس حدیث سے یہ ثابت کیا کہ ایمان لانا ولایت انبیاء ہے، اور مجاہدہ کرنا ولایت اولیاء ہے۔۔۔۔ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے۔۔۔۔ اس نکتہ باریک میں جدت، فراست اور نجوبیت علم وفضل کے ذریعہ اس درجہ بھر دی ہے کہ اس کو جہالت وخرابی دماغ اور شیطنت کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہتے ہیں کہ ابتداء سے جملہ بزرگان دین ولایت انبیاء کو اول اور ولایت اولیا کو مؤخر مانتے چلے آئے ہیں، مگر خود لکھا ہے کہ مجاہدات کے ذریعہ ولایت اولیاء حاصل کی جاتی ہے، جس سے تبلیغ کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے، اس کے بعد ولایت انبیاء ملتی ہے۔ دروغ گو را حافظہ نہ باشد علیت کا یہ زور ہے کہ حدیث کے معنی پلٹ دیئے۔ اور یہ کہہ کر دنیا بھر کی آنکھوں میں خاک جھونک دی۔ گویا مؤخر کو مقدم بنا کر اسماعیلیہ نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنائی۔ اب کس طرف کو سجدہ کیا جائے۔ یہ جدت تقویۃ الایمان میں سید صاحب کی بیعت سے پہلے لکھی گئی تھی۔ پھر بیعت کے بعد صراط مستقیم میں بھی دوہرا

دی ہے۔ سید صاحب کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ صراط مستقیم کے مسلک کے خلافت شاہ عبدالعزیز صاحب کی زبان سے تائید کروائی گئی ہے، اندھیر ہے۔۔۔۔۔ یہ شیطان کی پھونکی ہوئی کرامت ہے۔۔۔۔

بیشک حدیث وقرآن کی تعلیم سے ایمان پختہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد مجاہدے کئے جاتے ہیں۔ قدیمی اور عام طریقہ یہی ہے کہ مجاہدات کو ولایت عامہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ولایت خاصہ کی دو قسمیں ہیں۔ ولایت اولیاء اور ولایت انبیاء، ولایت اولیاء کو ہمیشہ سے تقدم حاصل ہے۔ بیشک شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کا مقصد محبت الٰہی ہے۔ اور محبت کے بھی کئی اقسام ہیں۔ حب عقلی اپنے فائدہ کے مدنظر کڑوی دوا کو گوارا کر لیتی ہے۔ حب ایمانی کا نام شریعت ہے۔ اور یہ بالکل اختیاری ہے۔ چونکہ اختیاری ہے اسی لئے اس پر جزا و سزا مرتب ہوتی ہے۔ یہی حب ایمانی ترقی کر کے حب عشقی بن جاتی ہے۔ اَشدّ حبًا للہ کی آیت کریمہ اسی حب عشقی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ حب ایمانی گویا حب عشقی کا مقدمہ ہے۔ حب عشقی میں نہ اختیار ہے نہ ارادہ۔ لہذا اب یوں سمجھنا چاہیے کہ حب ایمانی کے دو درجے ہیں۔ یعنی ولایت اولیاء اور ولایت انبیاء، ولایت اولیاء میں اللہ تعالیٰ کی ذات بحت کی تجلی صفات کے پردے میں ہوتی ہے۔ جہاد نفس اس کے لئے لازمی ہے اور تصور شیخ کی اسی منزل میں ضرورت ہوتی ہے اور اسی کو جہاد اکبر بھی کہا جاتا ہے۔ ولایت انبیاء میں تجلی کا ظہور بلا واسطہ ہوا کرتا ہے۔ اس درجہ کا جہاد، جہاد اصغر ہے۔ یہی منزل فنا فی اللہ کی ہے۔ صاحب ولایت انبیاء کا مرتبہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ خود اس کا ہاتھ۔ کان اور زبان بن جاتا ہے۔ اور گفتہ او گفتہ اللہ بود۔ اندریں صورت کون ہے جو قدم اول پر ہی بلا واسطہ تجلی کو برداشت کر سکے۔ اور اگر کر سکتا ہے۔ تو یا تو جان سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں یا ہوش وحواس کھو کر مجذوب مطلق بن کر رہ جاتا ہے۔ اب تجدد نواز بمشورہ ابلیس جو کچھ بھی تاویل کریں ان کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ مگر ان کا یہ کہنا ہے

خلاف فطرت، بلندی سے دیکھنا انبیاء کے لئے مختص ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔پستی
سے بلندی کی طرف رخ کرنا عامی کی خصوصیت ہے۔صوفیہ کی منزلیں پستی سے
بلندی کی طرف جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کی ترقی کے مدارج یہ ہیں:۱۔ سالک ناقص
۲۔سالک مجذوب ۳۔ مجذوب ۴۔ مجذوب سالک اور پھر ۵۔ سالک کامل۔ ایمان
لانے کے بعد سالک۔ مخلوق سے حق کی طرف رجوع کرتا ہے۔اسی کو ولایت اولیاء
سیر الی اللہ اور مرتبہ اولیاء کا مقام کہا جاتا ہے، جب کمال حاصل کر کے سالک حق کی
طرف سے مخلوق کو تربیت دینے کے لئے متعین ہوتا ہے تو اسے ولایت انبیاء، سیر فی
اللہ اور سیر مع اللہ کہتے ہیں۔لہذا نا ممکن ہے کہ کوئی ولایت اولیاء سے پہلے ولایت
انبیاء حاصل کر سکے۔ اگر ولایت اولیاء اور ولایت انبیاء کی تربیت وہی ہے جس کی
مدعی تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم ہے تو ظاہری و باطنی اصول سے غلط ہے۔اس سلسلہ
میں یہ بحث بھی کی جاتی ہے کہ ولایت کا درجہ نبوت سے افضل ہے یا نہیں؟ یہ سوال نبی
کی ولایت اور نبی کی نبوت کے متعلق ہے۔ ہر نبی پہلے منزل ولایت طے کرتا ہے۔
اس کے بعد اس کو نبوت تفویض کی جاتی ہے اس لئے نبی کی ولایت کو نبی کی نبوت پر
تفوق حاصل ہے۔ ولایت نبی کی صفت ہے۔ اور نبوت نبی کا عہدہ ہے۔اسی صفت
ولایت کی وجہ سے اسے نبوت کا عہدہ دیا جاتا ہے۔ لہذا صفت کو عہدہ پر ترجیح ملنا
چاہیے۔ جہاں تک ولی کا تعلق ہے تو ولایت اولیاء اور ولایت انبیاء دونوں مجاہدے اور
صفات ہیں۔ اس میں کسی کو بھی عہدہ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ولایت اولیاء میں نبی
کے سے اختیارات و حقوق مل جاتے ہیں۔ مگر ایسے ولی کو نبی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ
ان حقوق کے ذریعہ نبی کا اتباع کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اس کے علاوہ نبی معصوم
ہوتا ہے اور ولی محفوظ ہوتا ہے۔ اندریں اشکال مشابہت و مطابقت کی وجہ سے ولی و نبی
کو مساوی و برابر بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایسا سمجھنا نہ صرف بے ادبی ہے بلکہ کفر ہے:۔

اب وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے
قدیمی طرز و طریقے کو چھوڑ کر ولایت انبیاء کو مقدم کبھی نہیں سمجھا۔ اس لئے شاہ اسماعیل

کے نئے خیالات اور جدت طرازیوں سے شاہ عبدالعزیز کا کوئی تعلق نہیں۔ اور شاہ
اسماعیل کو تحریف کر لینے میں کمال بھی حاصل ہے۔ شاہ اسماعیل کی طباعی و ذہانت سے
انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر وہ بہک گئے۔ ان کی نکتہ آفرینیاں فقہی مسائل میں کوئی معنی
رکھتی ہوں۔ مگر انہوں نے غضب کیا کہ طریقت میں بھی اپنے علم معقول سے کام لیا۔
سب سے زیادہ کفران نعمت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی طبع آزمائی کا تختہ مشق شاہ
عبدالعزیز صاحب کو بنانے کی کوشش کی۔ اور یہی روشنی طبع سید احمد صاحب کے لئے
بلائے جان ثابت ہوئی، جو مژدہ سید صاحب کو وقت بیعت شاہ عبدالعزیز سے دلوایا
ہے۔ اگر مجملہ پیشین گوئی ہے تو خیر ورنہ قطعی جھوٹ اور مہمل ہے۔ ولایت اولیاء کو
محذوف کر کے ولایت انبیاء پر جست لگانا ناممکن العمل اور خلاف فطرت ہے۔ بغیر
معرفت حاصل کئے ہوئے کفار یا سلاطین جائر سے جہاد نہیں کیا جا سکتا۔ جہاد اکبر
کو منطق و فلسفہ کے زور پر موخر کر دینا مشتے بعد از جنگ کا مصداق ہوگا۔ یعنی گوشہ
گزینی اختیار کر کے ٹھنڈے ٹھنڈے آغوش لحد میں آرام فرمائیے۔ یہ اسماعیلیہ تشبیہ کو
گوارا نہیں کرتے اور تنزیہ میں انتہائی غلو اختیار کرتے ہیں۔ یہی ان کے نزدیک محبت
الٰہی کا بہترین ثبوت ہے۔ صفات کو نظر انداز کر کے محض جامد اسم کے درپے ہو جانا اور
رٹنا خلاف شان اسلام ہے، شانوں اور صفتوں سے حرکت و حیات ثابت ہوتی ہے۔
اس کے برخلاف اسم جامد ہی کو بت کہا جاتا ہے، صفتوں کا صرف منہ سے اقرار کرنا
کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک کہ ان شیون و صفات کی خود سیر نہ کی جائے اور حامل نہ بنا
جائے، یہ سیر لامتناہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی نہ حد ہے نہ نہایت۔ ولایتوں
کی ترتیب بدل دینے کا اگر عملی تجربہ کیا جائے تو منزل ہی طے نہیں ہوتی۔ ہر مقام پر
لکھا نظر آئے گا کہ ۔۔۔۔ این رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است ۔۔۔۔ یہ سب قیاسی
جحت سید صاحب کو کامل بنانے کے لئے ایجاد کی گئی ہے۔ اور دنیا کو دھوکہ دیا گیا ہے۔
مقالات سرسید جلد ۱۶ سے یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سید صاحب نقشبندیہ دستور
کے مطابق مرید بنائے گئے اور خلافت سے سرفراز کئے گئے۔ سوانح نگاروں کی منطق
نو ایجاد نے سید صاحب کی جامعیت کو محدود و تنگ بنا دیا ہے اور درخشاں ستارے کو

معمولی سے قطرۂ آب کے اندر مقید کر کے دکھایا ہے۔۔۔۔ پہلے ہی قدم پر ان کو نہ صرف ولایت انبیاء سے مزین کر دیا ہے۔ بلکہ امام، معصوم اور مامور بھی مشہور کر دیا ہے، اور مہدی بھی بنا دیا ہے۔(۱) وہ جو کچھ بھی بنائیں مگر مادر زاد ولی کو رسمی علوم کے مباحث سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ اس کا ذریعہ معلومات علم معقول سے علیحدہ ہوا کرتا ہے وہ مدرسہ والوں کی خو بو نہیں رکھتا۔ وہ اپنی روحانیت کے سامنے ان واہیات فروعی مسائل پر توجہ نہیں کیا کرتا۔

اعتراض سے بچنے کے لئے خواہ مخواہ سید صاحب کو ظاہری تعلیم سے مزین کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ اور جب اطمینان نہیں ہوا تو باطل پرستی کی آڑ لے کر شہرت دے دی کہ نعوذ باللہ من ذلک، سید صاحب حضور نبی کریم ﷺ کی مشابہت پر خلوق کئے گئے تھے۔ اسی سبب سے بے علم رہے۔ اسی لئے انہیں ''امی'' سے ملقب اور علم لدنی سے متصف کیا گیا۔ پھر اسی بنیاد پر نبوت سے ملا کر ان کے مرتبہ کو نبوت کے برابر ظاہر کر دیا۔ مگر ظاہر ہے کہ رسول ہاشمی صلو اعلیہ وآلہ کا امی ہونا بے مثال معجزہ ہے۔ پھر حیرت ہے کہ اسماعیلیہ اپنی موحدیت کے باوجود عجائب پرستی وتشبیہ کی تقلید کیسے کرنے لگے، معتقدین نہیں سمجھتے کہ جناب سید احمد صاحب سے روز حشر ان خطابات وکرامات کے متعلق جب پرسش ہوگی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح وہ صاف فرما دیں گے کہ میں ان پرستاروں سے بری ہوں اور ان ہذیانات سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال:

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے انداز
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ا۔ ملاحظہ ہو نواب صدیق حسن کی ''اربعین'' اور ولایت علی صادق پوری کا رسالہ تسعہ اور جعفر تھانیسری کی برکات اسلام۔

بیعت کے بعد

سید صاحب کا دہلی میں قیام تقریباً ڈیڑھ سال رہا۔ کچھ دن ظاہری تعلیم میں صرف ہوئے۔ کچھ دن مجاہدے کئے اور کچھ دن شاہ عبدالعزیز کی صحبت میں رہے۔ گوشہ نشینی کی زندگی خاموش زندگی تھی۔ مدرسہ والوں سے رسم وراہ پیدا نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ شاہ اسماعیل بھی اپنے ان شاگرد کو نا قابل توجہ سمجھے۔ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء کے آخر میں سید صاحب وطن مالوف تشریف لے گئے۔ یہ وہ سال ہے جب کہ روسی حملہ کی خبر سن کر تیموری شاہزادہ زمان شاہ لدھیانہ سے کابل گیا ہے اور اسی سال زمان شاہ کے گورنر رنجیت سنگھ نے کشمیر ملتان اور پشاور پر تسلط جما کر پنجاب میں سکھ حکومت کی بنیاد رکھی ہے۔ وطن والوں نے جوش و مسرت سے سید صاحب کو خوش آمدید کہا۔ مسرت اس بات کی تھی کہ ان کا لاابالی پن سنجیدگی سے بدل گیا تھا اور ان کے حرکات وسکنات سے تہذیب واخلاق ظاہر ہوتے تھے۔ وہ نہ صرف خود پابند شریعت ہو گئے تھے، بلکہ دوسروں کو بھی پابند شرع بننے کی نصیحت کیا کرتے تھے۔ مگر پھر بھی محویت کی ایک جھلک ان میں دکھائی دیتی تھی۔ اہل خاندان نے موقع کو غنیمت سمجھ کر ان کے گلے میں سنت پیغمبری کا طوق ڈال دیا کہ گریز پائی کا علاج ہو جائے۔ اور گھر کی رونق میں اضافہ ہو۔ ان کی ازدواجی زندگی حوالہ قلم نہ کر کے ان کے سوانح نگاروں نے اپنی کم نظری وکوتاہ بینی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ البتہ سوانح احمدی میں اس قدر بتایا گیا ہے کہ ان دو برس کے ایام میں ایک صاحبزادی تولد ہوئی تھیں جن کے بطن سے ایک صاحبزادے اسماعیل پیدا ہوئے اور سید صاحب کے اصل واقعات کو نظر انداز کر کے عجائب پرستی

کے ڈھکوسلوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً سید صاحب کو رسول مقبول ﷺ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی جسمی زیارت کی خواب میں سعادت حاصل ہوئی۔ نبی کریم ﷺ نے خواب میں تین چھوارے اپنے دست مبارک سے ان کے منہ میں رکھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے ہاتھ سے انہیں غسل دیا اور سیدتنا بی بی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خود اپنے دست مبارک سے انہیں کپڑے پہنائے۔ حضرت غوث الثقلین اور خواجہ نقشبند میں ایک مہینہ تک برابر کشمکش ہوتی رہی کہ کون ان کو اپنی طرف جذب کرے، اور آخر کار بڑی مشکل سے یہ طے پایا کہ دونوں ایک ساتھ اپنی روحانیت سے انہیں مستفیض فرمائیں۔ اس سے پہلے قیام دہلی کے زمانہ میں کبھی سید صاحب نے حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مزار مبارک پر اعتکاف کیا تھا تو ان کی روح پاک نے بہ حکم رب خود بخود نسبت چشتیہ عطا کر دی تھی وغیرہ وغیرہ۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان خوابوں کی اصلیت کیا ہے، مگر ان کے اظہار سے واقفان رموز خوش نہیں ہوتے، مگر ان امور سے یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ سید صاحب کی طرح ان کے معتقدین ان مقدس ہستیوں کے وصال کے بعد بھی ان کی فیض رسانی کے قائل ہیں۔ استغاثہ سے منحرف نہیں ہیں اور عالم برزخ کی حیات کو تسلیم کرتے ہیں اور جو شخص ان حقائق کو نہیں مانتا وہ سید صاحب کی جماعت سے یقیناً خارج ہے۔ یہ خواب کچھ ہی ہوں مگر ان سے سید صاحب کے اعزاز و منزلت کا اظہار مقصود ہے۔ بہر حال وطن کے اس قیام میں ان کی وجدانیت میں ان کا اضطراب محسوس کیا جا سکتا ہے اور اعزاء و اقارب کو اسی سے اندیشہ تھا، چنانچہ دو برس کے صبر و سکون سے وہ اکتا گئے اور ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء میں جب کہ انگریزوں اور رنجیت سنگھ سے معاہدہ ہوا تھا، وطن سے ایسے گئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سید صاحب پنڈاریوں میں

مالوے کے لٹیرے پنڈاری کہے جاتے تھے، یہ درندگی اور خونخواری میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور امن کے جانی دشمن تھے، بستیوں میں آگ لگانا، کھیتوں کو اجاڑ دینا اور لوٹ مار کر کے رفو چکر ہو جانا، ان کا وطیرہ تھا، گھوڑوں پر بیس پچیس کوس تک دھاوا مار لیا کرتے تھے۔ اپنے ساتھ دو یا تین عورتوں یا لڑکیوں کو لاد کر لے جاتے تھے اور فروخت کر دیتے تھے، ان کا خوف اس درجہ طاری تھا کہ ان کی خبر سنتے ہیں مرد اور عورت کنوؤں میں چھلانگ مار کر جان دے دیا کرتے تھے، مالوے کے راجہ ان سے مدد لیا کرتے تھے اور اپنے یہاں ملازم بھی رکھتے تھے، یہ پنڈاری کالی دیوی کو پوجتے تھے، اپنی لوٹ مار میں اس سے شگون لیا کرتے تھے، دسہرہ کا تہوار دھوم دھام سے مناتے تھے، اسی دن نئی بھرتی کی جاتی تھی، سال بھر کا پروگرام بنایا جاتا تھا اور افسروں کو ترقی دی جاتی تھی، ان کے سردار چیتو، واصل خان، کریم خان اور امیر خان تھے۔

امیر خان سنبھل (ضلع مراد آباد۔ یوپی) کے رہنے والے تھے، بچپن میں عسرت کی وجہ سے بھینسیں چرایا کرتے تھے، جب پچیس سال کے ہوئے تو کسی طرح پنڈاریوں میں شامل ہو گئے، ان کے یہاں رفتہ رفتہ ایسے ایسے نمایاں کام کئے کہ سب نے انہیں افسر اعلیٰ تسلیم کر لیا، امیر خان کے راجہ ہلکر سے گہرے تعلقات تھے، راجہ انہیں نواب کہا کرتا تھا، ان کی دیکھا دیکھی پنڈاریوں کا ہر افسر اپنے آپ کو نواب کہنے لگے۔

راجہ ہلکر کی رانیوں میں سب سے زیادہ حسین تلسی بائی تھی، راجہ کے مر جانے کے بعد وہی قارث تخت اور نابالغ صاحبزادی کی ولی بنی، اس کا دل امیر خان سے مل گیا تھا، لہٰذا اپنے ساتھ ان کو بھی ولی بنا لیا تھا، اس طرح امیر خان کی شان میں اور بھی

چار چاند لگ گئے، اسی جلن میں تلسی بائی کو کسی پنڈاری نے ۱۸۱۸ء میں قتل کر دیا تھا(۱)

تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ سید صاحب وطن سے فرار ہو کر ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں پنڈاریوں کے جتھے میں نمودار ہوئے، پتہ نہیں کہ مالوہ جانے کا انہیں الہام ہوا تھا، شاہ عبدالعزیز نے ہدایت کی تھی یا بھائی سے ملنے کا ذاتی شوق اس کا محرک تھا، ان کے بھائی کا نام کسی نے عبدالرحمٰن لکھا ہے اور کسی نے ابراہیم بتایا ہے، سید صاحب کے پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا، سید صاحب کا قیام ان لوٹیروں میں سات سال رہا، اس کے دو سبب بتائے جاتے ہیں، ایک یہ کہ ان بدقماشوں کی اصلاح منظور تھی، دوسرے یہ کہ ان بلائے درمانوں سے فوجی تعلیم حاصل کرنا تھی، واقعات مظہر ہیں کہ دونوں وجوہات میں سے کسی ایک میں بھی کامیابی حاصل نہ کر سکے، البتہ ان لوگوں سے سیکھ کر شب خون مارنے میں کمال حاصل کر لیا تھا، جس کی حدیث ممانعت کرتی ہے، یعنی یہ کہ غفلت میں یا سوتے میں دشمن پر حملہ نہیں کرنا چاہیے، نواب امیر خان کے یہاں کسی کی تنخواہ مقرر نہیں تھی، مال غنیمت مل جاتا تو عید ہو جاتی ورنہ محرم کا مہینہ رہتا، سید صاحب حسب عادت لشکریوں کی خدمت کیا کرتے تھے، ان کے لئے دعا فرماتے تھے، ان کے ضمیر کا حال بتا دیتے تھے، برکت کے لئے یہ لوگ انہیں مہموں میں اپنے ساتھ لے جاتے تھے، بعض کا خیال تھا کہ سید صاحب کو نجوم آتا ہے، بعض کی رائے تھی کہ ان کے قبضے میں ہمزاد ہے، ان کے بھائی سے معلوم ہو گیا تھا کہ سید صاحب پڑھے لکھے نہیں ہیں، مگر دہلی کے ایک سپاہی نے بتایا کہ شاہ عبدالعزیز نے ان پر نظر ڈال دی ہے اور وہ ان ہی کے مونڈے ہوئے ہیں، ایک مرتبہ دوران جنگ میں مخالف انگریز کے خیمہ میں بے درنگ داخل ہو گئے، انگریز افسران کے والہانہ انداز دیکھ کر مشکوک نہیں ہوا بلکہ محظوظ ہوا، سوانح احمدی میں جعفر تھانیسری کی روایت ہے کہ اس انگریز سے سید صاحب نے نواب امیر خان کی سفارش کی تو اس نے

(۱) ابرج آف ہسٹری آف انڈیا مرتبہ کلارک مارش مین سی ایس آئی، باب: ۱۰، ص: ۳۲۶

وعدہ کر لیا کہ وہ نواب سے نہیں لڑے گا اور انگریزی سرکار سے صلح بھی کرا دے گا، اسی وجہ سے سید صاحب انگریزوں کے معترف و مداح تھے، سید صاحب بے کہے سنے نواب امیر خان کی محفل خاص میں بھی پہنچ جاتے تھے اور ترقی و بہبود کی دعائیں دیا کرتے تھے، ایک روایت ہے کہ جب میجر اکٹرلونی ۱۸۱۸ء میں دہلی کا ریزیڈنٹ مقرر ہوا تو سید صاحب یہ سن کر کہ میجر اکٹرلونی صلح کی گفتگو کرنے نواب امیر خان کے پاس آ رہا ہے، آدھی رات سے اٹھ کر نواب امیر خان کی خدمت میں پہنچے اور سمجھایا کہ انگریز سے جنگ نہ کرنا، مگر نواب امیر خان کا عذر تھا کہ لشکر کا سامان درست نہیں ہے، لشکری بھی بددل ہو گئے ہیں، لہٰذا مصلحت یہی ہے کہ صلح کر کے انگریزوں سے دس پانچ ہزار روپیہ لے لوں، اس کے بعد ان کی خبر لوں گا، سید صاحب نے فرمایا کہ مصالحت کے بعد آپ سے کچھ نہ ہو سکے گا (وقائع)، وزیر الدولہ نے وقائع میں یہ بھی لکھا ہے کہ سید صاحب پہلی مرتبہ جس روز لشکر میں تشریف لائے تو اعلان کیا کہ امیر خان کو ریاست دنوابی ملے گی، پھر کچھ عرصہ بعد ان کی ریاست سے مجاہدین کا لشکر لے کر ہم گزریں گے۔ مرزا حیرت اپنی کتاب "حیات طیبہ" میں رقمطراز ہیں کہ بیچ میدان جنگ میں خیمہ نصب کیا گیا تھا، اس میں سید صاحب، لارڈ ہیسٹنگز اور امیر خان کے درمیان گفتگو ہوئی تھی، نواب امیر خان صلح کے لئے تیار نہیں تھے، سید صاحب نے بڑی مشکل سے انہیں شیشے میں اتارا کہ اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی اولاد کی خاطر صلح کر لینا چاہئے، چنانچہ لارڈ ہیسٹنگز اسی وجہ سے سید صاحب کی تعظیم و توقیر کیا کرتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ جملہ تذکرہ نگاروں کی روائتیں بر بنائے عقیدت فرضی و قیاسی ہیں، صاحب "سیرت سید احمد شہید" نے خرافات سے بچ کر کمالات کا اظہار مختصر و مبہم کیا ہے، سوانح احمدی میں کرامتوں کی بھرمار ہے، مولانا غلام رسول مہر صاحب نے اپنی تاویلوں سے کرامتوں کو قابل قبول بنا دیا ہے، جس کا منشا یہی ہے کہ منم کردہ ام رستم داستان، بہرحال سید صاحب کی مالوہ والی زندگی کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

ہونے والی بات کہ لارڈ ہیسٹنگو نے نیپال کی جنگ میں کامیابی حاصل کر کے ایک بہت بڑی فوج سے مالوہ کا محاصرہ کرلیا، جب مرہٹوں اور راجاؤں نے ہتھیار ڈال دیئے تو امیر خان کے سامنے موت تھی یا صلح۔ سید صاحب کی ولایت و کرامت جب کچھ نہ بنا سکی تو نواب امیر خان نے انگریزوں سے صلح کر لی، یہ صلح ۱۸۱۷ء میں ہوئی تھی جس کی بنا پر امیر خان کو وہ علاقہ دیا گیا جو ان کی جولانگاہ تھا یعنی ٹونک اور باقاعدہ نواب بنا دیا گیا، واصل خان کا انتقال ہو گیا، چیتو نے راہ فرار اختیار کی، بعد میں اسے چیتے نے ہڑپ کرلیا، کریم خاں کو گورکھپور میں جاگیر دی گئی اور نوابی کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

سید صاحب پنڈاریوں میں سات سال رونق افروز رہے مگر حیرت ہے کہ ان کے متعلق خاندان والوں نے یا دہلی کے احباب نے تجسس نہیں کیا اور نہ سید صاحب کو اپنی اہلیہ اور صاحبزادی اور نواسی کی یاد آئی، البتہ مرزا حیرت نے اشارہ کیا ہے کہ سید صاحب لشکر سے چندہ جمع کر کے مدرسہ رحیمیہ کو دہلی بھیجا کرتے تھے، ایک رسالہ "مکاتیب بریلی" کے نام سے بھی شائع کیا گیا تھا اس میں وہ خطوط تھے جو سید صاحب نے اپنی ازواج کو لکھے تھے، ان خطوط سے سید صاحب کی خانگی زندگی کے مستند حالات معلوم ہو سکتے تھے لیکن مولانا غلام رسول مہر صاحب اور مولوی سید ابوالحسن ندوی صاحب نے اس رسالہ کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے کہ در گفتن نمی آید، بہر حال کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

جب انگریزوں سے صلح ہو گئی تو سید صاحب کا مالوے میں رہنے کا کوئی مصرف نہیں رہا، چنانچہ انہوں نے شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ یہاں کا کارخانہ خراب ہو گیا ہے، لہذا میں آپ کی خدمت کے لئے دہلی آرہا ہوں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مذہبی انقلاب

زاہد ز دیں برآمد و صوفی ز اعتقاد
ترسا محمدی شد و عاشق ہماں کہ ہست

شام وسحر کی دونوں شفقوں کے درمیان کی تاریکی چھٹ گئی تو پو پھوٹتے ہی معلوم ہوا کہ مغلوں کی شہنشاہیت کا ستارہ ڈوب گیا اور انگریزوں کی قسمت جاگ اٹھی تحریک ولی اللہی کو شاہ عبدالعزیز خوبی سے چلا رہے تھے کہ اتنے میں شاہ اسماعیل نے سید احمد رائے بریلوی کی سرکردگی میں اپنی جودت طبع سے نئی راہ نکالی۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف میں کچھ ایسی ہوا چلی تھی کہ دنیا کے ہر حصہ میں اصلاحات و ایجادات ہونا شروع ہو گئیں تھیں۔

ضرورت ایجاد کی ماں کہلاتی ہے۔ اقتصادی بحران انقلاب کا باعث ہوا۔ یورپ میں اس کے دفعیہ کے لئے سائنس ٹیکنالوجی اور صنعت وحرفت کی طرف توجہ کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضعیف البنیان انسان خدائی کا دعویٰ کرنے لگا۔ اور ترقی کی نئی نئی راہیں کھل گئیں۔ اس جدوجہد میں انگلستان کو تمام یورپ پر سبقت و فوقیت حاصل ہوئی۔ فیکٹری سسٹم کی ایجاد اور دولت کی افراط نے تہذیب وتمدن میں چار چاند لگا دیئے۔

فرانس اپنی فوجی قوت سے غیر منتظم یورپ کی ریاستوں پر اپنا سکہ جما رہا تھا، مگر اب اس کی فوجیں ملک ملک مساوات آزادی اور اخوت کا جھنڈا لے کر جانے لگیں اور انہوں نے یورپ کے پرانے آئین اور محدود اصولوں کو حرف غلط کی طرح مٹانا شروع کیا، نپولین نے نہ صرف یورپ سے اپنا کلمہ پڑھوایا بلکہ انگلینڈ کا بھی اپنے

سامنے سر جھکانے کی کوشش کی۔ اس کی کامیابیوں کا شور تمام ایشیا میں پھیل گیا۔ ان انقلابات سے مفلسی، آمریت اور محکومیت کے تخیلات کے بجائے قومیت و آزادی پروان چڑھنے لگی۔ یورپ میں والٹیر۔ روسو۔ کانٹ اور دیگر مصنفین نے تصورات، جذبات اور اخلاق میں نئی روح پھونک دی۔ ورڈ سورتھ شاعر ایڈیم اسمتھ ماہر اقتصادیات اور فلاسفر بینتھم نے ان رجحانات کو قبول کر کے گزشتہ موجودہ اور مستقبل کے لحاظ سے علمی و فنی حکمت، اخلاقیات اور کمالیت کے سبق دے کر قومی زندگی کی اصلاح کی۔ برک قدیمی وضع اور رسم و رواج کا حامی تھا۔ مگر اس کے ساتھ بینتھم فراخدلی کا سبق دے کر بنی نوع انسان کو بے پایاں مسرت کے حصول کی تلقین کر رہا تھا۔ برک نے دستور قدیم کی حمایت کی اور بینتھم نے ترقی پسندوں کی جماعت بنائی۔ انگلستان والوں نے دونوں کو سراہا اور دونوں سے استفادہ کیا۔ ان فلسفیانہ تحریکات کا اثر مذہب پر پڑنا لازمی تھا، لہذا مذہبی جماعتوں میں تحقیق و تجدید کا جذبہ ابھرا، عہد ہنود ور کے مذہب پرست چرچ کے قائل تھے، مگر اس کو من جانب اللہ نہیں مانتے تھے، اور ہر قسم کی برائیوں کے عادی تھے۔ لہذا ان پر نکتہ چینی ہونے لگی۔ ویزلی اور ویک فیلڈ نے ان تمام خرابیوں کے دور کرنے کا بیڑہ اٹھایا، اور ان کی تحریک ''میتھوڈزم'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ دونوں نے اپنی جوشیلی تقریروں اور وعظوں سے زہد و تقویٰ کی اشاعت کی ترک دنیا کی مذمت کی۔ ضمیر کی صفائی اور روحانی پاکیزگی کی تعلیم دے کر گناہوں کے کفارے اور تقدس کا سبق پڑھایا۔ ان کو دیہات و قصبات میں مقبولیت حاصل ہوئی، اس تحریک کے مؤرخ کا بیان ہے کہ اگر میتھوڈزم یا اسی قسم کی کوئی تحریک وجود میں نہ آتی تو انگلستان قعر مذلت سے کبھی نہ نکل سکتا۔

میتھوڈزم کے ہمعصر ''ایونجیلکز'' چرچ کے مؤید تھے، اور ان کی جماعت بہترین طریقہ سے منظم و متحد تھی۔ یہ لوگ چرچ کی دوسری جماعتوں کے برخلاف اپنے مخالفین پر تشدد کو جائز سمجھتے تھے۔ ان کا اثر اونچے اور درمیانی طبقات پر بہت تھا۔ اسی لئے عوام ان سے خائف تھے۔ ان میں کی ایک جماعت ''کلیپہم'' کہلاتی تھی۔ رسم غلامی کا دشمن ولبرفورس اور مشہور شاعر کوپر اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے، ان کے

اصول کے مطابق ہر انسانی مفاد کی حفاظت کرنا ضروری ہے اور دنیا کا ہر مذہب ان کا نمائندہ بنایا جا سکتا ہے۔(۱)

مدعا یہ کہ انقلابات و تنازعات مغربی ممالک میں ترقی کا باعث ہوئے، مگر مشرق میں ان سے ترقی معکوس ہوئی، یہاں اقتصادیات اور نظام حکومت کی خرابیوں نے پنپنے نہیں دیا، ہدایت و اصلاح کا کام علماء کے فرائض میں تھا مگر علماء نفسانیت میں مبتلا تھے اور سیاست و حالات زمانہ سے نابلد تھے، ان کی توجہ عقائد کی ادھیڑ بن اور مسائل کی کاٹ چھانٹ میں ہی مرتکز رہی، امام ابن تیمیہ نے اصلاح کی، انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی تھی، وہ نہایت قابل تھیں، ان ہی کے نام سے خاندان مشہور ہوا۔ امام ابن تیمیہ، حضور غوث پاک ﷺ کے سو سال بعد حران میں پیدا ہوئے، ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے زبان سے، قلم سے اور تلوار سے جہاد کیا، ان کے زبان و قلم نے دوست کم بنائے اور دشمن زیادہ، چنانچہ انہی قیل و قال کی وجہ سے متعدد مرتبہ انہیں قید و بند سے سابقہ پڑا، مسلمان بادشاہ تاتاری غازان خان ان کا ادب کرتا تھا، مگر جب غازان خان نے مصر پر حملہ کیا تو ابن تیمیہ کی شمشیر آبدار نے جوہر دکھائے اور غازان خان کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

امام ابن تیمیہ کے اجتہادات کچھ اس قسم کے ہیں:

۱۔ قرون اولیٰ کے طرز و تقلید میں اشاعت اسلام ہونی چاہیے، ان کے عقائد اگرچہ حنبلی تھے مگر آزاد قسم کے تھے۔

۲۔ ائمہ اربعہ کے اجتہاد کے قائل نہیں تھے، تقلید شخصی کے مخالف ہونے کے باوجود عوام کو تقلید کی اجازت دی تھی۔

۳۔ قرآن شریف کے لفظی و ظاہری معنوں سے استدلال کرتے تھے اور تاویل کو غلط سمجھتے تھے۔

۴۔ باری تعالیٰ کی تجسیم کے قائل تھے، فلسفہ دانوں کے اعتراضوں کو غلط سمجھتے۔

۱۔ ماخوذ از ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا مصنفہ تاراچند، ص: ۳۱۰-۳۱۲

۵۔قرونِ اولیٰ کی تقلید کی وجہ سے ہر نئی بات ان کے نزدیک بدعت تھی، عقائد و معاشرے میں نئی باتوں کو روا نہیں رکھتے تھے۔

۶۔زیارتِ قبور کے مخالف تھے حتی کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے مزار اقدس کی زیارت کو بھی گناہ خیال کرتے تھے، جب "شدِ رحال" کی حدیث سنی تو یہ ترمیم کر دی کہ زیارت قبور کی وجہ سے سواری وغیرہ کا انتظام کرنا درست نہیں ہے، ویسے جائز ہے۔

۷۔جناب رسول کریم ﷺ کی شفاعت کے قائل ہیں مگر ان کے وصال کے بعد ان کی شفاعت کو تسلیم نہیں کرتے البتہ یہ تسلیم ہے کہ قیامت میں انہیں حق شفاعت مل جائے گا، حیات بعد الموت کے منکر ہونے کی وجہ سے مردوں کو ندا کرنے کو گناہ سمجھتے تھے، کیونکہ ندا ذی روح کو دی جاتی ہے۔

۸۔وسیلہ سے انہیں انکار ہے۔

۹۔تصوف کے قائل ہیں، صوفیہ متقدمین کو سادات مومنین اور اخیار المسلمین میں شمار کیا ہے، مگر صوفیہ متاخرین پر اعتراض ہے، اس لئے کہ انہوں نے عقلیت وتاویل سے کام لیا ہے، زہد وتقویٰ میں غلو کیا ہے، وحدت الوجود، سماع اور خلوت کے اضافے کر لئے ہیں، ان کے خیال میں خلوت سے معرفت حاصل نہیں ہوتی بلکہ عقل وسمع سے ہوتی ہے اور یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ ولایت طاعات سے ملا کرتی ہے، ابدال وغیرہ کے وجود کو نہیں مانتے، عبادت شرعیہ اور عبادت بدعیہ کی تشریح کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ مراقبہ وغیرہ غیر شرعی ہیں۔

۱۰۔صوفیہ خام اور علماء سوء کی دھجیاں اڑائی ہیں، رفاعیہ فرقے سے دو بدو اور دست بدست مقابلہ کیا، فتنۂ عقائد کی اصلاح کر کے عقلیت کی تردید کی، تاتاریوں اور شیعوں سے جہاد کرنا ضروری بتایا، ان کی تصانیف و تقاریر میں جدت اور انفرادیت پائی جاتی ہے، عقلی و منطقی دلائل، مناظروں اور مباحثوں

میں بے تکان استعمال کیے ہیں، جناب رسول اللہ ﷺ کی قبر مطہر کی زیارت کے متعلق بحث کرنے کو علماء دمشق نے اپنا نمائندہ شیخ صفی الدین ہندی کو بنایا تھا۔ خاتمہ بحث پر ہندی مولوی نے اعلان کیا کہ اے ابن تیمیہ تمہاری مثال پھد کنے والی چڑیا کی سی ہے، جب تمہاری گرفت کرتا ہوں تو اچھل کر دوسری شاخ پر چلے جاتے ہو، معتقدین نے اس کے یہ معنی لئے کہ شیخ صفی الدین ہندی نے اپنی شکست مان لی کہ وہ ابن تیمیہ کی گرفت نہیں کر پائے، امام ابن تیمیہ چاہتے تھے کہ اپنے عہد کی سیاست کی اصلاح کریں مگر وہ سیاست کا دین سے رشتہ نہ ملا سکے اوران کا اجتہاد کامیاب نہ ہوسکا، وہ ۶۶۱ھ/۱۲۶۲ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔

ابن عبدالوہاب

ابن تیمیہ کے بعد اپنے زمانہ میں ابن عبدالوہاب نجدی نے اعلان کیا کہ میں نیا دین لے کر آیا ہوں، پھر اپنے عقائد کے مطابق مقامات مقدسہ پر فوج کشی کی، طائف، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور کربلا کے تقریباً تمام قبے اور مشاہد منہدم کر دیے، روضۂ نبی کریم ﷺ کے متعلق کہا کہ "ھذ اصنم اکبر"، لیکن کسی طرح اس کو نقصان نہیں پہنچا سکا، اپنی کتاب توحید میں میں لکھا ہے کہ "اگلے کافر لات، عزیٰ اور سواع کو پوجتے تھے اور اب یہ پچھلے کافر محمد، علی اور عبدالقادر کو پوجتے ہیں، لہذا یہ اور وہ سب برابر ہیں"، اس نے حضرت نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخانہ خیالات گندے الفاظ میں بدتمیزی کے ساتھ ظاہر کئے، مشرک چونکہ واجب القتل ہوتے ہیں، اس لئے ان کلمہ گویوں کو جو اس کے عقائد کے نہیں ہیں، مشرک قرار دے کر ان کے قتل میں دریغ نہیں کی، اس کے عقائد یہ ہیں:۔

۱۔ علماء وائمہ کے اقوال کو مہمل سمجھتا ہے، تقلید شخصی کو غلط کہتا ہے۔

۲۔ اس کے نزدیک قرآن وحدیث کا مطلب جو بظاہر سمجھ میں آئے وہی قابل

عمل ہے۔

۳۔ اس کی تعلیم عقلیت اور یونانی علوم سے مختلف ہے۔

۴۔ تصوف اور اصلاحات تصوف کا اس کے یہاں دخل نہیں۔

۵۔ حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذہب کا ادعا کرتا ہے مگر اپنے اجتہاد کو ان کی رائے سے بہتر سمجھتا ہے۔

۵۔ توحید کا قائل ہے، صفات الٰہی کو تسلیم کرتا ہے، مگر تشبیہ، تجسیم اور تاویل کی نفی کرتا ہے۔

۷۔ غیر اللہ سے استغاثہ و توسل کو شرک خیال کرتا ہے۔

۸۔ جناب رسول خدا علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو وسیلہ نہیں مانتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور آنحضرت ﷺ کی دعا و شفاعت کے متعلق اس کا مقولہ ہے کہ ان کو حیات میں یہ حق حاصل تھا، عالم برزخ کی حیات سے انکار ہے اور کہتا ہے کہ ہماری یہ لکڑی بہتر ہے، اس لئے کہ وہ ہمارے کام آتی ہے مگر وہ وفات پا گئے، ان سے کوئی نفع نہیں رہا، وہ ڈاکیہ جیسے تھے، لہذا گزر گئے۔ قیامت میں البتہ انہیں حق شفاعت پھر مل جائے گا، جناب رسول پاک ﷺ کے وسیلہ کو ذات رسول ﷺ سے علیحدہ کر کے تسلیم کرتا ہے، انبیاء، صالحین کی ذات کے واسطہ کو ناجائز سمجھتا ہے۔

۹۔ قبروں پر سلام جائز ہے لیکن درخواست دعا بدعت اور مکروہ تحریمی ہے، زیارت قبور مشروع ہے بشرطیکہ تجاوز نہ کیا جائے۔

۱۰۔ منکر کو مٹانے کی وجہ سے وہ قبروں کو منہدم کرتا ہے۔

۱۱۔ اس کے نزدیک اسماء صفات کے علاوہ کسی مخلوق کی پناہ لینا شرک ہے اور غیر اللہ کی قسم کھانا خلاف توحید ہے۔

ابن عبدالوہاب سلف صالحین کی پابندی کو صحیح سمجھتا ہے، اپنے مخالفین کو مرتد و کافر خیال کرتا ہے، لہذا ان پر تشدد کرنا جائز ہے، ان ہی اصولوں کی وجہ سے وہ عام

طور پر اہل قبلہ کی تکفیر کرنے کے سبب ملزم خیال کیا جاتا ہے۔ مگر وہ جواب میں عمومی تکفیر سے انکار کرتا ہے، لیکن بایں ہمہ اتمام حجت وتبلیغ کی وجہ سے مکمل تکفیر و قتال کا روادار ہے، قبر پرستی اور ظاہری مشرکانہ اعمال کو عملی کفر کہتا ہے، مگر علماء اسلام کفر عمل اور کفر اعتقاد میں امتیاز کرتے ہیں۔ یہ وہابی توحید ربوبیت کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ توحید الوہیت کو اصل سمجھتے ہیں، تمبا کو نوشی کے خلاف ہیں، مگر قہوہ نوشی ان کے یہاں جائز ہے، ان لوگوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ جناب رسول ہاشمی ﷺ کی پیشین گوئیاں نجد والوں کے خلاف ہیں، ان کے مشار الیہ یہی لوگ خیال کئے جاتے ہیں۔

ابن عبد الوہاب کو حکومت کی مدد حاصل تھی، ابن سعود یعنی امیر درعیہ عثمان نے اس کی دعوت قبول کرلی تھی اور اپنی صاحبزادی کی شادی بھی اس سے کردی تھی، اس طرح دونوں کو فائدہ ہوا، اس کی تعلیم و مذہب پر سیاست کا غلبہ رہا، اس کی اصلاح کی یہی خصوصیت اس کے مہمل ہونے کا ثبوت ہے۔

ہندوستان میں حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کا تجدد یقیناً کامیاب ہوا، انہوں نے اپنے والد سے سلسلہ صابریہ میں بیعت کی تھی، بعد میں سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہوئے اوران سے خلافت پائی، اس عہد میں علماء سوء اجتہاد اور بدعت حسنہ کے حیلہ سے فسق و فجور میں مبتلا تھے، اور صوفیائے خام نے کرامات کی دکانیں کھول دی تھیں، شہنشاہ اکبر اپنی ابتدائی زندگی میں پابند مذہب تھا اور تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اس نے عبادت خانہ کی بناڈالی تھی، مگر علماء کی نفسانفسی، جاہ طلبی اور آپس کی ضدوں نے اکبر کو دل برداشتہ کردیا، اس کی مایوسی دیکھ کر ابوالفضل اور بیربل نے اسے صاحب زمان بنادیا اور دین الٰہی وجود میں آگیا، عبادت خانہ بت خانہ بن گیا، اکبر کے الحاد کی مخالفت جن بزرگوں نے کی ان میں حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی سرفہرست ہے، انہوں نے دین کی تعلیم سلوک

پر مقدم رکھی، احیاء سنت اور اجتناب بدعت پر خاص طور پر زور دیا ہے، جزیہ کی موقوفی پر انہیں ملال تھا، ذبیحہ گاؤ کو وہ اعظم شعائر اسلام میں شمار کرتے ہیں، وحدت الوجود کا مسئلہ مختلف فیہ تھا، بہ تقلید شیخ علاء الدولہ سمعانی رحمۃ اللہ علیہ وحدت الشہود کو رائج کیا، حضرت کا ارشاد ہے کہ حال تابع شریعت ہے اور شریعت تابع احوال نہیں ہے، شریعت وطریقت کے خلاء کو دور کر کے دونوں میں ربط وضبط قائم کیا، شیعہ عقائد کی تردید کی، رسوم قبیحہ کی اصلاح فرمائی اور بدعتوں کو مہمل ثابت کیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دعوئ الٰہی کا تخیل اکبر بادشاہ کو مجدد بنانے کے لئے ابوالفضل کے دماغ میں پیدا ہوا تھا، اسی غرض کے لئے سنہ ہجری کے بجائے اس نے سنہ الٰہی ایجاد۔

حضرت سرہندی کو مجدد الف ثانی ہونے کا اشارہ غیب سے ہوا تھا، حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی اصلاح وتجدید ان کا زبردست کارنامہ ہے، مجدد رحمۃ اللہ علیہ سراپا ادب اور معلم ادب ہیں اور ابن تیمیہ اور ابن عبدالوہاب بے ادبوں کے سردار ہیں، مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم وتجدید نے اکبری الحاد کا خاتمہ کیا، لیکن جہانگیری و شاہ جہانی دور میں اتنی مقبولیت نہیں ہوئی جتنی عالمگیری عہد میں ہوئی، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق وہابیہ نے جو غلط فہمیاں پیدا کی ہیں ان کو غلط ثابت کرنے کے لئے ''مسلک امام ربانی'' از مولانا سعید احمد نقشبندی نامی کتاب کو ملاحظہ کرنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

۱۱۱۴ھ ۔۔۔ ۱۱۷۶ھ

۱۷۰۳ء ۔۔۔ ۱۷۶۲ء

اس زمانہ میں ہندوستان عجیب کشمکش میں تھا، سلطنت مغلیہ کے انحطاط و زوال پر معاشرے کے انتشار وابتذال کی داستان سے ہندوستان کی تاریخ بھری ہوئی ہے، انفرادیت کا غلبہ جب ہو جاتا ہے تو صورت حال کچھ اسی قسم کی ہو جاتی ہے، نفسانیت کے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا کرتے اور زندگی کے ہر شعبہ میں رخنے پڑ جاتے ہیں، وحدت کے جاتے رہنے سے مغلیہ حکومت مختلف ریاستوں میں منقسم ہو گئی، شریعت وطریقت میں افتراق واقع ہو گیا، تہذیب واخلاق کی صورتیں بدل گئیں اور دہلی اپنی سیاسی و مذہبی عظمت سے محروم ہو کر اوباشوں کی تفریح گاہ بن گئی، اس خلفشار کو دور کرنے کے لئے چند بزرگ ہستیاں بروئے کار آئیں اور انہوں نے از سر نو سب کو جمع کر کے اجتماعیت کو تقویت دینا چاہی، سب سے پہلے شاہ عبدالرحیم نے حدیث کی تعلیم واشاعت کے لئے مسجد فتح پوری میں مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے انہوں نے ہی نظام الملک آصف جاہ اول کو خط لکھا کہ مرہٹوں سے جہاد کریں۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خانقاہ کے دروازے کھول دیئے، شاہ فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اجمیری دروازے میں اپنا مدرسہ جاری کیا، پھر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ رحیمیہ کو فروغ دیا، اگرچہ ان حضرات کا طریق تبلیغ جدا جدا تھا، مگر ایک دوسرے کے مددومعاون تھے، ان حضرات کی مساعی جمیلہ کا انعام یہ ملا کہ ان کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی، ان پر ستم ڈھائے گئے اور ہر طرح

اذیتیں دی گئیں، مگر یہ دھن کے پکے برابر تبلیغ میں منہمک رہے۔

روایت ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ اور ابن عبدالوہاب مدینہ منورہ میں ایک ہی استاد کے شاگرد تھے یا یہ کہ وہاں دونوں ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہتے تھے۔(۱) ۱۱۴۵ھ میں حجاز سے واپس آکر شاہ صاحب نے پہلی کتاب ''البلاغ المبین'' تصنیف فرمائی تھی،(۲) اس میں ابن عبدالوہاب کے بعض مضامین کی تائید کی تھی، لیکن بعد میں ان مضامین کو ترک کر کے اس کتاب کو ضائع کر دیا، لہذا ان کی تصانیف میں اس کتاب کا ذکر نہیں پایا جاتا، مولانا ابوالکلام کا بیان'' ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی'' کے صفحہ ۳۵۴ پر اسی حقیقت کا اعادہ کر رہا ہے کہ'' شاہ ولی اللہ جو عین محمد بن عبدالوہاب نجدی کے ظہور وشیوع عقائد کے زمانہ میں حرمین میں مقیم تھے، کتاب'' التوحید'' کو دیکھ کر ان کے خیالات میں بھی گونہ فطور ہوا، وہ اس فتنہ کو اپنے ہمراہ لائے۔'' یہاں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ شاہ ولی اللہ دامن نہ بچا سکے،(۳) اگرچہ ان کی زندگی میں ان کی خاص تصنیفات شائع نہیں ہوئی تھیں، ان کے محرم راز شاگرد مولانا محمد عاشق نے لکھا ہے کہ خاص خاص لوگ ان کے خاص ذوق ومشرب سے واقف تھے، تاہم '' حجۃ اللہ البالغہ'' اور '' تفہیمات الہیہ'' پر لوگوں کی نظریں پڑ چکی تھیں اور گو ان کی صولت علم، ذی تصوف وطریقت ہونے کی وجہ سے زیادہ فتنہ نہ اٹھ سکا تاہم لوگوں کے دلوں میں گرہیں پڑ چکی تھیں۔ شاہ ولی اللہ کے ان خیالات کی تائید مولوی عبیداللہ سندھی نے بھی کی ہے اور ان کی کتاب '' شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک'' میں یہ مفہوم موجود ہے۔

۱۔ اسی قسم کی بات شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب '' رود کوثر'' مطبوعہ لاہور، ۱۹۸۷ء کے صفحہ ۵۴۳ پر بھی لکھی ہے۔ یہ ایک بے بنیاد مفروضہ ہے، جس کا کوئی ثبوت اور دلیل نہیں۔ (خلیل احمد رانا)

۲۔ بلاغ المبین، شاہ ولی اللہ دہلوی کی طرف منسوب جعلی کتاب ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا مقالہ '' شاہ ولی اللہ سے منسوب بعض رسالے مجلہ '' تحقیق'' شمارہ خاص (۱۱۔۱۰) ۱۹۹۷ء مطبوعہ شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی جامشورو، ۱۹۹۸ء، ص ۱۔۷۔)(خلیل احمد رانا)

۳۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حالات پر مشتمل مفصل ومستند کتاب '' القول الجلی'' از شاہ محمد عاشق پھلتی کی دریافت نے ایسی تمام باتوں کا خاتمہ کر دیا ہے، اصل مخطوطہ کا عکس دہلی سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ (خلیل احمد رانا)

بہرحال شاہ ولی اللہ نے ہر شعبہ زندگی کے لئے اپنے اجتہاد سے تدابیر نافع ایجاد کی ہیں، ان کی تحریک مذہبی، اخلاقی، سیاسی اصولوں پر مبنی تھی، ان کا استدلال استغراقی بھی ہے اور استخراجی بھی ہے، وہ مشائی اور اشراقی مکاتیب کے سنگم ہیں، مخالفین میں اتحاد پیدا کرتے ہیں، وحدت الوجود کے قائل ہیں، اس لئے ان کے افکار میں جامعیت ہے، حنفی، شافعی اختلافات میں تطبیق کی ہے اور شریعت وطریقت کے فرق کو دور کیا ہے، حدیث وفقہ میں راہ اتحاد نکالی ہے، اہل دین اور اہل عقل میں سمجھوتہ کرانے کے لئے قرآن وحدیث وضاحت قدیم وجدید فلسفہ کے ذریعہ کی ہے، ارشاد ہے کہ اہل دین کلی تصورات پر جمے بیٹھے ہیں اور ارباب عقل جزوی امور میں الجھ کر رہ گئے ہیں، مگر دونوں حقیقت سے دور ہیں، انہوں نے نہ صرف صوفی وملا کے اختلافات کو دور کرنا چاہا بلکہ نظام حکومت کو بدلنے کی بھی تجاویز بتائیں تاکہ اجنبی واغیار کے تسلط سے نجات مل سکے، انہوں نے دو مغلیہ بادشاہوں کا زمانہ پایا، خلفشار کو بچشم خود دیکھا، سیاسی احوال میں ابتری تھی، علماء جہل وغوایت میں مبتلا تھے، فرقہ بندیوں کا زور تھا، مباحثوں کا شوق تھا، غرض ہندی مسلمان پر سیاسی، اقتصادی، معاشرتی ومذہبی تباہیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے، انہوں نے اپنی تحریک کی اشاعت کے لئے جمعیۃ مرکزیہ قائم کی تھی، جس کی شاخیں نجیب آباد، بریلی اور سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھہ میں کھل گئی تھیں لیکن بایں ہمہ ان کی تعلیم کتاب میں بند رہی، بجائے عمل ہونے کے قولی ثابت ہوئی، اس لئے کہ اس کی تعمیل کرنے کے لئے فضاء میں آثار نہیں تھے اعتقاد کی درستی، بدعت اور اصلاح رسوم ان کے مقاصد عظیم تھے لیکن غلط ذہنیت نے بدترین مخالفت پر کمر باندھ لی، پھر انگریزی حکومت کب گوارا کر سکتی تھی کہ شاہی نظام حکومت کی اصلاح کی جائے، اس زمانہ کی حالت کا نقشہ کسی دوست کو بزبان عربی لکھا تھا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ زمانے کا رنگ بدل گیا ہے، مذہب کا سرچشمہ مکدر ہو گیا ہے، جو پوشش مسلمانوں کو رونق دے رہی ہے وہ غیر اسلامی ہے، ضرورت ہے کہ پانچ قسم کے

لوگوں سے پرہیز کیا جائے۔

۱۔ جھگڑالو معقولی سے جو شکوک واوہام کو شہ دیتا اور خدا کا مطیع ومنقاد نہیں ہے۔

۲۔ کج خور فقیہ سے جو مردہ قوتوں پر خوش ہوتا ہے اور نبی پاک ﷺ نے جن باتوں کی توضیح فرمائی ہے ان کی پیروی نہیں کرتا ہے۔

۳۔ خشک زاہد سے جو دین میں اس درجہ تشدد کرتا ہے کہ گویا اسے کسی بارے میں کوئی اجازت نہیں ہے۔

۴۔ بے حیا صوفی سے جو رفع تکلیف کے لئے حیلہ کرتا ہے اور اپنے مجازی امور میں توقف نہیں کرتا۔

۵۔ سرکش مالدار سے جو تکلف بناوٹ کے ساتھ عجمیوں کی ہیئت اختیار کرتا ہے اور ان کے ہم پیالہ ہم نوالہ ہونے کو دوست رکھتا ہے۔

بہر حال ان کی تصنیفات ان کے اصول تعلیم سے لبریز ہیں، اور اس کا خلاصہ انہوں نے اپنے وصیت نامہ میں بھی کھول کر مختصراً بیان کیا ہے، معاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے مندرجہ ذیل اصلاحات کی تھیں۔

۱۔ نکاح بیوگان کا اجراء۔

۲۔ بڑے مہر باندھنے کی ممانعت۔

۳۔ غمی وخوشی کے مواقع پر اسراف سے پرہیز، رسوم چہلم، چھ ماہی و برسی کی ممانعت۔

مذہبی اصلاحوں کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ اجتہاد کو ضروری سمجھتے ہیں، مگر یہ عوام کا کام نہیں ہے۔

۲۔ اختلافات میں تشدد کے مخالف ہیں، اس لئے کہ اس سے تنگی پیدا ہوئی ہے، دین کے معاملہ میں وسعت کی ضرورت ہے۔

۳۔ عامی کو مجتہد کا مقلد ہونا چاہیے ورنہ نظام شرع درہم وبرہم ہو جائے گا،

مگر تقلید میں اعتدال ضروری ہے۔

۴۔ نفی خودی کے بارے میں مشائخ سے انہیں اختلاف تھا۔

۵۔ اغیار سے نجات پانے کے لئے جہاد کو ضروری لکھا ہے، شاہ صاحب کا خیال تھا کہ حکومت کرنے کی قابلیت افغانوں میں منتقل ہوگئی ہے۔ اس لئے نجیب الدولہ کو ترغیب دی کہ احمد شاہ ابدالی کو دعوت دیں، گویا پانی پت کی فتح کے ذمہ دار شاہ صاحب ہی ہیں، شاہ صاحب چاہتے تھے کہ جہاد کیا جائے، لیکن اس وقت جبکہ عقائد ٹھیک ہو جائیں، اقتصادی حالت سنبھل جائے اور صحیح احساس کے بعد مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو جائے، حجۃ اللہ البالغہ میں عقائد و عمل کی وضاحت کر کے صراط مستقیم دکھائی ہے، شاہ صاحب کے وصال کے دو سال بعد شاہ عالم نے کمپنی بہادر کو دیوانی کے حقوق دیئے تھے، ان کا وصال لارڈ کلایو کے جانے کے بعد اور میر جعفر کے انتقال سے تین برس پہلے ہوا تھا۔

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

شاہ ولی اللہ نقش اول تھے اور ان کے بڑے صاحبزادے شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ اسم با مسمی ہونے کی وجہ سے نقش ثانی تھے، مذکورہے کہ ''وے جامع علوم بلکہ آیت الٰہی بود'' والد کے وصال کے بعد ان کی جانشینی کے وقت دستار باندھتے ہوئے ان کے کان میں شاہ فخر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا، تمہارے والد کی چادر پر ایک سیاہ دھبہ ہے تم اسے دھونا، یہ اشارہ تھا مضامین بلاغ المبین کی طرف،(۱) مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی لکھا ہے کہ والد مرحوم کہتے تھے کہ شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد حضرت شاہ عبد العزیز کی سجادہ نشینی کی مجلس میں شاہ فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے سر پر

۱۔ حضرت مولانا فخر الدین دہلوی علیہ الرحمۃ نے شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کی کتاب ''الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ'' میں اتصال نسبت کے حوالے سے ایک شبہ پر بات کی تھی، فخر الطالبین و مناقب فخریہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ شاہ ولی اللہ نے آخر میں اپنا خیال بدل لیا تھا، بلاغ المبین والی بات درست نہیں۔

پگڑی رکھی تو کان میں کہا کہ تمہارے خاندان کی چادر پر ایک دھبہ لگ چکا ہے، اپنی سعی وہمت سے اسے دھوڈالنا، شاہ ولی اللہ کے متعلق مشہور تھا کہ اپنے ذوق فن میں اعتزال کی طرف بھی ان کا میلان رہا ہے، چنانچہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے کمال سادگی اور خوش اخلاقی سے اس سیاہ دھبہ کو دھوڈالا، ان مسائل میں والد کی تقلید نہیں اور تعلیم ولی اللہ میں بے حد فراخی ووسعت پیدا کی، عظمت ومقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دہلی سے لے کر کلکتہ وپشاور تک شاگردوں اور مریدوں کا سلسلہ پھیل گیا، علمائے ہندوستان بغیر ان کا مشورہ لئے اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے اور نزاعی مسائل میں عرب، روم اور شام کے علماء ان سے ہی رجوع کیا کرتے تھے، ان کی تصانیف وتقاریر سے ان کی وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے، آخر میں کثرت امراض کی وجہ سے جسمانی طاقت نے ساتھ چھوڑ دیا تھا لیکن برکات باطنی اور حدت قوئ روحانی کی بدولت جب مسائل کی شرح فرماتے تو ایک دریائے زخار موجزن ہو جاتا اور حاضرین وسامعین پر کیفیت طاری ہو جاتی، ہفتہ میں دو بار مجلس وعظ منعقد کرتے تھے، مخلوق مور وملخ کی طرح جمع ہو کر رشد وہدایت حاصل کرتی تھی، خود فرمایا کرتے تھے کہ باوجود بیماریوں کے حواس اس لئے قائم ہیں کہ خادم حدیث سے ہرزہ سرائی سرزد نہیں ہو سکتی، میں بچپن سے اسی کام میں ہوں، حضرت کی خدمت میں اجناء بھی درس لینے حاضر ہوا کرتے تھے اور حضرت کی رسائی ارواح مقدسہ کی خدمت میں بھی تھی، ملفوظات میں برملا ہدایت کی ہے کہ بزرگان سلف کی روحوں سے توسل واستمداد حاصل کرنا چاہیے کہ اس میں ان کو بڑا دخل اور بڑی قوت حاصل ہے، فرمایا کہ شب برأت میں نان یا حلوہ پر فاتحہ دینا اور قبرستان میں جا کر فاتحہ پڑھنا رسول پاک ﷺ کی سنت ہے، علی محمد خاں رئیس مراد آباد کے جواب میں فرمایا کہ!

"فقیر کے مکان پر سال بھر میں دو محفلیں ہوتی ہیں، محرم کے دسویں دن یا ایک دو دن پہلے، قریب ایک ہزار آدمی کم وبیش آتے ہیں، پھر بعد فاتحہ جو کچھ موجود ہوتا ہے تقسیم کرا دیا جاتا ہے اور بارہویں تاریخ ربیع الاول کو

اسی قدر آدمی ہوتے ہیں، حال ولادت شریف، رضاع وحلیہ وغیرہ بیان کر کے جو کچھ کھانا یا شرینی ہوتی ہے اس پر فاتحہ دے کر تقسیم کر دی جاتی ہے۔"

ملفوظات میں یہ بھی لکھا ہے کہ تیوہاروں میں روحیں آتی ہیں، عید میں، عشرہ محرم وغیرہ میں، حدیث کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ حضرت ایوب انصاری ؓ حضرت ﷺ کے مزار مبارک پر منہ رکھے ہوئے رو رہے تھے، اس سے بزرگوں کے مزار پر بوسہ دینے کی حجت نکلتی ہے، مردے کے سرہانے پھول یا خوشبو رکھی جائے تو اسے پہنچ جاتی ہے، قبر کو سجدہ گاہ نہیں بنانا چاہیے، بزرگوں کے نام پر بکرے وغیرہ ذبح کرنا ممنوع ہے، خدا کے نام پر کر کے ان کو ایصال ثواب کرنا چاہیے، شریعت مستقل طریقت کا نام ہے، فنا و بقا کا کمال یہی ہے کہ عشق و شوق کے ساتھ شریعت محمدی کا اتباع کیا جائے، شیطانی خطرہ میں اصرار نہیں ہوتا اور نفسانی خطرات پے بہ پے آتے ہیں، نفسانی خطرات زیادہ سخت ہوتے ہیں، اس لئے کہ نفس انسان کے ساتھ جنگ کرتا ہے، اس طرح جیسے مرہٹوں اور انگریزوں کی جنگ میں کی جاتی ہے، نفسانی وساوس مشکل سے رفع ہوتے ہیں، کیونکہ نفس باقاعدہ منظم صورت سے جنگ کرتا ہے اور شیطان دور سے نظر آتا ہے، نفس کا سامان جنگ عورت، اولاد، لباس و مال ومتاع ہیں، شیطان ادنی جنگ سے رفع ہوجاتا ہے اور نفس بڑی کوشش اور دقت سے صحیح ہوتا ہے، دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے، شیطان کا علاج ذکر اللہ اور تلاوت قرآن ہے اور دنیا کا علاج زہد و تقویٰ ہے، مخلوق کا علاج گوشہ نشینی ہے مگر نفس کا علاج دشوار ترین ہے اور سمجھنا مشکل ہے، نفس کی جو خواہش ہو تو کوئی ہرگز اس کے مطابق نہ کرے مگر شریعت کے اتباع میں کام کرے، عجب وحسد شیطان کے داؤ ہیں، عجب عبادت سے تعلق رکھتا ہے، کاہل وطوائف عجب کے مرض میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ (ملفوظات عزیزی ص ۱۳۲)

یہ سمجھنا چاہیے کہ پیر کی اتباع سلوک ذکر وفکر میں ہوتی ہے اور معارف وکشوفات خود اپنے ہوتے ہیں، اگر ایسا ہی ہے تو مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد

کے نظریہ کے خلاف تھے کیونکہ خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ خالص وجودی نظریہ رکھتے تھے، دوسری بات یہ ہے کہ لوگ کم سمجھتے ہیں، تجلی الٰہی جو اولیاء پر، پر تو فگن ہوتی ہے، جس سے وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں، بعض اوقات صرف اپنے ہی وجود پر نظر ہوتی ہے، جیسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا کہ ''میں نے ہی حضرت نوح کی کشتی کو ٹھہرایا تھا، میں ہی قیامت کا باعث ہوں، میں زندہ رہوں گا، مجھے موت نہیں آئے گی، یا دوسرے بزرگ جو اپنے اندر تجلی الٰہی پاتے ہیں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ نے تجلی الٰہی کا نظارہ کیا پر فرمایا کہ میرا ہاتھ بیعت کرنے والوں کے ہاتھ پر ہے یا یہ کہ تو نے پتھر نہیں پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا ہے، در حقیقت ایک مٹھی سنگریزے ایک ہزار آدمیوں کی آنکھوں کو کیسے اندھا کر سکتے ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہی معلوم ہوا کہ جو ہاتھ خدا کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہو، اس ہاتھ سے شرم گاہ کو کیسے چھوا جا سکتا ہے، جس طرح دریا سے ایک کوزہ پانی بھر کر لائیں، جب برتن کی قید اور دریا کی جدائی پانی کو دیکھے گی تو تامل کرے گی کہ میں ہی ہوں جس میں جاری ہوتی ہیں کشتیاں وغیرہ، میں ہی دریا ہوں، میں ہی اکبر آباد میں ہوں میں ہی سارنگ پور میں ہوں، غرض کہ اس قسم کی باتیں اس سے ظاہر ہوں گی، اسی کو تجلیات کہتے ہیں، وجودی و شہودی سب ان تجلیات کے قائل ہیں، یہ حال ہمیشہ ہر شے کی حقیقت میں ہوتا ہے یا نہیں، ہم نہیں کہہ سکتے لیکن یہ اور تحقیق ہے، اگر ذرا تامل کیا جائے تو ہر ہر چیز کی نفس الامر تحقیق پر موقوف نہیں ہے بلکہ سلوک کی غرض و غایت یہ ہے کہ تجلیات الٰہی کا وجود ہے، اگر اس کا وجود نہ ہو تو ولی کا وجود نہ ہو۔ (ملفوظات عزیزی ص ۱۹۰، ۱۹۱)

شاہ صاحب نے اپنے عہد کی تصویر لطف کے ساتھ کھینچی ہے!

''اس زمانہ میں سلامتی ہونے کے لئے منہیات کے ارتکاب کی ضرورت نہیں بلکہ قرآن ہاتھ میں رکھنا اور قرآن وحدیث پر عمل کرنا ملامتی بننے کے لئے بس ہے، کیونکہ ایسے آدمی کو آج کل برا سمجھا جاتا ہے۔ (ملفوظات ص ۱۹۳)

حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر زمانہ میں نصاریٰ کا تسلط ہوگا، ملک کفر کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے، مگر ظلم کے ساتھ نہیں، اہل اسلام میں ظلم شائع ہو گیا ہے اور ارشاد رسول کریم ﷺ ہے کہ ان (نصاریٰ) کو مہدی علیہ السلام قتل کریں گے۔ شاہ عبدالعزیز نے شاہ عالم اور اکبر شاہ کے عہد دیکھے تھے۔ لارڈ ہسٹنگز نے ۱۸۳۳ء میں استعفیٰ دیا تھا۔ اس کے سال بھر بعد شاہ صاحب کا وصال ہوا۔ فرمایا: ''امن صرف طاقت کے سہارے قائم ہو سکتا ہے۔ دنیادار ہمیشہ حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔''

سیاست کے متعلق ان کے فتوؤں سے ان کی وسیع النظری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انگریزی تعلیم کا جب اجراء ہوا تو مسلمان اس کے خلاف تھے، مگر شاہ صاحب نے زیروزبر بنا کر فتویٰ دیا کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں فائدہ ہے۔ انگریز کی ملازمت کرنے کے متعلق فتویٰ دیا کہ خاص اشکال سے جائز ہے۔ جلاوطنی کے بعد جونپور سے واپس آ کر دہلی پر انگریزوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور وہ یہ ہے:۔

''دارالاسلام، دارالحرب نہیں ہوتا، مگر تین چیزوں سے۔

ا۔ احکام شرک جاری کرنے سے۔

۲۔ دارالحرب کے متصل ہونے سے اور اس وجہ سے کہ نہ باقی رہے اس میں کوئی مسلمان یا ذمی امن کے ساتھ۔ جس طور سے کہ پہلے امن تھی جان کی۔'' ۔۔۔۔ مراد دارالحرب سے وہ شہر ہے کہ جن میں کفار کے بڑے کا حکم جاری ہو اور وہ شہر اس کے قبضہ و تصرف میں ہو۔ اس شہر میں حکم امام المسلمین کا قطعاً جاری نہیں ہے۔ اور حکم رؤسا نصاریٰ کے لئے دغدغ جاری ہیں۔ مراد جاری ہونے احکام کفریہ سے یہ ہے کہ معاملہ ملک داری و بندوبست رعایا اور خراج و باج و عشور، اموال تجارت و سیاست،

قطاع الطریق اور چوروں کی، اور فیصلے لڑائی جھگڑوں کے اور سزا گناہوں کی۔ کفار بطور خود دیتے ہیں۔ ہاں اگر بعضے احکام اسلام کا، مثل جمعہ و عیدین واذان وذبیحہ بقر کے تدارک نہ کرتے ہوں، لیکن اصل اصول ان چیزوں کا ان کے نزدیک غلط وبیکار ہے۔ اس لئے کہ مسجدوں کو بے تکلف منہدم کردیتے ہیں اور کوئی مسلمان یا ذمی بغیر امن حاصل کئے ہوئے ان کے اس شہر میں اور اطراف میں نہیں آسکتا۔ اپنی منفعت کے لئے وار دین اور مسافرین وتجار کی مخالفت نہیں کرتے ہیں، اور دوسرے اعیان مثل شجاع الملک اور ولایتی بیگم بغیر ان کے حکم کے ان شہروں میں داخل نہیں ہوسکتے۔ اس شہر سے کلکتہ تک عمل نصاریٰ پھیلا ہوا ہے، دائیں بائیں مثل حیدرآباد لکھنؤ ورامپور نے اپنے احکام جاری نہیں کئے ہیں۔ بہ سبب مصالحت واطاعت مالکان ان ممالک کے۔۔۔۔۔ (عہد نبوت اور حضرات شیخین کے زمانہ میں دار الحرب بنائے جانے کی مثالیں ثبوت میں پیش کی ہیں۔ (فتاویٰ عزیزی جلد اول ص ۱۷) لکھنؤ، ورامپور دار الحرب نہیں بلکہ کلکتہ سے لاہور تک کا علاقہ دار الحرب ہے۔ (ملفوظات عزیزی، ص ۱۷۳)۔۔۔۔ یعنی اس فتویٰ میں شاہ صاحب نے انگریزوں کے ہی نہیں بلکہ سکھوں کے وحشیانہ وظالمانہ طریقہ پر بھی توجہ فرمائی ہے۔ شاہ صاحب ضعف زمانہ اور اپنی بیماریوں کی وجہ سے خود جہاد نہ کر سکے، مگر جہاد کا فتویٰ دے کر جہاد کا راستہ کھول دیا تاکہ تحریک ولی اللہی کی تعمیل کی جاسکے۔ مذہبی ومعاشی اصلاحیں جو شاہ ولی اللہ نے فرمائی تھیں، ان پر عمل کروانے کی بہترین کوشش کی اور ان کی یہ کوشش کامیاب بھی ہوئی۔ شاہ صاحب کا وصال ۷ر شوال ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء کو ہوا۔ مومن خان نے تاریخ وصال لاجواب لکھی تھی۔"

دست بے داد اجل سے بے سروپا ہو گئے
فقر و دین فضل و ہنر لطف و کرم، علم و ادب

شاہ عبدالعزیز صاحب کے اولاد نرینہ نہیں تھی مگر اولاد معنوی بے شمار تھی۔ تین صاحبزادیاں تھیں، ایک مولوی عبدالحی کو بیاہی گئی تھیں، دوسری کی شادی شاہ رفیع الدین کے صاحبزادے مولوی عیسیٰ صاحب سے ہوئی تھی۔ مولوی عیسیٰ کے حقیقی بھائی مولوی مخصوص اللہ تھے، تیسری شیخ محمد افضل کی زوجیت میں دی گئی تھیں، شیخ محمد افضل کے دو صاحبزادے شاہ محمد اسحاق اور مولوی محمد یعقوب تھے، شاہ صاحب نے اپنا ورثہ و ترکہ اپنی تینوں صاحبزادیوں کو دیا اور اس کے بعد شاہ محمد اسحاق ان کے جانشین بنے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شاہ محمد اسماعیل

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی بھائی شاہ عبدالغنی مجذوب تھے، شاہ عبدالقادر پندرہ روسا دہلی اور خصوصاً بخشی بھوانی شنکر ان کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔
(مقالات سرسید حصہ شانزدہم۔ص ۲۶۰)

ان مجذوب صاحب کے صاحبزادے شاہ محمد اسماعیل تھے جو ۱۲ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء کو عہد دارالحکومت میں پیدا ہوئے تھے، ان کی تعلیم و تربیت شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز کے زیر سایہ ہوئی تھی، شاہ اسماعیل نے پندرہ برس کی عمر میں تعلیم سے فراغت پائی، علم و فضل میں طاق اور ذہانت و فراست میں برق تھے، کچھ دن مولوی عبدالحئی (بڈھانوی) کی شاگردی میں رہے تھے اور بعد میں کچھ دن سید احمد رائے بریلوی کو پڑھایا تھا، ان کی تقریر دل کش تھی، وعظ بے تکان فرماتے تھے اور تحریر میں ید طولیٰ رکھتے تھے، شہ سواری، سپہ گری، پہلوانی اور تیر اندازی میں بھی کمال رکھتے تھے۔

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا ترکہ اپنی صاحبزادیوں کو دیا تھا اور وصال سے کچھ پہلے اپنے نواسے شاہ محمد اسحاق کو اپنا جانشین بنایا تھا، شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحئی کو اس بات سے مایوسی ہوئی، شاہ صاحب کو شاہ اسماعیل کا خیال تھا اس لئے شاہ رفیع الدین کے انتقال کے بعد ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء میں شاہ اسماعیل کو ان کی مسند درس عطا کردی، شاہ اسماعیل نے شاہ عبدالعزیز کے مسلک کے خلاف اپنا مسلک بنایا تاکہ اہمیت حاصل کرسکیں، ان کے عقائد نجدیوں سے ملتے جلتے ہیں، اپنے مسلک کی اشاعت ابتداء میں طبقہ اسفل سے شروع کی، جامع مسجد کی سیڑھیوں پر وعظ دینے

شروع کئے، ان کی جادو بھری تقریروں سے لوگوں کا رجحان ان کی طرف بڑھنے لگا، خاندان کے علماء اور مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں تنبیہ و فہمائش کی مگر وہ اپنی روش پر قائم رہے، چنانچہ مناظروں اور مباحثوں کی وجہ سے فتنہ کا اندیشہ ہوا تو ریزیڈنٹ چارلس منکاف (۱۸۔۱۸۱۱ء) نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر وعظ کہنے کی ممانعت کردی، شاہ اسماعیل نے ریزیڈنٹ سے صفائی کرنا ضروری سمجھی، اس زمانہ میں انگریز آرزو کرتا تھا کہ صاحب اثر علماء و شرفاء سے ربط و ضبط پیدا کرے، ریزیڈنٹ نے بڑے تپاک سے شاہ اسماعیل کا استقبال کیا اور ان کی تقریر سے مرعوب ہو کر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر وعظ کہنے کی اجازت دے دی، اس طرح دونوں میں مراسم دوستی بڑھ گئے، وعظ کی بندش سے پہلے شاہ اسماعیل نے اپنی کتاب ''ردشرک'' عربی میں تصنیف کی تھی، اس کا ترجمہ ''تقویۃ الایمان'' کے نام سے بعد میں شائع کیا، اس کا مسودہ احباب کو سناتے وقت انہوں نے اقرار کیا تھا کہ بعض جگہ شرک خفی کو شرک جلی لکھ دیا ہے، لہذا ترمیم کر کے تصحیح کر دوں گا، مومن خاں نے رائے دی کہ ایسی ہی رہنے دیجئے، بدلنے کی ضرورت نہیں، تقویۃ الایمان میں جہاد کا مطلق ذکر نہیں ہے، ریزیڈنٹ نے کسی ملاقات میں یقیناً شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دارالحرب والے فتوے کا مطلب و مقصد سمجھا اور ایسا مفہوم بھی ظاہر کیا ہوگا کہ ہم لوگ کسی کے مذہب میں دراندازنہیں ہوتے اور امن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر یہ فتویٰ ہمارے خلاف کیوں جاری کیا گیا ہے، برخلاف ہمارے سکھوں کو دیکھئے کہ مسلمانوں پر کس درجہ مظالم کرتے ہیں اور انہیں معافی دے دی گئی ہے۔ پتا نہیں کہ شاہ صاحب نے کس منطقی اصول سے ریزیڈنٹ کی تسلی کی، مگر سکھوں کے مظالم والی بات کو گرہ میں باندھ لیا۔ دارالحرب والے فتوے کے معنی سمجھے جس میں کلکتہ سے لاہور تک کا ملک دارالحرب قرار دیا ہے اور اس کا اشارہ انگریز اور سکھ دونوں کی طرف ہے پھر: ''شنیدہ کے بود مانند دیدہ'' کے اصول پر پنجاب کا خفیہ دورہ کیا، سکھوں کے مظالم بچشم خود دیکھے اور یہ بھی ملاحظہ کیا کہ بے کس مسلمان سکھوں کی عملداری سے بھاگ کر انگریزی عملداری میں آکر پناہ لیتے ہیں۔ اور حفاظت و امن کے ساتھ رہتے ہیں، نتیجہ یہی نکالا

جاسکتا تھا کہ سکھوں سے انگریز اچھے ہیں، پھر سکھوں کے خلاف انگریز سے مدد بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز کے معتقدین بھی ساتھ ہو جائیں گے اور ہندوستانی مسلمان جو کارتاوالس اور ولزلی کے اصولوں کی وجہ سے ابتلاء میں مبتلا ہیں خود بخود ہم نوا بن جائیں گے۔

دہلی واپس آکر تکالیف برداشت کرنے کی عادت ڈالنا شروع کر دی۔ ننگے پاؤں تپتی زمین پر ٹہلنا شروع کر دیا۔ پیاس اور بھوک پر غالب آنے کی مشق کی۔ گویا ہر تکلیف کو راحت بنالیا۔ اور سکھوں کے خلاف اجرائے جہاد کی تدبیریں سوچنے لگے۔ اس عرصہ میں دہلی کا ریزیڈنٹ بدل گیا تھا اور اس کرم فرما کے بجائے ڈیوڈ آکٹرلونی ریزیڈنٹ ہو کر دوبارہ آگیا تھا، جس سے شناسائی نہ تھی۔ اندریں حالات اپنے استاد مولوی عبدالحی (۱) کو ہمراز بنا کر مشورہ کر سکتے تھے۔ اور چونکہ مولوی صاحب میرٹھ میں انگریز کے دفتر میں ملازمت کرنے کی وجہ سے صاحبان والاشان کے مزاج اور عادات سے بھی واقف تھے۔ ان سے بھی بہترین مدد ملنے کی پوری امید تھی۔ جب مشکلات کی وجہ سے اسکیم تیار نہ ہو سکی تو مولوی عبدالحی نے مشورہ دیا کہ اس مشکل کو سید احمد صاحب سے حل کرنا چاہیے اور وہ اپنی روحانیت سے صحیح رائے بتادیں گے۔ بقول سرسید احمد خاں:

> ''مولوی محمد اسماعیل قائم مقام علوم رسمی کی درس تدریس میں مصروف تھے اور اہل باطن کی طرف چنداں ملتفت نہ ہوتے تھے۔''

(مقالات سرسید حصہ شانزدہم ص ۲۴۰)

وہ اس تجویز پر راضی ہونے والے نہ تھے۔ مگر غرض بری بلا ہوتی ہے، مولوی عبدالحی کے ساتھ انہیں سید احمد صاحب کی خدمت میں جانا پڑا۔ سید صاحب کی روحانیت کی عام شہرت تھی۔ اور یہ بھی مشہور تھا کہ امیر خاں کو نوابی انہوں نے ہی دلوائی ہے اور اس معاملہ میں ڈیوڈ آکٹرلونی کا بھی دخل تھا۔ لہذا ایسی دو امور ایسے تھے جن کی

۱۔ بڈھانہ ضلع مظفرنگر کے رہنے والے تھے شاہ عبدالعزیز کے بھانجے، شاگرد اور داماد تھے۔ مدرسہ رحیمیہ میں معلم رہے تھے۔ علمی فضیلت اور طبعی متانت کی وجہ سے انہیں تفوق حاصل تھا اور شاہ عبدالعزیز کے معتمد خاص تھے۔

وجہ سے شاہ اسماعیل سید احمد صاحب کی خدمت میں جانے کو تیار ہو گئے۔ سید احمد صاحب نے جس طرح دو نفل مولوی عبدالحی کو پڑھوا کر متاثر کیا تھا، اسی طرح شاہ اسماعیل کو بھی دو نفل پڑھنے کی فہمائش کی۔ دو سجدوں میں سارا وقت گذر گیا۔ علم معقول شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ فہم وفراست اس کی توجیہ نہ کر سکی۔ وہ سمجھتے تھے کہ روحانیت بغیر عقل کے ایسی ہے جیسے خودرو گھاس، لیکن عقل کے ذریعہ اس سے گل وثمر حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس مشاہدہ سے حیرت اس درجہ ہوئی کہ سکھوں سے جہاد کرنے کا تصور غائب ہو گیا۔

"شاہ اسماعیل نے سید احمد صاحب کی خاص باتوں میں اطاعت قبول کر لی اور سنت نبوی کے مطابق بیعت بھی کی"۔ (حیات طیبہ ص ۲۰۹)

میرزا حیرت کی اس صداقت کا ثبوت شاہ اسماعیل کے عقائد واعمال سے مل جاتا ہے۔ بہر حال شاہ اسماعیل سید صاحب کی روحانیت سے زیادہ ان کی مقبولیت کے قائل ہوئے، کیونکہ ان کی مقبولیت سے انہیں کام لینا تھا۔ سید احمد صاحب روحانی آدمی تھے۔ ان کی رطف مخلوق کا رجحان بھی اسی سبب سے تھا مگر انہیں دنیوی وسیاسی امور کی سوجھ بوجھ مطلق نہیں تھی، سوائے اس کے کہ "علم لدنی" یا روحانیت سے کچھ بتا دیا کرتے تھے۔ بچپن میں بجائے تعلیم حاصل کرنے کے انہوں نے سودا سلف لا کر محلہ والوں کی خدمت کی۔

مدرسہ رحیمیہ کی طالب علمی کے زمانہ میں بھی وہاں کے رہنے والے درویشوں کی خدمت کی اور امیر خان کے یہاں رہ کر بھی سپاہیوں کی برابر خدمت کرتے رہے۔ سچ یہ ہے کہ اسی خدمت سے انہیں عظمت حاصل ہوئی تھی۔ ایسے بزرگوں سے ان کی وجدانیت کے باعث ان کے معتقدین وخدام ان سے اپنی عجیب عجیب من مانی اغراض منوالیا کرتے ہیں، اور دنیا بھر میں ایسی باتوں کو کرامت سے مشہور کر دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ واقعات سے ثابت ہے کہ شاہ اسماعیل نے یہی کیا۔

یہ صحیح ہے کہ سیاست مذہب کی لونڈی ہے، مگر شاہ اسماعیل کا تصور تھا کہ مذہب میں اختراع کر کے اپنی نئی حکومت بنالیں گے اور حاجی شریعت اللہ سے سبقت لے جائیں گے، مگر ان کی جدتیں تیز مزاجیاں اور تنگ نظریاں تفرقہ کا باعث بنیں۔ ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا، ان کی تعلیم آج تک اتحاد سے محروم ہے۔ ان عبدالوہاب کی تقلید میں یہاں کی حکومت کو اپنا سرپرست بنانا چاہا، مگر انگریز ان سے زیادہ ہوشیار تھا۔ جب تک سکھوں سے باوجود معاہدہ خوف رہا، شاہ اسماعیل کو آلۂ کار بنایا۔ مگر ان کے انتقال کے چند روز بعد ان کے معتقدین پر وہ ستم ڈھائے کہ توبہ ہی بھلی، کیونکہ اب رنجیت سنگھ اور انگریز کے درمیان دائمی صلح کا معاہدہ ہوگیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ سید صاحب کی روحانیت شاہ اسماعیل کی خودرائی اور تیزیٔ مزاج کو کیوں نہیں دور کرسکی۔ اس کے دو ہی جواب ہوسکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ سید صاحب کی روحانیت اس درجہ کامل نہیں تھی، یا شاہ اسماعیل کی استعداد میں نقص تھا، دونوں وجوہ صحیح ہوسکتے ہیں، مگر بظاہر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ شاہ اسماعیل بجائے حقیقت پر غور کرنے کے اپنے علم معقول کی بنا پر فروعات میں مبتلا ہوگئے، معقولات سے پیدا ہونے والی ضد اور نخوت نے بے باک بنا کر ادب سے بھی بے نیاز کردیا، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدات سے شاہ اسماعیل کے اختراعات نہیں ملتے، اگرچہ مصلحتاً شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے ہی منسوب کیے جاتے ہیں، شاہ اسماعیل کے اختراعات ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی حسین کی کمر ہو، اور کمر کی تعریف میرزا غالب جیسے رند شاعر نے بڑے لطف سے بیان کی ہے:

ہے کیا جو کس کے باندھیے، میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

اپنی کتاب "تحقیق الحقیقۃ" (۱) میں مولانا فضل رسول بدایونی علیہ الرحمۃ نے مولوی مخصوص اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ (فرزند رشید شاہ رفیع الدین) کی روایت لکھی ہے

کہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نابینائی کی وجہ سے معذور ہو گئے تھے، جب تقویۃ الایمان کی بابت سنا تو فرمایا:

"اگر بیماریوں سے معذور نہ ہوتا تو تحفہ اثنا عشریہ کی طرح اس کا بھی رد لکھتا۔"

اس کے علاوہ یہ بھی سنا ہے کہ شاہ اسماعیل اپنے اختراعات کے متعلق دوسروں کے ذریعہ شاہ عبدالعزیز سے اکثر استفسار کیا کرتے تھے اور ہم خیالی نہ دیکھ کر چپ ہو جایا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔ اسی تحقیق الحقیقہ کے صفحہ ۱۳ پر مندرج ہے کہ مولوی مخصوص اللہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ "اسماعیل کو ہم لوگوں نے سمجھایا نہیں مانا اور جتنا ہندوستان میں فتنہ پھیلا ہے، اسی کی ذات سے پھیلا ہے۔" اور یہ بھی کہا کہ "حق یہ ہے کہ ہمارے خاندان میں یہ دو شخص اسماعیل و اسحاق ایسے پیدا ہوئے کہ دونوں کو امتیاز وفرق، نیتوں، حیثیتوں اور اعتقادوں اور اقراروں اور نسبتوں اور اضافتوں کا نہ رہا۔"

شاہ اسماعیل قرون اولیٰ اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی نقل کرنے کے مدعی ہیں مگر دونوں میں بعد بعید ہے، ان حضرات میں بیدار دل تھا اور ان کی نگرانی نبی پاک ﷺ کیا کرتے تھے، اور ان صاحبان میں محض دماغ تھا، جس کے زور پر نقل کرنے کا دعویٰ تھا اور سید احمد صاحب جیسی ہدایت کر سکتے تھے وہ ظاہر ہے۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

ان لوگوں کا شعور صحیح نہیں تھا، اپنے عیب کو ہنر سمجھتے تھے، سید احمد صاحب کی ہدایات مضمر ہوتی تھیں، وہ صاف بول بھی نہیں سکتے تھے، لہٰذا شاہ اسماعیل ترجمان بن

۱۔ رسالہ "تحقیق الحقیقہ" ۱۲۶۷ھ میں بمبئی سے شائع ہوا، مولانا قاضی فضل احمد لدھیانوی علیہ الرحمۃ (م ۱۹۴۷ء) نے اپنی کتاب "انوار آفتاب صداقت" مطبوعہ ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء لاہور میں صفحہ ۲۰۔۶۱۷ پر اس رسالہ کو نقل کر دیا ہے۔ (خلیل احمد رانا)

کردہ ظاہر کیا کرتے تھے جو خود ان کا مافی الضمیر اور منشاء ہوتا تھا، مثلاً جو معتقدات ''تقویۃ الایمان'' اور ''صراط مستقیم'' کے ذریعے ظاہر کیے گئے ہیں، وہ کبھی بھی سید صاحب کے نہیں تھے، جیسا کہ سید صاحب کے بعض اقوال وافعال سے ظاہر ہو جاتا ہے جو ان صاحبان نے خود نقل کیے ہیں، وہ نہ اس قدر بلیغ وعظ کہہ سکتے تھے اور نہ اس قدر سیاسی خطوط لکھ سکتے تھے اور نہ ایسے بیانات دے سکتے تھے، جو ان سے منسوب کیے گئے ہیں، ان سب میں علم معقول کی شمولیت اس کا اظہار کر رہی ہے، یہ تصور واشتہار کہ معتقدین کا کثرت سے ہجوم میسر آ گیا، صحیح نہیں مانا جا سکتا، انگریز کے ستائے ہوئے اس امیر پر جمع ہو جاتے تھے کہ ان کے وسیلہ سے گئی ہوئی عزت و ناموس واپس مل جائے گی، ان جمع ہونے والوں میں وہ جوش و یقین نہیں تھا جو قرون اولیٰ میں تھا، یہ تو غرض اور حرص کے بندے تھے، ان مردہ دلوں کو فریب دینے کے لئے سید صاحب کو امام مشہور کر دیا تھا اور امام ثابت کرنے کے لیے بے سروپا کرامتیں اور پیش گوئیاں مشہور کی جاتی تھیں، یہ ایسی باتیں تھیں جن سے روشنی و زندگی نہیں پیدا ہو سکتی تھی اور اخلاق بگڑ کر رہ گئے، ہمتیں ساقط ہو گئیں اور مضمون سمجھانے والی روح جاتی رہی اور اس مذہبی انقلاب وانحطاط کا بھگتوان آج تک بھگتا جا رہا ہے۔

شاہ اسماعیل نے اپنی ایجادات میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی معاشرتی اصلاحوں کو اختیار کیا ہے اور ان کی مذہبی جدتیں ابن تیمیہ، ابن عبد الوہاب نجدی اور مشرقی بنگال کے حاجی شریعت اللہ کی ممنون ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تبلیغی دورے

بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بیعت کے بعد چھ دن کے اندر شاہ صاحب نے دولت روحانیت سے مالا مال کر کے ولایت اولیا اور ولایت انبیاء مرحمت کر دی تھی، خزانے کی کنجیاں کمر بند میں باندھ کر وہ اس دولت کے خرچ کرنے کے اہل ہو گئے تھے اور مخلوق کو تبلیغ کرنے کا حق انہیں حاصل ہو گیا تھا، تو دیکھنا یہ ہے کہ اس دولت کا استعمال انہوں نے صحیح کیا یا نہیں، اب جو روائتیں درج کی گئی ہیں، اور معتقدین و سوانح نویسوں نے جو حالات لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے اسراف کیا اور دونوں ہاتھوں سے دولت کو خوب لٹایا، اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ ان کی جیب و آستیں خالی ہو کر رہ گئیں، بہر حال ان فضولیات کو نظر انداز کرنے کے بعد یہ ظاہر و ثابت ہے کہ نمائش آٹھ نو برس رہی، جس کے بعد امیر خان کے یہاں سے سید صاحب دہلی آ گئے۔

فخریہ اعلان کیا گیا ہے کہ سید صاحب نے جب خط بھیجا ہے تو اسی زمانہ میں شاہ صاحب نے خواب دیکھا تھا کہ انہیں حضور نبی کریم ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، تفصیل یہ ہے کہ:

"جامع مسجد دہلی میں آنحضرت ﷺ تشریف فرما ہیں، باہر کثیر مجمع مشتاق زیارت ہے، سب سے پہلے شاہ صاحب کو سعادت باریابی حاصل ہوئی، عصائے مبارک مرحمت فرما کر حکم دیا کہ دروازے پر بیٹھو اور بغیر ہماری اجازت کے کسی کو اندر نہ آنے دو۔"

فن تعبیر میں شاہ صاحب کو خود کمال تھا، مگر از راہ احتیاط یا رسماً شاہ غلام علی صاحب نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی، انہوں نے فرمایا کہ آپ کے سلسلہ کی اشاعت یا آپ سے خود ہوگی یا آپ کے کسی شاگرد رشید کے ذریعہ ہوگی، اور انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ڈیڑھ سو برس سے یعنی سید حسن رسول نما رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ہدایت بند ہوگئی تھی۔ (سوانح احمدی)

اس خواب کے ایک ہفتہ بعد اوائل ۱۸۱۸ء میں سید صاحب دہلی آئے، خواب کی تعبیر یقیناً ایک مژدہ ہے مگر واضح ہے کہ خواب میں عصا شاہ صاحب کو عطا کیا گیا ہے، کسی شاگرد وغیرہ کا برائے نام بھی ذکر نہیں ہے، لہذا حیرت ہے کہ یار لوگوں نے شاگرد رشید کا مفہوم کس طرح اضافہ کر دیا، سید صاحب کے دہلی آنے کے بعد انہیں خلافت دی گئی تھی اور اسی وقت شاہ صاحب نے اپنے شاگردوں اور رشتہ داروں کو بھی ان کا مرید کروا دیا تھا، پھر اس قدر شہرت ہوئی کہ دور دور سے لوگ مرید ہونے کے لئے آنے لگے، اس کے بعد گشت اور دورہ کرنے کا منصوبہ گانٹھا گیا، مگر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ دورے کا تخیل کس کے دماغ کی پیداوار ہے اور اس کا منشا کیا تھا، حیات طیبہ اور سوانح احمدی میں مذکور ہے:

''شاہ صاحب نے حکم دیا کہ آپ خود آس پاس کے شہروں میں وعظ فرمائیں، حالانکہ شاہ صاحب جانتے تھے کہ سید صاحب اپنی کج زبانی کی وجہ سے وعظ نہیں کہہ سکتے تھے۔''

جناب غلام رسول مہر اپنی کتاب ''سید احمد شہید'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''سید صاحب کا نصب العین جہاد تھا، دہلی میں رہ کر اس کا پروگرام سال بھر میں بنایا اور تجربہ کرنے کے لئے دورے کا منصوبہ گانٹھا، جب مختلف جگہوں سے دعوت نامے آنے لگے تو شاہ صاحب سے دورے کی اجازت لی۔۔۔۔ شاہ صاحب نے خطوط بھی لکھ دیئے کہ یہ ہمارے ہیں ان کی تواضع کرنا، یہ دورہ شاہ صاحب کے مشورے سے ہوا تھا''۔

یہ دورہ تبلیغی تھا، سید صاحب کے دماغ میں بھی جہاد کا وہم نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا، وہ اس لغت سے بھی واقف نہیں تھے، اگر یہ کہا جاتا کہ ان دوروں کا مفہوم شاہ اسماعیل کے دماغ میں جہاد تھا تو اس کو تسلیم کرنے میں کسی کو بھی تکلف نہ ہوتا، کیونکہ شاہ اسماعیل ریذیڈنٹ کے اشارہ پر سکھوں کے مظالم کو دیکھ آئے تھے اور سید صاحب کے دہلی آنے سے قبل جہاد کا تہیہ کر چکے تھے، مگر سید صاحب کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے کچھ دن کے لئے فراموش کر چکے تھے اور کفران نعمت کی بہترین مثال اس بلاغت اور شاعری کے کمال سے ظاہر ہوتی ہے جو جناب مہر نے یہ ظاہر کی ہے کہ:

''لیکن شاہ صاحب کے خطوط شناسائی کا ذریعہ تھے نہ کہ تبلیغ و اشاعت کے''۔

اب اگر اس شاعری پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس دورے میں تبلیغ و اشاعت کا سہرا مولوی عبدالحی اور شاہ اسماعیل کے سر ہے، سید صاحب غریب نہ وعظ فرما سکتے تھے اور نہ تقریر کر سکتے تھے، سید صاحب کی روحانیت کو مولوی عبدالحی اور شاہ اسماعیل جیسے عالموں کی ضرورت تھی اور ان دونوں صاحبان کی علمیت سید صاحب کی روحانیت کی محتاج تھی، پہلے ہی قدم پر اتنی روشنی پھیلی کہ شاہ صاحب کے حلقہ اثر میں دہلی سے لے کر پٹنہ اور کلکتہ کے زمین و آسمان چمک اٹھے، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ بھی تصور تھا کہ سید صاحب کی روحانیت سے شاہ اسماعیل اپنی لغویات سے باز آسکیں گے، یہ دورہ محض تبلیغی تھا، اس دورے میں سید صاحب کی سیادت و قیادت کا عام طور پر چرچا رہا، اور سید صاحب خود بھی اپنی امامت و برتری کے مدعی تھے، سوانح احمدی کے مکتوب نمبر ۵۷ سے جو وزیر الدولہ کے نام ہے ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے صاف لکھا ہے کہ دعویٰ امامت میں نے خود نہیں کیا بلکہ غائب سے ہدایت ہوئی ہے اور اس کا اظہار کرنے پر مامور ہوں، اس میں کسی قسم کے کذب کا دخل نہیں ہے، معتقدین کا دعویٰ و اعلان ہے کہ سید صاحب پیدائشی طور پر ولایت انبیاء کے حامل تھے۔ یہی نہیں بلکہ مامور من اللہ، مہدی زمان اور مسیح موعود بھی تھے۔ فدائی ابن تیمیہ کی طرح ان

اوصاف سے متصف کرتے تھے، اسی وجہ سے سید صاحب کی بیعت وخلافت کو خبط کر کے ان کے مختار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، پھر امام تو سمجھتے ہی ہیں، حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو امام ربانی اور مجدد الف ثانی کہا جاتا ہے، وہ بھی جبلی طور پر روحانیت رکھتے تھے، مگر انہیں حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت وخلافت کا نہ صرف اقرار ہے بلکہ نازاں بھی ہیں، جیسا کہ ان کے مکتوبات سے ظاہر وثابت ہے، غالباً سید صاحب کے یہ فدائی ابن تیمیہ کی تقلید میں بغیر حصول خلافت کے اور عدم وجوب تقلید کے قائل ہیں لیکن بایں ہمہ ان کی ظاہری طور پر بیعت کا عجیب انداز سے اقرار ہے، الخ کس طرح عربی گھوڑا اور اسپ تازی لاکھ اصیل وذہین ہو اور قدرت کی طرف سے خاص عطیات بھی اسے ملے ہوں، مگر وہ بھی تربیت اور کاڑھے جانے کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن تربیت پانے کے بعد بھی اس میں چوگان بازی، پولو کھیلنے اور میخ بازی کی اہمیت وقابلیت نہیں پیدا ہوتی، لہذا اس کی اسے مزید تعلیم وتربیت دی جاتی ہے، یہ خلافت کے منکر غالباً کمزور حافظہ رکھتے ہیں، ان کے بیانات سے خود ان کی خلافت کا اظہار ہو جاتا ہے، جب شاہ اسمٰعیل، سید صاحب کے مرید ہو گئے تو شاہ عبدالعزیز نے مصلحتاً ان سے سید صاحب کے کمالات کے متعلق استفسار کیا، شاہ اسماعیل کا جواب ''سوانح احمدی'' کے صفحہ ایک سو بیس اور مولانا غلام رسول مہر کی کتاب ''سید احمد شہید'' کے صفحہ ایک سو اٹھارہ پر محفوظ ہے کہ ''سید صاحب پر پروردگار عالم کی نظر کرم ہے اور یہ سب آپ ہی کی توجہ کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو علم مرحمت فرمائے ہیں، علم ظاہری سے شاہ عبدالقادر علیہ الرحمۃ فیض یاب ہوئے اور علم باطنی کے حامل سید صاحب ٹھہرے''۔

اب رہا دعویٰ مہدیت تو اس پر امتداد زمانہ نے پردہ ڈال دیا ہے، اور دعویٰ غیبوبیت بھی آج حرف غلط کی طرح غائب ہو گیا ہے، امامت کے متعلق یہ ہے کہ وہ ہمیشہ شاہ اسماعیل کے علم معقول سے زیر رہی لیکن باوجود ان بدیہی مشاہدات کے ان کے پرستاروں کی آنکھ نہیں کھلتی کہ ان کی اصلی اور واقعی عظمت کو گندگی میں مبتلا نہ کریں، اسے کہتے ہیں اندھی تقلید، تقلید کے منکر اندھی تقلید کے قائل ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ نو

ایجاد سلسلہ محمدیہ کا آج کہیں نام ونشان بھی ہے؟

۱۔ شاہ صاحب سید صاحب کے حق میں فرمایا کرتے تھے کہ خاندان مجددی ''نسبت (۱) آدمی بسوئے خدا کے نام سے جو نسبت'' ہے وہ ان کو کرامت ہوئی ہے، دہلی میں بہت سے آدمی ان سے مستفیع ہوتے تھے۔

۲۔ سید احمد بریلوی سے فرمایا کہ دنیا بکھیڑے کی جگہ ہے، اگر خالص اللہ کے لئے اس سے کچھ حصہ مل جائے تو بہتر ہے۔ (اور اسی کی سید صاحب نے پرواہ نہیں کی) مختلف تذکروں میں سوانح نویسوں نے صحیح یا غلط جو کچھ بھی لکھا ہے وہی پیش نظر ہے اور اسی پر یہاں بحث کی گئی ہے، بعض سوانح نگار شاہ محمد اسحاق کو سید صاحب کے چندہ جمع کرنے کا منصب عطا کرتے ہیں، خصوصاً جناب مہر صاحب، لہٰذا اس کو تنگ نظری یا حسد ہی کہا جاسکتا ہے۔

قصہ مختصر سوائے جناب مہر کے ہر تذکرہ نویس کو اقرار ہے کہ شاہ صاحب نے ہدایت فرمائی تھی کہ ''بطور خود آس پاس کے شہروں کا دورہ کریں''، چنانچہ ان کے ہی حکم کے مطابق دورہ کیا گیا اور ان ہی کی بتائی ہوئی تدبیر کے مطابق خالص طور پر دعوتوں اور تبلیغ کا دورہ کرنے کے لئے مختلف مقامات پر اعلان واشتہار دینے کی غرض سے اور چندہ جمع کرنے کے لئے سفیر بھیجے گئے چنانچہ منجملہ دیگر حضرات کے شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحئی اور مولوی محمد یوسف کو انہوں نے سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اس کے بعد مختلف جگہوں سے دعوت نامے آنا شروع ہوئے، پھر شاہ صاحب نے ہر جگہ تعارف کے خط لکھے کہ ''یہ ہمارے ہی آدمی ہیں'' (سوانح احمدی، وحیات طیبہ) (۲)

معلوم نہیں سید صاحب کے تذکرہ نویس کتنے چیں بہ جبیں ہوں گے، اگر سفارش وتعارف کے ساتھ وسیلہ کا بھی اضافہ کردیا جائے، کیونکہ یہ سب الفاظ مترادف

۱۔ یہ الفاظ تحریف شدہ ہیں یا سہو کاتب ہیں۔

۲۔ کسی نوعیت سے شاہ عبدالعزیز کی تحریر تقریر میں اس قسم کی روایتوں کی سند نہیں ملتی، اسی واسطے ان کا احکامات کے متعلق تذکرہ نویسوں کے درمیان اختلاف بھی ہے، بہتر ہوتا کہ شاہ عبدالعزیز کو معاف کردیا جاتا اور ان کو شامل نہ کیا جاتا۔

ہیں اور یہ بھی مسلم ہے کہ خاندان ولی اللہی کی نسبت اور شاہ عبدالعزیز کی ہر دل عزیزی اور تعلیم بھی سید صاحب کی شہرت کا سنگ بنیاد بنی ورنہ چلے بود در سیستان۔

ابھی دوآبہ کے دورے کی تیاری ہو ہی رہی تھی کہ سید صاحب کی بازیافتگی کی خبر اتنے زمانہ کے بعد ان کے بڑے بھائی کو ہوئی اور سید محمد اسحاق صاحب (۱) ان کو وطن لے جانے کے لئے بے تابانہ طور پر دہلی آ گئے، لیکن سید صاحب کی مشغولیتوں اور شان وشوکت کو دیکھ کر انہوں نے مناسب سمجھا کہ ان امور سے فارغ ہو کر سید صاحب لوٹ آئیں۔ اور الٹے قدم واپس چلے گئے۔ وطن والوں کو فخر و مسرت کے ساتھ سید صاحب کے حالات سے آگاہ کیا اور وہ سب ذوق وشوق کے ساتھ سید صاحب کی مراجعت کے لئے دعائیں مانگنے لگے، سید صاحب کا یہ دورہ تبلیغ جس میں جہاد کا کوئی ذکر نہ تھا، اپنی قسم کا عجیب وغریب دورہ تھا، شاہ عبدالعزیز کا دوآبہ میں بے حد اثر تھا، ان کے مریدوں، شاگردوں اور رشتہ داروں نے جی اور جان سے ان کا استقبال کیا، بیس تیس رفیق جلو میں ہوتے تھے اور بعد اس جماعت کی تعداد دو سو تک پہنچ گئی تھی، اتنی بڑی جماعت کے ساتھ گھر گھر جانا بذات خود رعب کرنے کے لئے کافی تھا، ہر جگہ وعظ فرمائے جاتے تھے، مذہبی اصول سمجھائے جاتے تھے اور نذرانے لئے جاتے تھے، شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحی، سید صاحب کی پالکی کے ڈنڈے تھام کر مسلسل پیدل چلا کرتے تھے، یہ گشت پھلت، مظفر نگر، لہاری، سہانپور، دیوبند، نانوتہ وغیرہ میں ہوا تھا، اس کی مدت چھ ماہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ جتنی مقبولیت یہاں حاصل ہوئی اتنی کسی اور جگہ نہیں ہوئی، عام خیال تھا کہ تاریکی چھٹ جائے گی، الجھن دور ہو جائیں گے، نحوست مٹ جائے گی، ادبار جاتا رہے گا، چاند نکل آئے گا۔

رامپور کے دورے میں ایک حکیم عطاء اللہ خان نائب وزیر رامپور نے خود سید صاحب سے ان کے "طریقہ محمدیہ" کے متعلق استفسار کیا تھا اور سید صاحب نے خود اپنی زبان مبارک سے بالتفصیل اور طول وطویل وعظ کی صورت میں تشریح

۱۔ انہوں نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے استفادہ کیا تھا۔

فرمائی تھی، جس کالب لباب یہ ہے کہ پہلے جملہ سلاسل صوفیہ میں بیعت لینے کے بعد اپنے ''طریقہ محمدیہ'' میں بیعت اس لئے لیتا ہوں کہ دوسرے طریقوں میں رسول ﷺ کا تعلق بطور باطن کے ہے اور ''طریقہ محمدیہ'' میں بطور ظاہر کے اور اس کے فضائل بتائے ہیں، گویا سید صاحب رسول سے ظاہری تعلق رکھنے کو باطنی تعلق پر ترجیح دیتے ہیں اور لازمی سمجھتے ہیں، یہ وعظ اور تشریح سن کر حکیم صاحب مطمئن ہو گئے، شائد حکیم صاحب محض قارورہ دیکھ کر جو ظاہری شے ہے، علاج کیا کرتے تھے اور نبض سے انہیں تشخیص کرنا نہیں آتی تھی کیونکہ یہ باطنی چیز ہے، اسی وجہ سے مطمئن ہو گئے ورنہ وہ یقیناً ایسی مبہم بات کو کبھی تسلیم نہیں کرتے، آخر انہوں نے سید صاحب سے کیوں نہیں دریافت کیا کہ آپ کی پوری کائنات علم لدنی پر ہے جو باطنی خوبی ہے اور ظاہری علم یعنی شریعت کے متعلق آپ کو پوری دستگاہ نہیں ہے، اس لئے اپنی خصوصیات کے مطابق آپ کو رسول سے باطنی تعلق ونسبت رکھنے کی تلقین کرنا چاہیے تھی، مگر جو وعظ ارشاد فرمایا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہم الٹے، بات الٹی، یار الٹا، ممکن ہے کہ اپنے آپ کو ملامتیہ ظاہر کرنے کے لئے ایسا وعظ فرمایا ہو، یا پھر اس کی وجہ ظاہری یہ ہو کہ سب سے زیادہ وہ انگریزوں پر عقیدہ رکھتے تھے اور انگریز اسلام کو محمڈن ازم کہا کرتے ہیں، لہذا ان کی خوشی کی خاطر انہوں نے ظاہر پرستی اختیار کی اور اپنے طریقہ کا نام بہ تقلید انگریز ''طریقہ محمدیہ'' رکھ لیا، اور اگر رامپوری حکیم صاحب کو کچھ بھی شناسائی علم شریعت وطریقت ہوتا تو وہ بآسانی تردید کر سکتے تھے کہ شریعت سیڑھی ہے اور اس کے ذریعے چھت پر چڑھا جاتا ہے اور اس چھت کا نام طریقت ہے اور یہی مقصد ہے، لیکن اگر یہ شریعت کی سیڑھی ہوا میں کھڑی ہوئی ہے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ گر پڑے گی، نماز پڑھنی ضروری ہے، اس کی بہت تاکید ہے، مگر ظاہری رکوع وسجود کا نام نماز نہیں، صاف بتایا گیا ہے کہ نماز بغیر حضور قلب کے قیامت میں منہ پر ماری جائے گی، اور حضور قلب باطنی شئے ہے، جو رکوع وسجود کے ذریعہ قلب ودماغ کو متاثر کر کے حاصل کیا جاتا

ہے۔ لہذا باطنی نسبت کو مقدم کر کے ظاہری نسبت کو مؤخر کر دینا۔ اور باطنی نسبت کو ظاہری نسبت کے مقابل میں کم درجہ سمجھنا مومن کا کام نہیں ہے۔ بغیر انجام کا خیال کئے ہوئے محض آغاز پر قناعت کر لینا صحیح نہیں۔ جدت کے رسیا ہونے کی وجہ سے کہ بدنام بھی گر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا۔ یہ اسمٰعیل ہی کہہ سکتے تھے۔ سید صاحب سے ممکن نہ تھا۔ یہ اتہام ہے سید صاحب سے ان کی منسوب کرنا بدترین ظلم وفسق ہے۔

قیام سہارنپور میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا جو مختلف نوعیت سے اہمیت رکھتا ہے۔ اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ۔۔۔ سہارنپور میں ایک مسجد بونبی والی کے نام سے مشہور تھی۔ سید صاحب اس مسجد کے پاس سے گذر رہے تھے کہ اچانک ٹھٹکے۔ دریافت فرمایا کہ اس مسجد میں کوئی بزرگ رہتے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ جی ہاں، سید صاحب مسجد میں جا کر ان سے ملے۔ اور اس کے بعد عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس کا ذکر یہاں مقصود ہے۔

کہتے ہیں کہ بونبی والی مسجد میں جو صاحب رہتے تھے ان کا نام شاہ عبدالرحیم ولایتی تھا۔۔۔۔۔ امروہہ پہنچ کر حضرت شاہ عبدالباری سے مرید ہوئے اور ان کی تعلیم و تربیت سے مستفید ہو ہی رہے تھے کہ شاہ عبدالباری کا بھی انتقال ہو گیا اور خلافت کی سند نہ مل سکی۔ سہارنپور میں آ کر بونبی والی مسجد میں قیام فرمالیا تھا کہ ایک دولت بیدار خود ان کے سرہانے آ گئی۔ یعنی سید احمد شہید ان کے پاس ملنے آئے۔ ملنے کے ساتھ خلوت ہو گئی۔ پھر باطنی قسم کے بڑے قضیے درمیان میں پیش آئے۔ آخری نتیجہ یہ تھا کہ دو پیروں سے مرید اور باضابطہ تعلیم پانے کے بعد سید شہید کے دست حق پرست پر شاہ عبدالرحیم نے بیعت فرمائی۔ اور اجازت بھی ان کو سید صاحب سے حاصل ہوئی۔

ارواح ثلاثہ میں حکیم الامت تھانوی کی روایت ہے کہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کی طرف ہو کر کیفیات و نسبت کا مبادلہ کرتے تھے۔ ص ۱۲۵، اور میر شاہ خان کا بیان مولانا نانوتوی کی زبانی یہ ہے کہ:

آخر میں شاہ عبدالرحیم پر سید صاحب کی نسبت کا غلبہ ہو گیا تھا۔ص ۱۲۶،
مشائخ دیوبند کے شیخ الشیوخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مرشد برحق میاں جی نور محمد جھنجھانوی کے پیر یہی حضرت عبدالرحیم ولایتی ہیں۔جن پر سید احمد شہید کی نسبت کا غلبہ بقول نانوتوی ہو گیا تھا۔۔۔۔ایک طرف۔۔۔سید احمد شہید کی خدمت میں میاں جی نے عرض کیا کہ میں ذکر وشغل حضرات قادریہ وچشتیہ کر چکا ہوں،(ارواح ثلاثہ)اور دوسری طرف سید احمد شہید سے آپ کو نئی چیز کیا ملی تو فرمایا سید صاحب کی برکت سے نماز پڑھنا آگئی اور روزہ رکھنا آگیا۔ص ۱۲۵۔یعنی باطن کے ساتھ ظاہر کی تکمیل ہو گئی۔

''سوانح احمدی'' میں اس واقعہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ سید احمد شہید کے خلفائے اعظم میں حاجی عبدالرحیم کا نام لکھ دیا ہے۔''سیرت سید احمد شہید'' میں حاجی عبدالرحیم اپنی خلافت سے دستبردار ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔پہلی نسبت کی کمزوریاں بتاتے ہیں اور نئی نسبت وخلافت کا اقرار کرتے ہیں۔یعنی وہ بقول خود سید صاحب کی خلافت پر نازاں ہیں۔گویا صابری نسبت کو انہوں نے ترک کر دیا۔جناب مہر صاحب نے بھی اسی حقیقت کے متعلق نہایت لطف کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔فرماتے ہیں:-

''سہارنپور میں سید صاحب مسجد بونی میں ٹھہرے تھے۔وہیں حاجی عبدالرحیم ولایتی سے ملاقات ہوئی،وہ بڑے پیر مانے جاتے تھے۔(۱)سید صاحب کو دیکھا تو خود بیعت کی۔اور مریدوں کو بھی بیعت کا حکم دیا۔فرمایا کرتے تھے۔ہمیں نماز پڑھنی آتی تھی نہ روزہ رکھنا آتا تھا۔سید صاحب کی برکت سے ہم دونوں کام سیکھ گئے۔

حقیقت کچھ ہی ہو مگر ان بیانات سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ حضرات اپنا

ا۔جب خلافت نہیں ملی تھی تو پیر کیسے ہو گئے،چونکہ پیر وہ نہیں تھے اس لئے ان کے مرید بھی نہیں تھے۔

سلسلہ مخدوم صاحب سے ملاتے ہیں، وہ غلط ہے اور ان کو ان شہادتوں کی بنا پر اپنے آپ کو سید احمدی کہنا چاہیے۔ روایتوں میں عبدالرحیم کا نام ہے مگر اس نام کے اس زمانہ میں دو شخص تھے۔ ایک عبدالرحیم کاندھلوی اور دوسرے عبدالرحیم ولایتی۔ ان روایتوں میں عبدالرحیم کی شخصیت کا متعین نہ ہونا امیر حمزہ کی داستان بن جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ سید صاحب سے مغلوب ہو جانے والے عبدالرحیم کاندھلوی ہوں۔ واللہ اعلم۔ یہ واقعہ ہے کہ عبدالرحیم ولایتی جہاد میں شریک تھے اور وہیں شہادت نصیب ہوئی۔ یہ بر بنائے فتوی شریک جہاد ہوئے تھے۔

جناب مہر صاحب کی تحقیق انیق ہے کہ دورہ ختم کر کے جب دہلی واپس آئے تو اپنے بھائی سید محمد اسحاق کے انتقال کی خبر سنی، اس لئے وطن جانے کے لئے مجبور ہو گئے، بقیہ تذکرے منظور السیان ہیں کہ بڑے بھائی کے انتقال کی خبر سہارنپور کے قصبہ منھاراں میں سنی تھی اور وہیں سے ساتھ ستر رفیقوں کو ساتھ لے کر سیدھے وطن چلے گئے تھے۔ اثنائے راہ میں مختلف مقامات گڑھ مکتیشر امروہہ اور مراد آباد میں تبلیغ کرتے ہوئے ریاست رامپور پہنچے۔ وہاں کچھ دن قیام کیا۔ یہاں ایک افغانی نے مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کی دردانگیز طریقہ سے داستان سنائی، اس ریاست پر انگریزوں کا اثر ہو چکا تھا۔ بھائی کے انتقال کا صدمہ تو تھا ہی مگر اس غیر محض افغانی کا بیان سن کر دل دہل گیا۔ پھر بانس بریلی (۱) وغیرہ میں تنظیم و تبلیغ کے جلسے کرتے ہوئے شعبان ۱۲۳۴ھ کی چاند رات کو مطابق ۲۳ جون ۱۸۱۹ء دس سال کی فراری و غیر حاضری کے بعد وطن مالوف رائے بریلی تشریف فرما ہوئے، یہاں چھبیس ماہ قیام کیا۔ یعنی ۲۳ راگست ۱۸۲۱ء تک تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ طعام و قیام کا انتظام پوری جماعت کا بفضلہ تعالی بخیر و خوبی ہوا۔ اہل وطن کے اختلافات دور کیے۔ سب میں صلح کروائی۔ اعتقاد کی درستی میں خاص سعی کی۔ شرک کے معنی سمجھائے (جن سے

۱۔ بانس بریلی سے خاموشی سے گزر گئے اور تبلیغ نہیں فرمائی، اعلی حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب اور حضرت شاہ نیاز احمد کچھ نہ کچھ تو ان کی بابت لکھتے۔

وہابیوں کے شرک کی تائید منظور نہیں تھی۔) بدعتوں کی تردید کی اور معاشرہ کی اصلاح فرمائی۔ تعزیوں کے جلوس کے متعلق قریب کے قصبہ نصیر آباد میں شیعہ سنی اختلاف کو دور کروانا چاہا۔ صلح نہ ہو سکی مگر جلوس نہیں نکلا۔ مجتہد صاحب نے لکھنؤ جا کر حکومت سے شکایت کی۔ اس پر سید صاحب کی طلبی ہوئی۔ لکھنؤ مجرم بن کر گئے تھے۔ مگر لکھنؤ سے فاتح بن کر لوٹے۔ اس مرتبہ بھی یہاں کی کورنش اور تسلیمات پر معترض نہیں ہوئے۔ مگر کچھ ایسا ہوا کہ لکھنؤ والوں کے تکلفات اور نمائشی اصولوں سے سید صاحب کی سادگی مات کھا گئی۔ جب لکھنؤ والوں کی تہذیب کو گوارا کر لیا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قبولیت عامہ نہ ہوتی، لکھنؤ سے واپس آ کر جب دیکھا کہ نکاح بیوگاں کی نصیحت کارگر نہیں ہوتی تو نمونہ اور مثال قائم کرنے کے لئے اپنے بڑے بھائی سید محمد اسحاق کی بیوہ سے خود نکاح کر لیا۔ پتا نہیں کہ زوجہ اولیٰ موجود تھیں یا نہیں۔ پھر تو یہ ہندوانہ رسم غائب ہو گئی۔ اس سلسلہ میں تذکرۃ الرشید کی روایت دلچسپ ہے۔ یعنی بعد نکاح ثانی سید صاحب کی نماز فجر قضا ہونے لگی اور جماعت چھوٹ گئی۔ آخر کار مولانا عبدالحی نے فرمایا کہ اب عبادت الٰہی ہو گئی یا شادی کی عشرت منائی جائے گی۔ سید صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ پھر نماز فجر باجماعت ہونے لگی۔(۱) "سوانح احمدی" اور "سیرت سید احمد شہید" میں یہ روایت ہے کہ سید صاحب غوطہ مار کر دو رکعت نماز پانی کے اندر پڑھ لیتے تھے۔ اسی زمانہ میں گویا ۱۸۲۰ء میں صراط مستقیم منصہ وجود میں آئی (۲)۔ کہتے ہیں کہ سید صاحب اپنا مفہوم بتا دیتے تھے اور شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی اپنے اپنے مطابق پورا مضمون لکھ دیتے تھے۔ صراط مستقیم نے تقویۃ الایمان کو منسوخ کر دیا ہے۔

اب یہاں کی بستی میں مختلف مقامات سے آ کر جمع ہونے والے معتقدین کی تعداد چار سو کے قریب پہنچ گئی تھی۔ رامپور میں افغانی کا بیان سن کر قلب کے اندر پھانس چبھ گئی تھی۔ سال دو سال میں اپنی مقبولیت دیکھ کر طے کیا کہ کار تبلیغ اتمام کو پہنچ گیا۔ اب قلوب کو جہاد کی طرف لگانا چاہیے۔ شاہ عبدالعزیز کو اس ارادہ کی

۱۔ اب معتقدین اس روایت کو الحاقی بتاتے ہیں۔
۲۔ صراط مستقیم ۱۸۲۲ء میں کلکتہ میں چھاپی گئی تھی جبکہ سید صاحب حج کو گئے ہیں، ۱۸۱۸ء والی روایت غلط ہے۔

خبر نہیں کی گئی۔ جب جہاد کا ارادہ طے ہوگیا تو کچھ دن بعد اپنے طریقہ محمدی کے اصول پر اعلان کیا گیا کہ وردو وظائف ترک کئے جائیں۔ عزلت نشینی کا حاصل کچھ نہیں۔ فنون جنگ پر طبع آزمائی کی جائے۔ روحانیت کو جنگ کی مشقوں سے زیادہ تقویت حاصل ہوتی ہے۔ کس کی مجال تھی کہ کوئی دم مار سکتا۔ مگر ہر شخص دم بخود تھا۔ مولانا مہر کی روایت کے مطابق عبدالرحیم کاندھلوی کی وساطت سے لوگوں نے اس مژدہ کے معنی سمجھے تھے۔ سید صاحب نے یہ فرما کر کہ مجاہد کا درجہ عابد سے افضل ہے سب کو مطمئن کر دیا تھا۔ اس کے برخلاف سیرت سید احمد شہید کا یہ بیان ہے کہ مولوی محمد یوسف کے استفسار پر یہی توجیہ بتا کر کہا تھا کہ اب بھی کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو وہ شاہ عبدالرحیم ولایتی سے اپنا اطمینان کر لے۔ یہ عبدالرحیم ولایتی شاہ عبدالباری امروہوی کے سلسلہ صابریہ میں خلیفہ تھے، مگر وہ سلسلہ صابریہ کو ترک کر کے حسب روایت ''سوانح قاسمی'' و ''تذکرۃ الرشید'' سید صاحب کے خلیفہ بن گئے تھے۔ جب ولایتی صاحب سے لوگوں نے سید صاحب کے اس نئے حکم کا مطلب سمجھنا چاہا تو انہوں نے سید صاحب سے اپنی بیعت کا ماجرا بتایا۔ پھر سمجھایا کہ گھاس کھودنے، لکڑی کاٹنے، مٹی ڈھونے، دیوار بنانے اور جسمانی محنت کرنے سے میری مادیت زائل ہوگئی۔ اور روحانیت بڑھ گئی۔ یہ بھی بتایا کہ اگر میں اپنی پرانی حالت میں مرجاتا تو میری نجات نہیں ہوتی، مگر مہر صاحب نے اس سے بہتر توجیہ لکھی ہے۔ گویا تنقیہ کے بعد یہ نسخہ تجویز کیا گیا تھا۔ بہر حال اس نئے حکم کے بعد بجائے تسبیح کے یہاں ہر ایک ہاتھ میں تیر و تفنگ نظر آنے لگے مصلے پر بیٹھنے کے بجائے ہر شخص کبڈی کے کھیل میں مصروف ہوگیا۔ اس طرح روحانیت میں بے حد و بے قیاس ترقی ہوئی۔ جب جسمانی مشقت سے روحانی معراج حاصل ہوگئی تو ایک نیا مکان اور دو نئی مسجدیں تعمیر کروائی گئیں۔ اب جو دورہ کیا جاتا تھا تو ایک سو ستر غازی ساتھ میں ہوتے تھے۔ چنانچہ فوجی قواعد کے ساتھ سلون، کانپور، الہ آباد، بنارس اور سلطانپور وغیرہ کا دورہ کیا گیا۔

بنارس میں آگسٹس بروک کی طوائف حیات النساء نے بیعت کی، مگر اس کی بیعت کا واقعہ سفرِ حج کا ہے۔ بہرحال بنارس میں اس نے سات ہزار روپیہ کی رقم نذر کی تھی جس کو سید صاحب نے حرام ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد اس کے مختار عام نے اس رقم کو تجارت میں لگایا، اور منافع کثیر پیدا کیا جو سید صاحب کی روانگی حج کے موقع پر نذر کیا۔ اور انہوں نے قبول فرما لیا۔ شاید حرام اس رقم کو اس لئے سمجھا تھا کہ حیات النساء مغل نہیں بلکہ کسبی تھی اور اس انگریز کے یہاں مدخولہ کی طرح رہتی تھی۔ حرام کمائی کا منافع جائز ہو جانا ایک نیا مسئلہ ہے، مگر جناب مہر صاحب کا خیال ہے کہ:-

"جہاد کے غلبہ و جوش کی داستان سوانح نگاروں کے تخیل کا کرشمہ ہے ورنہ جہاد تو پہلے ہی سے ان کی سرشت میں داخل تھا۔"

لیکن بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بقول "حیات طیبہ" شاہ اسماعیل سکھوں سے جہاد کا تہیہ سید صاحب کے دہلی آنے سے پیشتر اپنے قلب میں رکھتے تھے۔ اس لئے مہر صاحب کا خیال خود ان کے تخیل کا کرشمہ ہے اور یہ جہاد کسی کے بھی تخیل کا کرشمہ ہو۔ مگر عقل سلیم ہنستی ہے۔ بغیر سامان جہاد مٹھی بھر آدمیوں کے سہارے انگریزوں یا سکھوں سے جہاد کرنا خود مضحکہ خیز ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ بر بنائے قوت ایمانی یہ ارادہ کیا تھا تو اس کا ثبوت دیوانے کا خواب معلوم ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کا ارشاد ہے:

"عمل جہاد کو انجام دینے کے لئے اس کے اسباب و لوازم کا مہیا کرنا بھی ازبس ضروری ہے"۔ (ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۹۱)

یہ صحیح ہے کہ بچپن میں سید صاحب ہوائی نہیں بلکہ ریتے کے قلعے بناتے تھے اور توڑتے تھے اور اگر یہی بنائے جہاد ہے تو کون ایسا بچہ ہے جو ایسے کھیل نہیں کھیلا کرتا۔ اور اس کو مجاہد و غازی نہیں کہا جا سکتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۸۰۸ء میں رنجیت

سنگھ نے سکھوں کی حکومت قائم کی تھی۔ اس کے بعد مسلمانوں پر ستم ڈھائے، دہلی کے ریذیڈنٹ سے ۱۸۰۹ء یا ۱۸۱۰ء میں اشارہ پا کر شاہ اسماعیل نے پنجاب کا خفیہ دورہ کیا تھا اور اس کے بعد جہاد کا تصور جمایا تھا۔ جس زمانہ مالوہ سے سید صاحب دہلی آئے تھے، وہ جہاد تو جہاد سکھوں کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ البتہ جب رامپور میں افغانی نے سکھوں کا نام سنایا اور ان کے مظالم بتائے تو سید صاحب متاثر ہوئے اور شاہ اسماعیل کو اپنا بھولا ہوا خواب یاد آ گیا۔ پھر تو شاہ اسماعیل سید صاحب کو جہاد کی ترغیب دینے لگے۔ برابر تقاضے کرتے رہے اور مختلف پہلو دکھاتے ہوئے انہیں راہ پر لگا لائے۔ ماحصل یہ ہے کہ اصلی تخیل جہاد شاہ اسماعیل کا تھا۔ چونکہ سید صاحب کو سردار بنا لیا تھا، اس لئے جہاد کا سہرا ان کے ہی سر باندھ دیا۔ گویا شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی سید برادرز کی طرح یہاں ولی گر بن گئے۔

جہاد کی تبلیغ کے ان دوروں کے بعد حکومت اودھ کے نواب معتمد الدولہ نے کسی نامعلوم وجہ سے سید صاحب کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی۔ سید صاحب مع خدم وحشم دوبارہ لکھنؤ پہنچے۔ اس مرتبہ علمائے لکھنؤ اور شاہ اسماعیل سے حج کے ساقط ہونے پر بحث ہوئی۔ اور فریقین نے راہ کے خطروں کی وجہ سے حج کے ترک کرنے یا نہ کرنے کے متعلق فتوے لکھے اور ان فتوؤں کو منشی خیر الدین لکھنوی نے شاہ عبد العزیز کی خدمت میں فیصلہ کے لئے بھیج دیا۔ ان کا فیصلہ شاہ اسماعیل کے حق میں ہوا۔ ان مباحثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معشوق تھا اس پردۂ زنگاری میں۔ اور مسئلہ حج پر اس خاص وقت میں بحث کروانے کا کچھ منشا بھی تھا۔ اب اس مناظرے اور فتوؤں کی وجہ سے سید صاحب نے پلٹا کھایا کہ خطرات راہ کی وجہ سے حج کے ترک کرنے کا جو رجحان پیدا ہو رہا ہے اسے ختم کر دینا چاہیے۔ لہذا قصد جہاد کو منسوخ کر کے حج کرنے کا تصور جمایا۔ (۱) شاید اس زمانہ میں سکھوں اور انگریزوں میں مزید راہ و رسم پیدا ہونے کی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ ریاست رامپور میں افغانی کی داستان سن کر جہاد کا تصور بندھا تھا۔ اب ریاست اودھ میں حج کا تصور بندھا اور سمجھایا گیا کہ محض

ہندوستانی مسلمانوں سے سکھ مار کھانے والے نہیں ہیں۔ اس لئے بیت اللہ جا کر سکھوں سے جہاد کرنے کے لئے عالم اسلامی کی حمایت حاصل کر لینا چاہیے۔

اس سفر لکھنؤ میں ایک اور نعمت ہاتھ لگی یعنی مولوی اشرف علی لکھنوی کے شاگرد مولانا ولایت علی عظیم آبادی بڑے دم خم سے مباحثہ کرنے آئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رام ہو کر نہ صرف حلقہ بگوش ہوئے۔ بلکہ سید صاحب کے ساتھ بھی ہو لئے۔

سید صاحب کی شہادت کے بعد کالے پانی میں سید صاحب کے دوبارہ تشریف لانے کا انتظار کرتے ہوئے راہی ملک بقا ہو گئے۔

خدا جانے کونسی بات صحیح ہے۔ بہر حال بنارس یا لکھنؤ کے سفر سے واپسی میں سید صاحب نے معتقدین کو نہایت سادگی سے مطلع کیا، اب ہم حج کو چلیں گے۔ تبدیلی ارادہ کا باعث اللہ ہی جانتا ہے کہ فقہ تھا۔ الہام تھا یا کسی دشمن کا سکھانا تھا۔ بہر حال پردۂ زنگاری کی بات ہے۔ اس کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے متعلق قیاس کر کے کیوں گنہگار بنا جائے۔ مولوی مرتضیٰ علی صاحب کا بیان ہے کہ:

شاہ عبدالعزیز کہا کرتے تھے کہ حج سے سید صاحب جب واپس آئیں گے، تو میں سید صاحب سے بیعت کر لوں گا، لیکن جب وہ واپس آئے تو شاہ صاحب کا وصال ہو چکا تھا۔ اور یہ شرف ان کو نصیب نہیں ہوا۔ (سوانح احمدی) مگر تاریخ بتاتی ہے کہ شاہ صاحب کا وصال ان کے واپس آنے کے بعد ہوا ہے۔ غالباً حافظہ ضعیف ہو جانے کی وجہ سے مرتضیٰ صاحب کو سہو ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ا۔ کاش اس قسم کے مسائل سے خود واقف ہوتے اور فتنہ کو سمجھتے۔

حج

جہاد کی راہ میں قدم اٹھنے ہی والا تھا کہ حج کا اعلان فرما دیا گیا۔ جہاد کے التوا کے اسباب جو بتائے گئے ہیں، ان کا ملخص یہ ہے:

سوانح احمدی: (محمد جعفر تھانیسری) اعلان بنارس سے واپس آ کر کیا تھا۔ صاحب "مخزن احمدی" کے حوالے سے لکھا ہے کہ بچپن سے طبیعت میں شوق اعلائے کلمۃ اللہ وانطفاً نائرہ کفر و بدعت کا بھرا ہوا تھا۔ اس واسطے ہر گھڑی جہاد و قتال کفار کا ارادہ کرتے رہتے تھے اور سرکار انگریزی گو کافر تھی، مگر اس کی مسلمان رعایا سے آزادی اور سرکار انگریزی کی بے رو ریائی اور بوجہ موجودگی ان حالات ہماری شریعت کے شرائط سرکار انگریزی سے جہاد کرنے کے مانع تھے۔ اس واسطے (سکھوں کے مظالم کی وجہ سے) سکھوں پر جہاد کا ارادہ کیا مگر جہاد کا کام آسان نہ تھا۔ آپ نے چاہا کہ جہاد کرنے سے پہلے فرض حج ادا کر لیں، اور بعد ادائے اس فرض کے سکھوں سے جہاد شروع کر دیں۔

سیرت سید احمد شہید (مولانا ابوالحسن علی ندوی)

محبت وشوق وجذب الٰہی کا۔۔۔۔۔۔

مگر صاحب مخزن کا بیان بایں الفاظ "سوانح احمدی" میں ہے کہ چونکہ انگریزی عدل گستری کی وجہ سے ان سے جہاد کرنا جائز نہیں تھا، لہذا سکھوں سے جو بارج و مانع مذہب تھے، جہاد کرنے کی ٹھہری اور طے کیا کہ حج پہلے کیا جائے اور سب

مریدوں کو اس کی اطلاع دی گئی۔ مخزن احمدی کی معلومات یقیناً صحیح ہوسکتی ہیں، کیونکہ مصنف سید صاحب کے بڑے بھانجے تھے اور سفر وحضر میں ساتھ رہتے تھے۔۔۔
جناب مہر صاحب رقمطراز ہیں کہ شدید تقاضا تھا کہ حج کو چلئے۔۔۔ سید صاحب جن کو اللہ تعالیٰ نے مردہ سنتوں کو زندہ کرنے کے لئے پیدا کیا تھا فرض کو کس طرح نہ کرتے۔ حج عرصہ سے۔۔۔ متروک ہو گیا تھا۔۔۔ حج جہاد کا مقدمہ بھی ہے۔ سید صاحب نے حج کی تیاری کر دی۔

حیاتِ طیبہ (مرزا حیرت دہلوی)

ابھی مجاہدین اور روپیہ جمع ہونے کے لئے عرصہ دراز کی ضرورت تھی۔ اس نظریہ سے بہتر سمجھا گیا کہ حج بیت اللہ کرآنا چاہیے جب تک خلفاء چندہ اور آدمی جمع کر رکھیں گے۔

سید احمد شہید (مولانا غلام رسول مہر)

چنانچہ لکھنؤ سے مراجعت کے تھوڑی دیر بعد آپ نے رفقاء خاص۔۔۔ کو رائے بریلی سے رخصت فرما دیا کہ اپنے خانگی معاملات سے فراغت حاصل کر لیں۔۔۔ (تاکہ جہاد کے لئے چل سکیں) اس اثناء میں اچانک آپ نے ادائے حج کا ارادہ فرما لیا۔۔۔ فرمایا کہ۔۔۔ اب حج کو چلیں گے۔۔۔ حیرت کو دور کرنے کے لئے فرمایا اب مرضی الٰہی یہی ہے کہ پہلے حج کیا جائے۔ ''میرے نزدیک اس فیصلہ کی وجہ یہی کہ حج جو متروک ہو گیا ہے اس کو جاری کرنے کی تدبیر یہی تھی کہ خود حج کریں۔''

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالم بالا سے تنبیہ ہوئی تھی کہ قصد جہاد قبل از وقت ہے۔ ابھی شرائط پورے نہیں ہوئے ہیں۔ اور وہ شرائط کیا تھے؟ اس کو عالم بالا کے راز دار ہی جان سکتے ہیں اور وہ کون ہیں؟ کہ کسی کو نہیں معلوم۔ یہ واقعہ ہے کہ اس سے پہلے تنظیم وتبلیغ سے منہ پھیر کر جہاد کا فوری ارادہ کیا تھا۔ غالباً اس میں بھی بالائی

اشارہ تھا، اور اس اشارہ کی تائید و تصدیق شاہ اسماعیل نے کی تھی۔ اب لکھنؤ کے مناظرے اور شاہ عبدالعزیز کے فیصلہ کے اثر سے سقم محسوس کیا اور اس کو مرضی الٰہی سے موسوم کیا۔ ظاہر ہے کہ شاہ اسماعیل ہی کی معرفت دونوں مرتبہ مرضی الٰہی کا علم ہوا۔ بہر حال وجہ کچھ ہی ہو جب حج کے متعلق رائے قائم کر لی گئی تو اعلان بھی کر دیا گیا۔ دعوت نامے بھیجے گئے اور مشتہر کر دیا کہ کل مصارف کے ذمہ دار سید صاحب ہوں گے۔ جس کا جی چاہے چلے۔ مفت کا حج ہے۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ بغیر اسباب کے اس قسم کا اعلان حیرت زا ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اسباب نہ ہونے کی وجہ سے ارادۂ جہاد فسخ کیا گیا تھا۔ اس کو کرامت ہی کہا جا سکتا ہے اور کرامت کے متعلق کسی کو حق نہیں کہ چون و چرا کرے۔ اعلان کے ہوتے ہی ہزاروں کا چندہ اور عازمین کا اجتماع ہو گیا۔ جب زائرین کی تعداد چار سو ہو گئی تو ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۲ء میں بقول مولانا مہر صاحب:

> ''شوال کی آخری تاریخ کو یا بروایت دیگر اس بعد نماز عید یکم شوال کو یہ قافلہ رائے بریلی سے روانہ ہوا۔ اور ساڑھے چار ماہ بعد چندہ اور آدمی جمع کرتا ہوا صفر ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء میں کلکتہ پہنچ گیا۔ بندرگاہ بمبئی سفر حج کے لئے آسان مناسب تھی اور بقول مرزا حیرت یہیں سے جہاز میں سوار ہوئے تھے اور جناب مہر صاحب وغیرہ کی تحقیق ہے کہ کلکتہ سے جہاز لئے تھے۔ کثرت رائے کی وجہ سے یہی بات معتبر معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس میں کئی بھید ہیں۔ ایک تو یہ کہ کلکتہ میں مسلمانوں کو انگریزوں نے دبا کر پست کر دیا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کو مراعات دلوانا تھیں۔ پھر یہاں شاہ عبدالعزیز کے مریدوں اور شاگردوں کی کثرت تھی، اور حاجی شریعت اللہ نے بھی مسلمانوں کی بہتری کے لئے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دے دیا تھا۔ اور اپنے جھنڈے کے نیچے بہت سے غازی مشرقی بنگال میں جمع کر لئے تھے۔ لہٰذا ان سے مل کر بھی گفت و شنید کرنا تھی۔

اثنائے راہ میں جن جن مقامات میں قیام فرمایا(۱) وہاں دل کھول کر لوگوں نے استقبال کیا۔ قیاس سے زیادہ فتوحات حاصل ہوئیں اور ہر قیام میں جس جس نے مدارات کی ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کی رسائی انگریزوں کی خدمت میں تھی اور بعض جگہ خود انگریز تاجروں نے بھی خاص طور پر تواضع کی۔ کانپور میں منذرو صاحب کی میم مرید ہوئی اور سات روز دونوں وقت دعوت کی۔ اور ایک مکان مع سامان نذر کیا تو اسی کو متولیہ بنا دیا۔ کوڑہ جہاں آباد سے مجھاون پہنچے، پھر کجوہ اور فتح پور ہوتے ہوئے رائے بریلی آئے۔ اور ایک ماہ قیام کیا۔ اب دہلی سے حج کے لئے قافلہ آنا شروع ہو گے۔ غرض مجمع چار سو کا ہو گیا۔ پھر حج کے لئے روانہ ہوئے ڈلمو سے کشتیوں میں چلے، موضع گڑھ میں امام حسین کے نام کے چبوترے کھدوائے اور علموں کو تباہ کیا۔ آگے چل کر ایک انگریز کھانا لایا اور دو گھنٹے حاضر رہ کر چلا گیا۔ یہ نیل کا سوداگر تھا۔"

(سوانح احمدی)

بروایت وقائع "سید صاحب نے وعظ فرمایا" معلوم نہیں لوگ اس کا مفہوم سمجھے یا نہیں۔ اس لئے کہ سید صاحب کم گو تھے۔ اور ان کی زبان صحیح الفاظ ادا نہیں کر سکتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موضع گڑھ میں مولوی یار علی نے اس حج پر بحث کی۔ شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی نے انہیں قائل کر دیا۔ چیری کے بعد اوجھنی سے آگے بڑھے، تو ایک انگریز کی مسلمان (مدخولہ کسبی) نے دعوت دی، مگر قبول نہیں کی، مگر اس انگریز کی دعوت قبول کر لی۔ الہ آباد میں شیخ غلام علی وغیرہ سے بے حد دولت ملی اور سامان علیحدہ۔ مرزاپور میں ایک طوائف نے بیعت کی۔ شاہ اسماعیل نے اپنی بہن سے کہا کہ اسے اپنے پاس بٹھا لو۔ بادل نخواستہ بٹھا لینا پڑا۔ یہاں سے بھی دولت کثیر ملی۔

ا۔ کوڑہ جہاں آباد۔ مجھوہ۔ فتح پور۔ رائے بریلی۔ ڈالمو کانپور۔ دھمی دھمہ۔ ڈگڈگی۔ محقہ۔ کیا۔ چیری۔ الہ آباد۔ سرسا۔ مرزاپور، چنار گڑھ۔ بنارس۔ زمانیہ۔ غازی پور، باڑا۔ بلیا۔ بکسر۔ چھپرا۔ داناپور، پھلواری شریف۔ عظیم آباد۔ باڑہ۔ مونگیرہ۔ بھاگلپور۔ راج محل۔ مرشد آباد۔ ہگلی۔ پرنٹ۔ شیورام پور اور آخری مقام کلکتہ (سید احمد شہید)

بنارس میں باوجود بارش کے دعوتوں کا سلسلہ نہیں ٹوٹا۔ عید قربان میں گائیں قربان کی گئیں۔ وہاں کے مسلمانوں کے اختلاف کو دور کیا۔ تلو کا چمار کو مسلمان کر کے اس کا نام الٰہی بخش رکھا۔ تیموری شہزادے بھی سلام کو حاضر ہوئے۔ اکسٹس برکس کی بیوی (۱) (مدخولہ کسبی) نے سات ہزار روپیہ نذر کیا جس کو قبول نہیں کیا کہ یہ حرام کی کمائی ہے۔ اس کے بعد اس کے مختار عام نے بیگم (یعنی اس کسبی) کی اس رقم سے تجارت کی۔ اور اس سے کثیر منافع ہوا وہ وقت روانگی جہاز نذر کی، جس کو قبول فرمایا۔ اس لئے کہ اس میں حرام کا شائبہ نہیں رہا تھا۔ زمانیہ پہنچ کر سب نے کبڈی کھیلی۔ غازی پور میں ایک پیر زادے نے دعوت کی مگر بیعت نہیں کی، چھپرے میں چند طوائفوں نے نذرانہ دیئے، مگر قبول نہیں کیے۔ دانا پور میں شیخ علی جان نے کہا کہ کئی صوفیوں سے میں نے بیعت کی ہے مگر حالت نہیں بدلی، مگر سید صاحب کی بیعت سے تسکین ہوئی۔ پھر تعزیہ خانہ کو مسجد بنایا اور امام باڑہ کو مسافر خانہ میں منتقل کیا۔ جہاد کی رقمیں ان کے پاس جمع تھیں۔ دانا پو میں کسبیاں تائب ہوئیں اور لوگوں سے ان کا نکاح پڑھوا دیا۔ (سوانح احمدی)

میرے استفسار پر ۱۸۶۸ء میں پھلواری شریف کے سجادہ نشین حضرت غلام حسنین رحمۃ اللہ علیہ نے جو بتایا تھا، اس کا خلاصہ یہ ہے:

"سید صاحب یہاں آئے تو شاہ نعمت اللہ قادری کے حجرے میں کئی گھنٹہ قیام فرمایا، ان سے تصوف اور محبت و مودت کی باتیں رہیں، لیکن شاہ اسماعیل نے حضرت شاہ ابو الحسن فرد سے مراسم محرم کے بارے میں مناظرانہ گفتگو کی، سید صاحب اس گفتگو میں شریک نہیں تھے۔ حضرت قبلہ والدی مرشدی مولانا شاہ سلیمان سے میں نے سنا ہے کہ ان کا جہاد سکھوں کے خلاف تھا، انگریز چونکہ سکھوں کے خلاف تھے لہذا انہوں نے ان سے بھڑنے کے لئے راستے ملا لئے، سید صاحب کی حیثیت روحانی پیشوا کی سی تھی اور جنگ کی کمان شاہ اسماعیل کے ہاتھ میں تھی۔

۱۔ سوانح احمدی نے اس کو خاندان تیموریہ کی مالدار حیات النساء بیگم لکھا ہے۔

حضرت قبلہ کو بزرگوں کی نیک نیتی پر شبہ نہیں تھا، ان کی قربانیوں کا ذکر تاثر کے ساتھ فرمایا کرتے تھے، شاہ اسماعیل کو غایت درجہ سید صاحب سے اعتقاد تھا، وہ ان کو معصوم سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب "منصب امامت" میں ایسے ہی الفاظ لکھے ہیں، دیکھنے والوں کی یہاں یہ رائے تھی کہ سید صاحب نیک آدمی ہیں، مگر اب حیرت انگیز امر یہ ہے کہ سید صاحب کی وفات کے بعد متبعین نے جن میں نہ فقط عوام تھے، بلکہ ذمہ دار علماء بھی تھے، سید صاحب کو امام غائب کا درجہ دے دیا ہے اور یقین رکھتے ہیں کہ عنقریب ظاہر ہو کر پھر جہاد کریں گے، میرے بچپن میں اس شعر کے پڑھنے والے موجود تھے کہ:

کون سی رات آن ملے گا

دن بہت انتظار میں گزرے"

عظیم آباد میں مولوی ولایت علی کے والد وغیرہ سے ملے اور انہوں نے بیعت کی۔ مرشد آباد میں بوجہ رفض کوئی ملاقات کو نہیں آیا۔ (سوانح احمدی) شیعوں نے انگریزوں سے شکایت کی کہ سید صاحب انگریزوں کے خلاف جہاد کا ارادہ رکھتے ہیں، مگر حاکم نے فرقہ وارانہ رقابت سمجھ کر اعتناء نہیں کی۔

ابتداء میں جب قصبہ پھلاون کی مسجد میں ہاتف غیب نے بشارت دی کہ سب ہمراہیوں کو بخش دیا، پھر غیبی ہاتھ نے مسجد کو اٹھا کر جنت ماویٰ میں داخل کر دیا، بمقام ڈلمو قادر برحق کے وعدے کا اعلان فرمایا کہ ہمارے ساتھی اب اللہ کے مہمان ہیں۔ اور میرے ہاتھ سے لاکھوں کو ہدایت نصیب ہوگی۔ دعائے فتح حرمین بھی مستجاب ہوئی۔ غرض رد بدعات، منع شرک، ترغیب احکام شرعی کے متعلق شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی تلقین فرماتے ہوئے اور سید صاحب مژدے سنا سنا کر اپنی کرامتوں سے قلوب پر تصدیق کی مہر لگاتے ہوئے مع قافلہ کلکتہ پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر مولانا عبدالحی سے فرمایا:

''اگر چہ ہم حج کی نیت سے آئے ہیں لیکن خدا کے فضل سے امید ہے کہ اس شہر میں باب ہدایت اس طرح مفتوح ہوگا کہ دیکھنے والے حیران ہو جائیں گے۔کلکتہ میں قیام تین ماہ امین الدین احمد وکیل سرکار کے یہاں رہا۔ یہ وکیل صاحب بڑے مالدار تھے اور عیش سے زندگی بسر کرتے تھے۔ شراب کے عادی تھے اور ایک طوائف سے آشنائی تھی۔ سید صاحب نے ان کے یہاں ممنوعات شرعی دیکھ کر سب سامان پھینکوا دیا، ایک روز وحید الدین کی موجودگی میں امین الدین کی رنڈی آ گئی۔ اتفاق سے اسی وقت سید صاحب بھی پہنچ گئے۔ رنڈی کو چھپا دیا گیا۔ اس موقع پر وحید الدین نے کہا کہ مریض مرض اور طبیب حاذق حاضر ہیں، تو سید صاحب نے احسن الخالقین پر وعظ فرمایا۔ وہ رنڈی جو کوٹھری میں بند سن رہی تھی، نیم بسمل کی طرح تڑپنے لگی، دروازہ کھول کر حاضر خدمت ہوئی اور توبہ کر کے مرید ہوگئی۔ اس کے بعد امین الدین نے بیعت کی تو سید صاحب نے دونوں کا نکاح کروا دیا۔ مگر صاحب ''مخزن احمدی'' نے ذرا فرق سے اس قصہ کو لکھا ہے۔ یعنی جب نوکر نے جام شراب منشی امین الدین کو دیا تو دیکھا کہ سید صاحب دانتوں میں انگلی دبائے موجود ہیں۔ کئی مرتبہ تصور کا یہی واقعہ پیش آیا۔ اسی طرح شراب سے توبہ کی۔ (سوانح احمدی) بے نکاح بیبیوں کے بھی نکاح کروائے۔ غیر مختونوں کے ختنے کروائے۔ شراب بند کروا دی تو شراب کی سب دکانیں بند ہو گئیں۔ ٹیپو کے شہزادوں نے عربی میں گفتگو کی اور سید صاحب نے جواب دے کر قائل کیا۔ کلکتہ کے متعلق جو پیشین گوئی کی تھی وہ ٹھیک نکلی۔ شب و روز نیاز مندوں کا میلہ لگا رہتا تھا، دوران قیام میں کلکتہ رشک ارم بن گیا تھا۔ بعض حاسدوں نے انگریزوں سے شکایت کی کہ انگریز کے خلاف جہاد کرنا چاہتے ہیں۔ مگر شنوائی نہیں ہوئی۔ انگریزوں نے حاجی جیون کی معرفت اپنے یہاں وعظ فرمانے کی دعوت دی اور شاہ اسماعیل نے جا کر دس ہزار انگریز مرد اور عورتوں (۱) کے مجمع میں وعظ فرمایا، اثر اس قدر رہا کہ سب کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اگر چہ مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ جب نذرانہ پیش کیا تو واپس کر دیا کہ ہم اجرت وعظ نہیں لیا کرتے۔ مولانا مہر نے

---

(۱) تاریخ اس تعداد کو گوارا نہیں کر سکتی اور خصوصاً اس لئے کہ ابھی تک انگریز عورتیں ہندوستان میں نہ ہونے کے برابر تھیں، اور انگریز پیشہ ور عورتوں کو ملازم رکھتے تھے۔

انگریزوں کے یہاں اس وعظ کا ذکر نہیں کیا ہے، پھر کلکتہ میں "سوانح احمدی" کے مطابق کسی نے شاہ اسماعیل سے سوال کیا تھا کہ انگریزوں سے جہاد کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو شاہ اسماعیل نے واضح کر دیا کہ ایسی بے رو ریا اور غیر متعصب سرکار سے کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں (۲)۔ مولانا مہر اس روایت اور "سوانح احمدی" کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ اس روایت کو اس لئے مسترد کر دیا کہ مہر صاحب کو تاریخی واقعات اور انگریزوں کے سلوک کا علم ہے اور وہ انگریزی سرکار کو بے رو ریا غیر متعصب سمجھنے کو غلط سمجھتے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ شاہ اسماعیل نے خفیہ سفر پنجاب کے بعد ہی رائے قائم کی تھی کہ انگریز رحم دل ہیں اور سکھ ظالم و جابر ہیں۔ مختصر یہ کہ جب بروایت "سوانح احمدی" عازمین حج کی تعداد رائے بریلی میں جو چار سو تھی اور سیرت "سید احمد شہید" الہ آباد میں سات سو ہوگئی، پھر مہر صاحب کی "سید احمد شہید" کے مطابق کلکتہ میں سات سو ترپین تک پہنچ گئی تو اس قافلہ کے لئے دس گیارہ جہاز کا انتظام کیا گیا۔ مگر ان جہازوں میں غیر مسافر بھی تھے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کلکتہ جو رشک ارم بن گیا تھا محض ترپین کا اضافہ کر سکا، اسی سے کلکتہ میں باب ہدایت کے مفتوح ہونے کے متعلق رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ الوداعی جلوس کا نظارہ مسلم و غیر مسلم اپنی اپنی چھتوں سے دیکھ رہے تھے اور (خوش قسمتی سے) لاٹ صاحب (۲) نے بھی اپنی کوٹھی سے یہ تماشا دیکھا تھا (سیرت سید احمد شہید) مگر وہ نظارہ قابل دید تھا جب لنگر اٹھتے وقت ایک انگریز نے وحشت میں رواں دواں آکر سید صاحب کی خدمت میں نذر عقیدت کے طور پر کھانا پیش کیا اور سید صاحب نے فخر و مسرت کے ساتھ قبول فرمالیا۔ سید صاحب کے سامان پر جو جہاز پر لادا گیا تھا ایک سو ستائیس کا نمبر لکھ دیا گیا تھا تا کہ امتیاز کیا جاسکے، از روئے ابجد سید صاحب کے نام کے اتنے ہی عدد ہوتے ہیں (۳)۔ سید صاحب کا جہاز سب سے آخر میں روانہ ہوا تھا۔ الوداعی ہدایتوں میں سید صاحب نے

۱۔ لیلی را بہ چشم مجنوں باید دید ۲۔ اس زمانہ میں لاٹ صاحب ڈسمنگو تھا۔
۳۔ یہ یا تو الہامی حکم تھا یا شاہ اسماعیل کی جدت تھی یا انگریزوں کی تقلید۔

خصوصیت کے ساتھ یہ ہدایت فرمائی تھی کہ جو شخص کہے کہ سید احمد کی توجہ میں تاثیر ہے اسے مفتری سمجھنا۔ یہ بات محض منجانب اللہ ہے۔ اس کے بعد سیلون۔ الپی۔ کالیکٹ، لنکا دیپ، امنی، عقیدی، سقوطرہ، عدن، بخا، حدیدہ، جدہ اور حدیبیہ کی راہ سے ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء کو بتاریخ ۲۸ شعبان (۲۱ مئی) مکہ معظمہ میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہوا، گویا یہ سفر ۱۰ ماہ میں طے کیا۔ اس بحری سفر کے عجائب و غرائب بے شمار ہیں۔ بوجہ جہازی بیماری مولانا عبدالحی سے مسئلہ دریافت کر کے جمع بین الصلاتین کا حکم دے دیا۔ کوئی پشت پر آتا تو سید صاحب سلام کرتے اور سلام میں کسی کو سبقت نہیں کرنے دیتے تھے۔ لنکا کے قریب شیاطین نے حملہ کیا مگر شکست دے دی (سوانح احمدی) کچھ حالات سید صاحب نے شاہ عبدالعزیز کو تحریر فرمائے تھے اور اس خط کو شاہ اسماعیل نے طبع کروا کر سب میں تقسیم کیا تھا۔ (سوانح احمدی) کے مکتوب نمبر اص: ۱۶۹ کا خلاصہ یہ ہے:۔

آخری ماہ شعبان ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء ہم بخیریت مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ بعد ازاں حج، زیارت مدینہ کا عزم ہے۔۔۔ (مختلف مشغولیتوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے)

رائے بریلی کے نئے مکان کی روحانیت نے مجسم ہو کر وقت وداع گریہ وزاری کی۔ میں نے بہ حکم خدا اسے جنت میں ساتھ لے جانے کا وعدہ کر کے تسلی دی۔ ڈلمو سے جب ہم کشتیوں میں سوار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا کہ فلاں کشتی میں تم نہ بیٹھنا۔ اسے ہم غرق کر دیں گے، مگر میں اپنی خطا کو محسوس کر کے اسی میں سوار ہوا۔ غیب سے ارشاد ہوا کہ تیری وجہ سے ہم نے حکم واپس لے لیا، اور کشتی کو غرق نہیں کیا۔ جب ہم کلکتہ سے چل کر دریائے شور میں پہنچے تو سمندر کی روحانیت نے مجسم ہو کر مجھے ڈرانا چاہا، میں نے کہا میں اور تو دونوں اللہ کے بندے ہیں۔ تو اللہ سے ڈر، میں تجھ سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ پھر وہ منفعل ہو کر قائل ہو گئی۔ جب جہاز قاب و قمری میں پہنچا جو بے حد خطرناک مقام ہے تو تجلی نمودار ہوئی اور فرمایا تجھے غرق کر دیا جائے گا۔ میں نے سر نیاز جھکا دیا۔ ارشاد ہوا: اب غرق نہیں کریں گے (۱)۔ عدن میں نماز جمعہ

ا۔ اس خوشی میں سید صاحب نے جہاز پر محفل میلاد منعقد کی تھی۔ (سوانح احمدی: ص ۸۱۰)

کی جامع مسجد میں پڑھنا چاہتا تھا مگر اہل قافلہ کی وجہ سے متردد تھا کہ ان کو ساتھ لے جانا مشکل ہے۔ بشارت ہوئی کہ تم نماز پڑھنے جاؤ، جہاز پر قافلہ کی نگرانی ہمارے ذمہ ہے۔۔۔میری دعا کی اجابت کی بشارت ہوئی کہ تیرے ہاتھ سے نشر و اشاعت ملک عرب میں ہوگی اور اس کے آثار اقالیم روم تک پہنچیں گے۔۔۔مخا میں اسی طرح ایک ماہ کے قیام میں ہزاروں نے بیعت کی۔ اللہ جل شانہ نے فرمایا کہ اس سال جتنے حج کریں گے تیری وجہ سے سب کو بخش دوں گا۔ محاذ یلملم پر احرام کے لئے میں نے غسل کیا، جن لوگوں نے مجھے غسل کروایا ان سب کی بخشش کی اطلاع دی گئی۔ پھر خبر دی گئی کہ جو تلبیہ میں تجھ سے سبقت کرے گا اس کا تلبیہ میں نہیں سنوں گا، بذی طوی سے گزر کر عجیب حالت طاری ہوئی اور حاضرین نے دیکھا کہ میری لبیک کو شرف اجابت بخشا گیا اور ارشاد ہوا کہ جتنے گنہگار و شرمندہ دور سے ہمارے حرم میں آئے ہیں ان کو میں لایا ہوں اور مدعا ایسا ایسا ہے تو وہ خود مستحق رحمت و عنایت ہیں اور کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ہند سے اقصائے بخارا تک سب کو بخش دیا۔ مجھے خطرہ و خیال ہوا کہ یہ عنایات محض احیاء کے لئے ہیں یا اموات بھی اس میں داخل ہیں۔ جواب ملا کہ سب کے لئے ہیں۔ چنانچہ سب کو رنج و تکلیف سے نجات مل گئی اور وہ سب خوش ہو گئے۔۔۔

(آخر میں تحریر ہے کہ)۔۔۔ دریں سفر سعادت اثر بسیار بشارات و عنایات رفیعہ از درگاہ رحمان جل شانہ، ایں فقیر یافتہ است۔ اور یہ سب آپ کی توجہ کا صدق ہے۔ آئندہ بھی دعا فرمائیں۔ (اور اس خط کو اس جملہ پر ختم کیا ہے کہ) زیادہ بجز آداب چہ عرض نماید۔ والسلام والاکرام۔"

اس خط کو سن کر شاہ صاحب کے دوست مولوی محمد نعیم صاحب نے اعتراض کیا تھا، چنانچہ شاہ صاحب نے بذریعہ خط اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ (ملاحظہ ہو ضمیمہ سوانح احمدی خط نمبر ۲)۔

"از جانب خدا برائے تربیت طفلان طریقت کہ تابع شخصے شوند۔ آنہا را بسوی فطرت رضا کنند، اتفاق شود مانند آن کہ طفلے در مکتب می برند و استاد

او۔۔۔اورا مواعید عمدہ می دہند کہ برائے تو خلعتے ساختہ ام۔۔۔۔وعلی ہذہ القیاس۔۔از روئے حدیث چہل ابدال کا وجود ثابت ہے۔۔۔چہ تعجب است کہ میر سید احمد را بعضے مراتب حاصل شدہ باشد۔لہذا انتظار باید کشید کہ حق تعالیٰ آثار ایں مواعید را بر منصۂ ظہور جلوہ گر سازد۔پس ایں ہمہ صادق ان۔زیادہ بجز ترقیاتدارین چہ نویسد۔"

معلوم نہیں یہ خط شاہ صاحب کا ہے بھی یا نہیں۔اس کو تخن سنج ہی سمجھ سکتے ہیں [illegible] علاوہ سید صاحب کو آداب سے نفرت تھی، چنانچہ خاندان ولی اللہی کو آداب کہنے کی وجہ سے [illegible] بھی فرمائی تھی، مگر اس خط میں خود اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ہونہ ہو یہ یقیناً شاہ اسماعیل [illegible] کرامت ہے۔میرزا حیرت نے لکھا ہے کہ:۔

"ہمارے فاضل عبد [illegible] بریلوی نے سید صاحب کے خاندان کا ذکر کیا ہے اور بڑی بڑی کرامتیں سید صاحب کے آباؤ اجداد کی نہایت رنگ آمیزی سے بیان کی ہیں، مگر یہ تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ باوجودیکہ مصنف کتاب کرامات مافوق الفطرت کا قائل ہے۔پھر بھی اس نے سید احمد صاحب کی ان کرامتوں کا جن سے ہمارے معاصر سوانح نویسوں کے صفحے سیاہ ہو رہے ہیں کہیں بھی تذکرہ نہیں کیا ہے، بلکہ بجائے اس کے پارسا پرہیزگار، صائم الدہر، سچا، نیک بخت، شیریں کلام، خلیق، خود فروشی و خود نمائی سے کوسوں دور، جیسی صفتوں سے بریلوی نے سید صاحب کو یاد کیا ہے"۔

لیکن بالفرض ان کرامتوں کو مان بھی لیا جائے تو شاہ عبد العزیز کا مندرجہ بالا خط ان کرامتوں کی حقیقت بیان کر رہا ہے کہ یہ سب بچوں کا کھیل ہیں۔اس کے علاوہ کمال نیٔ ہے کہ سوانح نویس جن مافوق الفطرت کرامتوں کے ذریعہ اشتہار دیتے ہیں، کہ ہمچو او دیگرے نیست۔خود اپنے قلب میں عقیدہ نہیں رکھتے اور دوسروں کو منوا کر خوب مضحکہ اڑاتے ہیں۔چنانچہ جب ان کرامتوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو قلعی کھل جاتی

ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کے والد ماجد نے لطافت کے ساتھ ان کی کرامات کا ذکر کیا ہے، یعنی جب کوئی سید صاحب کی زیارت کے لئے آتا تو دروازہ پر شاہ اسماعیل سمجھا دیا کرتے تھے کہ سید صاحب پہلی نظر میں اللہ کے جلووں سے مشرف کر دیا کرتے ہیں، لیکن آنے والا اگر ولد الزنا ہو تو اس کو یہ سعادت نہیں ملتی، لہذا ولد الزنا ہونے سے بچنے کے لئے ہر شخص یہی کہہ دیتا کہ سید صاحب نے واصل بحق کر دیا، پھر وہ ہزاروں کرامتوں کا بھی اقرار کیا کرتا تھا، حالانکہ اسے نظر کچھ بھی نہ آتا تھا، بہر حال ۲۸ر شعبان ۱۲۳۷ھ کو حرم محترم میں داخلہ ہوا اور یکم ذیقعدہ ۱۲۳۹ھ کو حجاز سے واپس آئے۔ مکہ معظمہ میں ابتدائی قیام کی مدت چار ماہ ہے۔ اس عرصہ میں فتوحات، عنایات اور نشر و اشاعت کا ذکر آب و تاب سے لکھا گیا ہے۔ مدینہ منورہ میں پچیس دن یا ایک ماہ گزارا۔ پھر وہاں سے واپس آ کر مکہ مکرمہ دو یا ڈھائی ماہ سے زیادہ قیام فرمایا۔ مگر اس قیام کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے، سفر حج کے جو حالات لکھے گئے ہیں ان کا مطالعہ و مقابلہ بصیرت افروز ہوگا، لہذا املاحظہ ہو۔

سوانح احمدی۔ جہاز سے اتر کر جدہ میں پانچ روز قیام کیا، بعد نماز عشا اونٹوں پر مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ حدیبیہ میں یاروں کے ساتھ دعا میں مشغول رہے۔۔ داخل حرم ہونے پر مسجد کو دیکھ کر قافلے والوں پر اس قدر رقت وزاری طاری ہوئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں، یہاں تک کہ معلم و مطوف اور حاضرین سب کے سب رونے لگے اور کہنے لگے کہ ہم نے اپنی ساری عمر میں ایسا بابرکت قافلہ کسی ملک سے آتا نہیں دیکھا۔

ملک عرب کے بہت سے لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ بلگار کے قافلہ کا ایک بہت بڑا عالم جو فارسی جانتا تھا، بیعت سے مشرف ہوا۔ اس کو ملک بلغار کی ہدایت کے لئے خلیفہ مقرر کیا اور ایک نقل صراط مستقیم کی عنایت فرمائی۔ مکہ کے تین بزرگ صاحب کمال اولیاء میں سے تھے انہوں نے کشف باطن سے معلوم کر کے

اطاعت وفرمانبرداری کی۔ یہ تینوں سید صاحب کے ساتھ طواف کیا کرتے تھے۔ جب ان پر اعتراض کیا گیا تو جواب دیا کہ اس بزرگ کا ہر طواف مقبول بارگاہ ایزدی ہے، اور ان کے ساتھ طواف میں رہنے والوں کا بھی طواف مقبول ہے۔

جبل رحمت پر دعا مانگی کہ ہمارے قافلہ والوں میں سے کسی کو بھی ساتھ لقب "حاجی" کے ملقب نہ کرنا۔ سب تذکرہ نویس متفق ہیں کہ بوجہ قبولیت دعا کے آج تک کوئی آدمی اس قافلہ کا حاجی کے لقب سے ملقب نہیں ہوا۔ اس واسطے قوی امید ہے کہ باقی دعائیں بھی قبول ہوئی ہوں گی۔۔۔۔ اب تیاری سفر مدینہ کی ہونے لگی، اثنائے راہ میں عرب کے ڈیرے گھاٹ میں تھے مگر کچھ ایسا ہوا کہ ان کے سردار نے حاضر خدمت ہوکر سر تسلیم خم کر دیا۔ آدھی رات کو وادی فاطمہ میں حضرت ام المومنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مرقد مبارک پر واسطے زیارت کے تشریف لے گئے۔ صاحب "مخزن احمدی" کا کہنا ہے کہ خلاف فصل ہمیں وہاں تازہ انگور کے خوشے ملے۔ وادی صغریٰ میں شیخ عبدالرحیم اور حضرت ابوعبیدہ بن الحارث جو غزوہ بدر میں زخمی ہوئے تھے ان کے مزارات کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ جب مدینہ تین کوس رہ گیا تو سید صاحب کو بخار آگیا، یہاں بھی لوٹیرے حملہ کرنا چاہتے تھے مگر بخیر گزشت۔ حضرت خاتون جنت اور حسنین رضوان اللہ عنہم اجمعین نے خواب میں بشارتیں دیں۔ باوجود بیماری کے متبرک مکانات کی زیارتیں کیں۔ اہل مدینہ نے بیعت کی، دو دو گھڑی تک سید صاحب مرقد مبارک رسول اللہ ﷺ کے سامنے مراقب رہتے تھے۔

۲۶ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ کو خواب میں رسول کریم ﷺ نے اجازت دی کہ مکہ کو واپس جاؤ، کیونکہ شدت سرما سے قافلہ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ لہذ ۲۹ ربیع الاول کو وہاں سے روانہ ہوئے۔ مکہ شریف آکر ۱۵ شوال کو ساڑھے چھ ماہ بعد وطن مالوفہ کو مراجعت کا الہام ہوا۔ پھر بادل محزون یکم ذیقعدہ کو جانب وطن روانہ ہوئے۔۔۔۔ جدہ میں چھ روز قیام کیا۔ اس سفر میں شاہ جنات اور اس کی ذریات کو بھی بیعت کا شرف عطا

کیا۔ اور غائبانہ طور پر وہ حفاظت کے لئے ساتھ رہنے لگے۔ اس کی مفصل تفصیل وزیر الدولہ نے اپنی کتاب میں لکھی ہے۔ محاذ میں پندرہ روز قیام رہا۔ پھر یہاں سے چودھویں روز بمبئی پہنچ گئے۔ بمبئی میں تھوڑا قیام کیا، یہاں سے ایک مہینہ کے بحری سفر کے بعد کلکتہ تشریف لائے اور دو ماہ سے زیادہ قیام رہا۔

حیات طیبہ: بمبئی سے حج کے لئے روانہ ہوئے۔ جدہ پہنچتے پہنچتے دو تین جانیں تلف ہوگئیں۔ حاملہ عورتوں کے بچے پیدا ہوئے۔ ایک کا حمل گر بھی گیا تھا۔ جدہ والوں کو سید صاحب کے آنے کا علم نہ ہوا، اس لئے آرام کرنے کا موقع مل گیا، ورنہ وہ لوگ حاضر خدمت ہو کر بہت پریشان کرتے۔ مکہ شریف میں پہلے سے خبر ہوگئی تھی کہ وہابیوں کا قافلہ آرہا ہے۔ وہابیوں کی پابندی شرع کی وجہ سے مکہ و مدینہ والے خائف تھے۔ سید صاحب وغیرہ کو شریف مکہ نے طلب کیا، انہوں نے اپنے عقائد کے متعلق صفائی پیش کردی، تو نجات مل گئی۔ پھر شریف مکہ نے اپنے یہاں مہمان رکھا۔ اس کے بعد ہر بلا سے محفوظ ہوگئے۔ اور مادر وطن کو بخیریت واپس آئے۔ حج بیت اللہ کے وقت نجدیوں سے ملاقات ہوئی تھی، اسی وجہ سے ڈاکٹر ہنٹر نے لکھا ہے کہ:۔

”سید صاحب نے نجدیوں سے تعلیم حاصل کی تھی اور ان سے عقائد لئے تھے مگر یہ غلط ہے۔ ان کو تعلیم دینے کے لئے ان کے ہمراہ خود شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحی اور دیگر علماء موجود تھے۔ سید صاحب کا اثر بمبئی میں اتنا نہیں تھا جتنا کلکتہ میں تھا۔ ہندوستان آکر جہاد کی تحریک شروع کی۔ ۲۹ر شعبان ۱۳۳۰ھ کو وطن میں داخل ہوئے۔“

سیرت سید احمد شہید

اس ارض مقدس میں آپ کا فیض بند نہیں ہوا۔ حجاز کے بعض نامور اہل علم وکمال و فضل و صلاح بیعت میں داخل ہوئے۔ سید صاحب کے حکم سے مولانا اسماعیل اور مولانا عبدالحی نے برابر وعظ فرمائے۔ یہاں تمام ممالک اسلامیہ کے وفود آتے ہیں۔ اس لئے باہر کے لوگوں کو بھی فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ بلغار کے قافلہ نے

بیعت کی۔ مغربی قافلہ بھی بیعت سے مشرف ہوا۔ مولانا عبدالحی نے صراط مستقیم کا ترجمہ عربی میں کر کے اس کی نقلیں تقسیم کیں، بخیر وخوبی مراسم حج ادا ہوئے۔ جبل رحمت پر دعا مانگی۔ کہ ہمارے قافلے کا کوئی آدمی بھی حاجی کے لقب سے ملقب نہ ہو۔ جاوا کے تین آدمیوں نے بیعت کی، مکہ مکرمہ سے آپ مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور کافی قیام کیا۔ ۹ ربیع الاول ۱۲۳۸ کو مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر مکہ معظمہ آئے۔ اور وہاں رمضان وعید کے مہینے گزارے اور یکم ذیقعدہ ۱۲۳۸ھ کو مکہ مکرمہ کو الوداع کہا۔ ۲۹ رشعبان ۱۲۳۹ھ کو دو سال گیارہ مہینے کے بعد وطن آ گئے۔

سید احمد شہید

ایک مہینہ قیام کر کے مخا سے چلے تو حدیدہ ٹھہرے۔ یلملم کے محاذ میں پورے قافلہ نے غسل کر کے عمرے کا احرام باندھا۔ صدائے لبیک سے پورا جہاز گونج اٹھا۔۔۔ جدہ میں اماحوا کے مزار کی زیارت کی۔ جو ہمراہی پہلے پہنچ چکے تھے ان میں سے اکثر مکہ معظمہ جا چکے تھے۔ کچھ لوگ سید صاحب کے انتظار میں ٹھہرے رہے۔۔ مولانا اسماعیل کو یہاں محاصل کے تصفیہ کے لئے چھوڑ دیا اور خود روانہ ہو گئے۔۔ کلکتہ میں مختلف جماعتوں کے امیروں کو کچھ رقمیں متفرق مصارف کے لئے دے دی گئی تھیں۔ جدہ میں ان رقموں کا حساب لیا گیا۔ معلوم ہوا کہ دو ہزار ایک سو روپیہ زائد خرچ ہوئے۔۔۔ سید صاحب نے یہ رقم ادا کر دی۔ جدہ کے بعد ایک مقام حدیدہ میں قیام کیا۔ پھر حدیبیہ ٹھہرے۔۔ تیسرے روز چاشت کے وقت مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔۔۔ قافلہ کے لوگ خدا کے فضل سے عموماً ہر آفت سے محفوظ رہے۔ مکہ معظمہ میں دیر تک حضرت خدیجہ کے مزار پر مصروف دعا رہے۔ عبیداللہ کی بیوی سے اپنی نوزائیدہ بچی کو دودھ پلوایا، بعد کو سید صاحب کی عبادت میں پریشانی ہوئی تو اس سے معافی مانگی۔ شاہ اسماعیل کی والدہ ایسی بیمار ہوئیں کہ زندگی کی امید نہیں رہی۔ شاہ صاحب کی آرزو تھی کہ والدہ صاحبہ سید صاحب سے بیعت کر لیں، لیکن وہ فرماتیں کہ یہ تو خود ہمارے خاندان کے مرید ہیں۔ میں بیعت نہیں کر سکتی۔ شاہ صاحب ان کے

مرید ہونے کے لئے دعائیں کرتے رہتے تھے۔ ایک رات مرحومہ نے خواب دیکھا
تو اس کے مطابق سید صاحب سے بیعت کر لی۔ اسی بیماری میں بعد بیعت دوسرے
دن فوت ہو گئیں اور جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔۔۔۔ادائیگی حج کے موقع پر جبل
رحمت پر دعا مانگی کہ قافلے والے حاجی کے لقب سے ملقب نہ ہوں، اس لئے کہ حج
اسلامی فرض ہے، اسے بجا لانے پر امتیازی لقب کیوں اختیار کیا جائے۔۔۔۔
سینکڑوں علماء وصلحاء واشراف سے ملاقاتیں ہوئیں، ان میں سے ایک مغرب اقصیٰ
کے تھے۔۔۔ جاویوں اور بلغاریوں نے بھی بیعت کی مولانا عبدالحی نے حرم پاک
میں مشکوٰۃ کا شاہ اسماعیل نے حجۃ البالغہ کا درس شروع کیا، مولانا عبدالحی نے اس اثناء
میں صراط مستقیم کا ترجمہ عربی میں کیا جس کی نقلیں بعض اصحاب نے لیں (۱)۔ اواخر محرم
میں مدینہ منورہ کا قصد فرمایا۔ راستہ میں سید صاحب سخت بیمار ہو گئے۔ بعض اوقات
بیہوش ہو جاتے تھے، مگر مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے تندرست ہو گئے۔ آدھی رات کے
وقت مدینہ منورہ پہنچے۔ منافہ میں اترے۔ غسل کر کے لباس بدلا۔ صبح کو شہر کا دروازہ کھلا
تو اندر داخلہ ہوا۔ حرم مدینہ کے تمام ترکی آثار کی زیارت کی۔ اس زمانہ میں نجدیوں
سے ارباب حکومت بگڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ جنگ ختم ہوئے چند سال ہی
گزرے تھے۔ اگر کوئی شخص موحدانہ عقیدے کی اشاعت میں سرگرم ہوتا اور بدعات
ومحدثات کے رد میں سختی سے کام لیتا تو اسے وہابی سمجھ کر مواخذہ کا تختۂ مشق بنا لیا جاتا
تھا۔ سید صاحب کے ساتھیوں میں مولوی عبدالحق نیوتنوی بہت تیز مزاج تھے۔ ان کی
شکایت ہوئی کہ وہابی ہیں، ان پر مقدمہ چلا تو مولانا عبدالحی نے ضمانت دو وکالت
کر کے نجات دلوائی۔ مدینہ منورہ میں سید عبدالرحمٰن نے دو پستول خریدے، مگر وہ
چوری کے تھے، لہذا حاکم احمد شاہ کو واپس کر دیئے، حضرت ابوعبیدہ کے مزار کی زیارت
کی۔ نواب وزیر الدولہ نے زیارت رسول ﷺ اور قرآن کی اجازت کا خواب لکھا ہے

ا۔ حیرت ہے کہ عربی میں لکھی ہوئی تقویۃ الایمان یعنی رد الاشراک تقسیم کیوں نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ تقویۃ الایمان مسترد و منسوخ ہو چکی تھی۔

(وصایا)۔۔۔ بیت المقدس جانے کا ارادہ تھا مگر ہمراہیوں کے اضطراب کی وجہ سے ترک کرنا پڑا۔ اس لئے کہ سب کو لے جانا مشکل تھا اور پیچھے چھوڑنا گوارا نہ تھا۔ مدینہ میں سردی تیز ہوگئی تو واپس آئے۔ دس گیارہ دن سفر میں لگے۔ ایک مہینہ مدینہ منورہ میں گزار کر ۲۹ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ کو واپس ہوئے۔ وزیر الدولہ نے لکھا ہے کہ جس روز مدینہ منورہ پہنچے تھے اسی روز رات کو بخار آ گیا تھا۔ اپنے قیام گاہ کی کھڑکی میں روضۂ مقدسہ کے سامنے بیٹھ گئے۔ اسی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ عرض کیا کہ "غلام علی الہ آبادی نے جو قرآن شریف یہاں کی تلاوت کے لئے بھیجا ہے اگر حضور اجازت دیں تو الماس صاحب کو وہ نسخہ دے دوں، کیونکہ وہ باقاعدہ تلاوت کے عادی ہیں، ورنہ یہاں قرآن شریف رکھے ہوئے ہیں اور کوئی تلاوت نہیں کرتا۔۔ مکہ معظمہ واپس آ کر ہمراہیوں میں سے جن جن کے لئے جہاز میں جگہ نکلی گئی انہیں ہندوستان بھیجے گئے۔ خود پہلے کی طرح مشغول عبادت رہے۔۔۔ فرماتے ہیں کہ خیال آیا ہندوستان دار الحرب ہے۔ بہتر ہے کہ حرم پاک میں بیٹھا رہوں (۱)، لیکن غیب سے اشارہ ہوا کہ اگر تم نہیں جاؤ گے تو ہم اپنا کام کسی دوسرے سے لے لیں گے۔ اسی پر واپس کا ارادہ پختہ ہو گیا۔ ۱۵ر شوال کو مکہ سے چلے۔ ذیقعدہ کے آغاز میں جدہ سے روانہ ہوئے۔ اس وقت تک صرف اتنے ساتھی رہ گئے تھے کہ چار جہاز کرایہ پر لینے پڑے (گویا نصف سے زیادہ ساتھی روانہ کئے جا چکے تھے) مخا میں ایک مہینہ گزارا پھر ذوالحجہ کو بمبئی پہنچ گئے، وہاں سے الپی وغیرہ ہوتے ہوئے ۶ر صفر ۱۲۳۹ھ کو کلکتہ آ گئے۔ کلکتہ میں خاصی دیر قیام رہا، پھر مختلف مقامات پر ٹھیرتے ہوئے دو سال دس ماہ بعد ۲۹ر شعبان ۱۲۳۹ھ مطابق ۹ر اپریل ۱۸۲۴ھ کو وطن آ گئے۔ کچھ مدت بعد بیت المال کا جائزہ لیا تو دس ہزار روپے موجود تھے۔

سفر حجاز کے حالات و واقعات مختلف راویوں اور سوانح نویسوں کے بیان

۱۔ مگر جہاد تو ان کی سرشت میں تھا، ہندوستان کو جب دار الحرب تسلیم کر لیا تو ایسا خیال کیوں آیا۔

کردہ اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ سخن سنج اس سے مضمون آرائیوں کا خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ خواب یک خواب است، اما بعد تعبیر ہا۔ اور اس سب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ ہر شخص نے اپنے قیاس سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے، اور حقیقت سے بے نیاز ہو کر ان سب کی چٹوگی اور بوقلمونی بذات خود دلچسپی کے ساتھ وقت کاٹنے کا ذریعہ بن سکتی ہے، مگر ان سب کے اختلافات نشاندہی کر دیتے ہیں کہ اصلیت و واقفیت کچھ اور ہے۔ لب ولباب ان بیانات اور خوش خیالیوں کا یہ ہے کہ خلاف قیاس و امید حد سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ کرامتیں حسب معمول تماشے دکھا کر جادو کا کام کرتی رہیں اور ان کرامتوں کی تشریح شاہ عبدالعزیز والے خط میں موجود ہے جو انہوں نے مولوی محمد نعیم کو لکھا تھا یعنی اس طرح طفلان طریقت کو ایسے عجائبات کے ذریعے ترغیب دی جاتی ہے تا کہ ہمت افزائی ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک سید صاحب کی حیثیت طفل طریقت سے زیادہ نہیں تھی۔ اس خط میں یہ بھی امید ظاہر کی گئی ہے کہ شاید آگے چل کر سید صاحب ابدال بنا دیئے جائیں مگر عام طور پر ابدال مجذوب و مستتر ہوا کرتے ہیں۔ کشف و کرامات کے متعلق خود ''صراط مستقیم'' میں تحریر فرمایا ہے کہ:

> ''ان طلسماتی نظاروں سے مومن کا ایمان عزم و اتباع سنت بڑھتا ہے لیکن وہ کمال جو انسان سے مطلوب ہے ان کشف و کشود سے حاصل نہیں ہوا کرتا۔''

اس حقیقت کے کھل جانے پر ان کے معتقدین سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ کرامتوں کا جو ڈھونگ رچایا ہے وہ کمال کی علامت کیسے بن گیا۔ یہ ان صاحبان کی عجائب پرستی اور بدعت دوستی کی دلیل ہے۔ انہوں نے ان کرامتوں کے اظہار سے سید صاحب کو جھنجھنا بنایا ہے اور سیدھے سادے مسلمانوں کو فریب میں ڈالا ہے۔ اہل فہم اس حرکت کو ذلت کی نگاہ سے دیکھنے کے لئے مجبور ہیں۔ الفاظ کو چمکا کر انہوں نے معنوں کو خبط کر دیا ہے۔ اس لئے ان کے عقائد بھی محجوب ہو کر رہ گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس قافلہ مبشرہ کے پہنچنے سے پہلے یہ خبر مکہ معظمہ میں پہنچ چکی تھی کہ ان صاحبان کے عقائد نجدیوں اور وہابیوں جیسے ہیں۔ ایسی افواہوں سے بدگمانی کا پیدا ہو جانا فطری و لازمی تھا۔ قدم اول پر شریف مکہ نے ان سے استفسار کیا تو انہوں نے صفائی پیش کر کے یقین دلا دیا کہ ہم نہ وہابی ہیں اور نہ نجدیوں کے اعتقادات رکھتے ہیں، ہر چند انہوں نے منطقی مغالطوں سے کام لیا ہو مگر اسی کو تقیہ کہا جاتا ہے۔ بہر حال شریف مکہ کو مطمئن کر دیا گیا مگر یہ درون خانہ کی صفائی افواہ کی عام شہرت کو نہ مٹا سکتی تھی اور اسی کو کہتے ہیں "بد اچھا بدنام برا" اس شک و شبہ کی حالت میں لوگ ان سے دور رہے اور درمیان میں ایک خلیج واقع ہوگئی۔ لہذا پر جوش استقبال کا دعویٰ اور ادعائے مقبولیت معلوم۔ مرزا حیرت کہتا ہے کہ حج میں نجدیوں سے ملاقات ہوئی تھی جس کی بنا پر ڈاکٹر ہرجرونجے نے یہ رائے قائم کی۔ انہوں نے نجدیوں سے عقائد مستعار لئے مگر میرزا صاحب کو اس سے قطعی انکار ہے اور علانیہ کہتے ہیں کہ نجدیوں کی ملاقات سے پہلے ہی سے ان کے عقائد ذاتی طور پر ایسے ہی تھے، اور اگر ان کے عقائد میں کوئی سقم ہوتا تو اس کو دور کرنے کے لئے مولانا عبدالحی، شاہ اسماعیل اور دیگر علما خود ان کے پاس موجود تھے۔ لہذا نجدیوں سے انہوں نے سبق نہیں پڑھا، اس کے مقابل میں مولانا مہر صاحب کا اعلان ہے کہ ترکوں اور مصریوں نے نجدیوں کو اس درجہ کچل دیا تھا کہ حجاز میں آنے کی نجدیوں کو ہمت ہی نہیں تھی۔ لہذا ایسی صورت میں نجدیوں کے حجاز آنے اور ان سے سبق لینے کی افواہ غلط ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ مولانا تھانوی کے ملفوظات "حسن العزیز" (۱) کی جلد اول میں لکھا ہے کہ:۔

ترکوں کے تسلط کے بعد بھی حجاز میں نجدیوں کے خفیہ اڈے موجود تھے۔ چنانچہ ایک نجدی سے حاجی امداد اللہ کے مناظرہ کا حال بھی لکھا ہے۔ اس بیان سے میرزا حیرت کے بیان کی تائید اور جناب مہر کے ارشاد کی تردید ہو جاتی ہے۔ "موج

۱۔ مرتبہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب۔

کوثر" میں شیخ محمد اکرام صاحب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ:" سید صاحب کو حجاز میں وہابیوں کے عقائد سے باخبر ہونے کا موقع ملا تھا۔ سید صاحب کے اور وہابیوں کے عقائد میں بہت اشتراک ہے، اس لئے ان کے بہت سے ساتھی وہابی عقائد سے متاثر ہوئے تھے۔۔۔ چنانچہ شاہ اسماعیل نے سفر حج سے واپس آکر اپنے آپ کو غیر مقلد ظاہر کیا۔ البتہ مولانا عبدالحی ان سے متفق نہیں تھے اور سید صاحب کے متعلق اختلاف رائے ہے۔

جناب اکرام کی تحقیق مستشرقین جیسی ہے جو محض قیاس سے گول مول نتیجہ نکال لیا کرتے ہیں اور کلیہ بنا لیتے ہیں۔ اکرام صاحب نے تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم کا خود مطالعہ فرمایا ہے اور اس پر اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ پھر کیا وجہ کہ انہوں نے نجدیوں کے اثرات کا حجاز میں قبول کرنا لکھا۔ میرزا حیرت اور جناب مہر کا خیال یقیناً صحیح ہے کہ اس موقع پر نجدیوں سے ان لوگوں نے تعلیم حاصل نہیں کی۔ مہر صاحب نے تو صاف کہا ہے کہ:

مدینہ طیبہ میں موحدانہ عقائد رکھنے کی وجہ سے مولوی عبد الحق نیوتنوی پر مقدمہ چلا تھا۔ تاریخ سے اگر شواہد طلب کیے جائیں تو واضح ہوگا کہ ترکوں کے تسلط کے بعد نجدیوں کا اثر مخا اور حدیدہ میں باقی و جاری تھا۔ وہیں سے ایسے لوگ خفیہ طور پر حجاز کے اوپر اثر ڈالتے تھے اور سید صاحب کے حالات سے ظاہر ہے کہ آپ جاتے مخا میں طویل قیام کیا اور حدیدہ میں ہندوستانی دوست نے دعوت کی تھی۔ قافلہ کے نجدی الخیال ہونے کی خبر حجاز میں یقیناً ان ہی مقامات سے پہنچی تھی۔ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کے خیالات و عقائد اس قافلہ کے سفر حجاز سے پیشتر کے تھے۔ اور تاریخی حقائق مظہر ہیں کہ اس قسم کے موحدانہ عقائد ہندوستان میں محمد تغلق کے عہد میں موجود تھے۔ اسی زمانہ میں ابن تیمیہ کی تعلیم ہندوستان میں رائج ہوئی تھی۔ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ امام ربانی حضرت مجدد سرہندی کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ کی اصلاحی تحریک نے ابن تیمیہ اور ابن عبد الوہاب نجدی کی تجدید کو مخلوط کر کے موحدانہ

عقائد کو فروغ دیا تھا۔ شاہ فخر، شاہ ولی اللہ کے ہم عصر ہیں، ان کے ملفوظات سے منقول ہے کہ محمد فاخر نامی ایک عرب نے دہلی آ کر اس قسم کی تبلیغ کی تھی اور نجدیوں کے اصول کے مطابق دہلی میں قبروں اور قبوں کو ڈھانے کا آغاز کیا تھا۔ لوگ انہیں ''وہابی لہابی'' کہا کرتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز کے زمانہ میں بھی نجدی تعلیم کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ کتاب التوحید کا نسخہ سب سے پہلے ایک مراد آبادی صاحب حجاز سے یہاں لائے تھے۔ مختصر یہ کہ اس قسم کے جملہ سامان دہلی میں سید صاحب کی بیعت اور تبلیغی دورہ سے پہلے ہی سے موجود تھے، اور اسی پرانی تجدید کی بنیاد رکھ کر شاہ اسماعیل نے جامع مسجد میں جمعوں پر وعظ فرمانا شروع کئے تھے۔ اور ان ہی ''موحدانہ'' عقائد پر علامہ فضل حق خیرآبادی سے مباحثہ ہوا کرتے تھے۔ انہیں مباحثوں کی وجہ سے شاہ اسماعیل میں افراط وغلو کی شان پیدا ہوگئی تھی۔ اور انہوں نے علی الرغم شرک کے دائرہ کو از حد وسیع کر دیا تھا۔ چنانچہ تقویۃ الایمان کا مسودہ اپنے احباب کو دکھاتے وقت اس امر کا انہوں نے خود اقرار کیا تھا۔ ''تحفۂ محمدیہ'' میں بتایا گیا ہے کہ جس وقت شاہ اسماعیل تقویۃ الایمان لکھ رہے تھے۔ اس وقت ان کا ایک شاگرد مسمی امام بخش اس کا مسودہ ہر روز رات کو مولانا مملوک علی کو لے جا کر دکھا دیا کرتا تھا اور وہ روزانہ اس حصہ کا رد لکھ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب تقویۃ الایمان مکمل ہوئی تو مولانا مملوک علی کا رد بھی تکمیل کو پہنچا۔ اس رد کو مولانا مملوک علی نے ۱۸۱۷ء میں شائع کیا تھا۔ مولانا مملوک علی تقویۃ الایمان کا تلفظ قاف کو نون سے بدل کر لیا کرتے تھے۔ یعنی ''ایمان کو توڑنے والی کتاب'' کہتے تھے۔ اس واقعہ سے تقویۃ الایمان کی تصنیف کا تعین ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء سے پہلے کیا جا سکتا ہے۔ تقویۃ الایمان (۱) میں وہی مسائل ہیں جن پر بحث ہوئی تھی۔ جہاد کے متعلق ایک حرف بھی اس میں موجود نہیں ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ پنجاب کے خفیہ دورہ سے پہلے شاہ اسماعیل تقویۃ الایمان لکھ چکے تھے اور تقویۃ الایمان سید

۱۔ موجودہ تقویۃ الایمان کا دوسرا حصہ شاہ اسماعیل کی وفات کے بعد محمد سلطان خان صاحب نے لکھا ہے مگر مطالب شاہ اسماعیل کے ہی ہیں۔ (حیات طیبہ) لیکن وہ کامیابی کے ساتھ نہ لکھ سکے۔ (سوانح احمدی)

صاحب کے دوبارہ دہلی آنے سے یقیناً بہت پہلے لکھی گئی تھی۔ صراط مستقیم دراصل تقویۃ الایمان کی نقل رپٹ ہے، اس میں کچھ ترمیم وتنسیخ بھی کی گئی ہے اور اس میں مسئلہ جہاد کا بھی ذکر ہے۔ ان جملہ واقعات سے بخوبی ثابت ہوجاتا ہے کہ سفرحج سے بہت پہلے ہی قافلے والوں کے موحدانہ عقائد تھے۔ صراط مستقیم کا عربی میں ترجمہ کر کے حجاز میں نقلیں تقسیم کی گئی تھیں۔ اس میں بھی موحدانہ عقائد بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اب وہ کون سی عقل ہے جو اس بات کو تسلیم کرلے کہ صراط مستقیم کے مضامین کو اہل حجاز نے اچھی نظروں سے دیکھا، اور اس کی وجہ سے اس قافلہ کو وہاں مقبولیت حاصل ہوئی۔ دور کے ڈھول سہانے ہوا کرتے ہیں، ان حضرات کے بیانات سے بھی تائید ہوتی ہے کہ وہاں بیعت کرنے والوں کی تعداد انگلیوں پر شمار کی جاسکتی ہے، بلغار کا ایک عالم مرید ہوا تھا۔ نہ بلغار کا کل قافلہ۔ جادیوں میں محض تین شخصوں کی بیعت کا اعلان ہے۔ یعنی اقبال ہے کہ کل قافلے نے بیعت نہیں کی۔ اس طرح پیشین گوئی صحیح ثابت نہیں ہوئی، کہ اقلیم روم اور اقصائے بخارا تک ان کی تعلیم کی رسائی ہوئی۔ لہذا یہ داستان محض زیب دستان ہے اور صفحۂ قرطاس کی رونق ہے۔

مدینہ منورہ کی واپسی کا سبب بھی ایک چیستان ہے۔ روایت کی گئی ہے کہ سرد موسم کی وجہ سے قافلہ کو تکلیف ہو رہی تھی، اس لئے ازراہ ترحم رسول کریم ﷺ نے اجازت رخصت دے دی، پھر یہ بھی خیال ہے کہ مولوی عبدالحق نیوتنوی کے موحدانہ خیالات پر جو مقدمہ چلایا گیا تھا وہ بھی واپسی کا سبب ہے، اور سب سے زیادہ یہ کہ مدینہ منورہ پہنچ کر شاہ اسماعیل نے گل افشانی کی تھی کہ شدّ رحال کی حدیث کے مطابق مسجد نبوی کے لئے سفر جائز ہے۔ اس لئے میں صرف مسجد نبوی میں نماز پڑھنے آیا ہوں۔ رسول پاک کے مزار اطہر کی زیارت ضمناً حاصل ہوگئی۔ ان امور کی وجہ سے مدینہ والے ان صاحبان سے الفت نہیں جتا سکتے تھے۔ وہ ان کے درپئے آزار ہوگئے، اور خیریت اسی میں تھی کہ وہ جلد از جلد وہاں سے رخصت ہوآئیں۔ (تحفہ محمدیہ:۱۲۶)

اگر رسول مقبول ﷺ کی بشارت صحیح ہے تو انہیں عقائد کی وجہ سے انہیں خارج البلد کرنے

کا مفہوم ترشح ہوتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ مولوی عبدالحق نیوتنوی کے مقدمہ اور شاہ اسماعیل کے شد رحال والے اعلام نے مکہ معظمہ والوں کے کان نہ کھولے ہوں۔ اور ابتدائی افواہوں کی وجہ سے جو انہوں نے غلط تاویل کر کے مطمئن کیا تھا، ان کی فریب دہی کو نہ سمجھ لیا ہو۔ مکہ معظمہ کے اسی آخری قیام میں یہ لوگ کچھ خاموش نظر آتے ہیں۔ پہلے کا سا جوش اور کرامتوں کا مینہ برستا نہیں معلوم ہوتا۔ نشر و اشاعت کرامات اور علمیت کے بجائے ان پر جمود اور سراسیمگی کا غلبہ ہے۔ یہی خلوت گزینی اور اچانک واپسی ظاہر کرتی ہے کہ تیارج کو چھوڑ دینا معنی دارد کہ در گفتن نمی آید۔ اگر واپسی کے لئے فرمان الٰہی ہوا تھا تو صاف ظاہر ہے کہ انہیں دوسرے حج سے محروم کرنا تھا، اسی وجہ سے وہ حاجی کے لقب سے ملقب بھی نہیں ہوئے اور یہ اللہ کا کرم خاص ہے کہ مکہ والوں کے فضیحتے سے انہیں بچ جانے کا موقع دیا۔ حکم الٰہی ۱۵/ شوال کو ہوا تھا اور انہوں نے کیم ذیقعدہ کو حج سے ایک ماہ پیشتر حجاز کو بادل محزون الوداع کہا۔ پندرہ دن کے اندر اتنے بڑے قافلہ کو جہازوں کا مہیا ہو جانا بھی ایک کرامت ہے، مگر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مدینہ منورہ کی واپسی کے بعد قافلے والوں کو جہازوں کی گنجائش کے مطابق بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ اس صورت میں حکم الٰہی کا تعین ۱۵ شوال غلط ٹھہرتا ہے۔ آخر یہ راز کیا ہے کہ بات بنائے نہیں بنتی۔ شاہ اسماعیل کی والدہ صاحبہ کی نیت کے خلاف مرض موت میں مرید کرنا بھی ایک معمہ ہے۔ مولوی معین الدین صاحب چلتی بیمار ہونے کی وجہ سے مکہ معظمہ میں چھوڑ دیئے گئے تھے۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے دن سید صاحب نے مدینہ منورہ میں بتایا کہ آج سید معین الدین کا انتقال ہو گیا اور ان کا ذکر ملا اعلیٰ میں ہو رہا ہے۔ (سوانح احمدی) اب اعجوبہ ترین حقیقت ہے کہ شاہ عبدالعزیز کا جب وصال ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء میں ہوا تو سید صاحب کو مطلق خبر نہیں ہوئی، اور ملا اعلیٰ میں ان کا ذکر انہوں نے نہیں سنا، اور نہ ان کے وصال کے بعد سید صاحب نے اپنے پیر و مرشد کا کبھی ذکر کیا۔ البتہ شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی

بڑی تاخیر کے بعد ۱۲۴۰ء میں دہلی پہنچے تھے۔ رسم تعزیت ادا کرنے کے ساتھ عقائد کے متعلق مسجد جامع میں مباحثہ بھی کیا۔ ان واقعات کو سن کر اور حالات معلوم کر کے کہنا پڑتا ہے کہ شے لطیف کی کمی یا ادھر ہے یا اُدھر ہے، اور بات طے نہیں ہوتی۔ اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کہ کیوں۔ اس سفر حجاز کا مبشرات سے سلسلہ ملانا ہر عامی کا کام نہیں۔ بادی النظر میں حال قال سے جدا معلوم ہوتا ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۹۷ کا مفہوم یہ ہے کہ حج میں رفث، فسوق اور جدال نہیں ہونا چاہیے، مگر یہاں یہ سب کچھ ہوا۔ ایسی حالت میں اس سفر حجاز کو وسیلہ ظفر کوئی کیسے مان سکتا ہے:

اس بے بسی پہ ذوق بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سیاسی ماحول

بہ ہر لحظہ بہر ساعت بہ ہر دم
دگرگوں مے شود احوال عالم

دنیا جانتی ہے کہ سلطنت مغلیہ انگلشیہ کس طرح بن گئی۔ آخری تاجداران مغلیہ کی غفلت وعیش پسندی کا مرثیہ اور انگریز سوداگروں کی فتح مندی کا قصیدہ سنتے سنتے کان تھک گئے ہیں، مگر کچھ ایسی ہوا بندھ گئی کہ کسی نے حقیقت واقعی کی طرف توجہ نہیں کی۔ انگریز سوداگروں کے عروج کی داستانوں میں خود ایسا سوز موجود ہے کہ سینہ کوبی کو جی چاہتا ہے اور خون کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ صوبیداروں نے خودمختاری اختیار کرلی تھی، مگر یہ خودمختاری راس نہیں آئی۔ جنوبی وسطی وشمالی صوبیداروں کی زندگی بجلیوں کے سایہ میں گزری۔ شمالی حملوں اور جنوب میں جاٹوں اور مرہٹوں نے قیامت برپا کردی، مگر مشرق میں بنگال چین سے بیٹھا ہوا دولت کے انبار لگا رہا تھا۔ دیوان بنگال مرشد قلی خان کے سامنے انگریز سوداگر سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اس نے ۱۷۱۷ء کے معاہدہ کے ذریعہ انہیں جکڑ بند کر رکھا تھا۔ وہ قلعہ کلکتہ یعنی فورٹ ولیم سے تجاوز نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بعد علی بردی خان کی نوابی کے حضور میں بھی وہ دم نہیں مار سکتے تھے۔ مگر ۱۷۵۶ء میں جب سراج الدولہ تخت نشین ہوا تو انہوں نے پر پرزے نکالنا شروع کردیئے۔ یہ جرأت یوں ہوئی کہ پرتگال اور فرانس والوں کی طرح وہ بھی ملکی سیاست میں حصہ لے کر دولت کمانا چاہتے تھے۔ یہ افواہ کہ سراج الدولہ

ناتجربہ کار، نااہل، رنگیلا اور ناعاقبت اندیش تھا۔ کوئی معنی نہیں رکھتی، اب تک فرانسیسی اور ڈچ فوجیں اکٹھی کرتے تھے۔ ریاستوں کی فوجوں کو تعلیم دیا کرتے تھے، اور حکومتوں کی خانہ جنگیوں میں کسی نہ کسی فریق کے ممد ومعاون بن کر معاوضہ ومنافع حاصل کیا کرتے تھے۔ اب انگریز سوداگروں کو بھی طمع اور ہوس پیدا ہوئی، اور یہی اصول اختیار کیا۔

ہندوستان میں سلطنت انگلشیہ کا بانی کلایو کو مانا جاتا ہے، وہ انگلستان کے آوارہ گرد نوجوانوں میں سے تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے سلسلہ میں اس کا ہندوستان میں آنا ۱۷۴۴ء میں ہوا۔ کئی برس کے بعد نظام اور نواب ارکاٹ کی جنگ ہوئی تو فرانسیسی سردار ڈوپلے نے ناصر جنگ کی حمایت کی اور ادھر انگریزوں کا کلایو نواب ارکاٹ محمد علی کی طرف سے نمودار ہوا۔ ۱۷۵۱ء کی اس جنگ میں ڈوپلے نے کلایو سے منہ کی کھائی اور کلایوں کی بہادری سے محمد علی کی ریاست ارکاٹ ہر خطرہ سے محفوظ ہوگئی۔ اس کے بعد کلایو کی قسمت میں بنگال کی فتح لکھی ہوئی تھی، سوائے سیم وزر کی طمع کے اس کا کوئی اور تصور ومقصد نہیں تھا۔ اپنی ان فتوحات کے بعد وہ اپنے وطن چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد اس کے کارناموں کے نتائج کی وجہ سے ایسا فتنہ اٹھا کہ انگریزی سوداگروں کو جان بچانا مشکل ہوگئی لہذا اس فتنہ وفساد کے فرو کرنے کے لئے ۱۷۶۵ء میں وہ پھر بھیجا گیا لیکن بیمار ہوجانے کی وجہ سے ۱۷۶۷ء میں انگلستان جانے کے لئے مجبور ہوگیا، پہلی مرتبہ جب وہ وطن گیا ہے تو اس آوارہ گرد نوجوان کی آمدنی مستقل طور پر چالیس ہزار پونڈ سالانہ کی ہوگئی تھی، اور وہ اپنے ساتھ اعزاء واقربا کے لئے پچاس ہزار پونڈ کی رقم لے کر گیا تھا(۱)۔ اس کا استقبال بڑی عزت واحترام کے ساتھ کیا گیا۔ اس کی دولت کی فراوانی کا علم عوام کو ہی نہیں بلکہ ڈائریکٹروں کو بھی تھا(۲)۔ اسی لحاظ سے کمپنی کے دوسرے افسروں کی دولتمندی کا بھی

1. HISTORY OF ENGLAND IN THE 18th CENTURY, VOL PAGE 263.
2. MILL & NELSON, HISTORY OF INDIA 5th EDITION, PAGE 279.

اندازہ لگا لیا گیا اور اس نتیجہ پر پہنچ کر کہ ہندوستان میں دولت آسانی سے مل جاتی ہے، انگلستان والوں نے اپنے بیکار و مجہول لڑکوں کو بھی کمپنی کا ملازم کروا دیا(۱)۔ دوسری مرتبہ جب لارڈ کلایو کا علیل ہو کر انگلستان جانا ہوا تو کمپنی کے ملازمین نے اس کی بے ایمانیوں اور رشوت ستانیوں کی شکایت کی۔ تحقیق کے لئے کمیٹی بٹھائی گئی، جس نے عرصہ دراز کے بعد فیصلہ دیا کہ شکایت صحیح نہیں ہے، مگر کلایو کے دل کے چور نے بیماری پریشانی میں اس درجہ اضافہ کیا کہ بیزار ہو کر بانی سلطنت انگلشیہ ہند نے ۱۷۷۴ء میں خودکشی کر کے تمام بلاؤں سے نجات پالی۔ کیتھ نے اپنی کتاب میں واضح طور پر لکھا ہے:

"کلایو نے کمپنی کو بدنام و ذلیل کر دیا۔"

انگریز سوداگروں کی داستان کی ابتدا اس طرح ہوئی۔ بنگال میں انگریز سوداگروں کے سر میں روپیہ کمانے کا سودا سوار ہوا تو سب سے پہلی حرکت یہ کی کہ نذرانہ اور دام لے کر کلکتہ کے فورٹ ولیم میں سراج الدولہ کے مجرموں کو پناہ دینے لگے۔ سراج الدولہ نے جواب طلب کیا تو ان بہادروں کو بجز معافی مانگنے کے کوئی چارہ نہ تھا مگر معافی حاصل کرنے کے بعد ان خطاکاروں نے ۱۷۵۶ء کے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے مرمت کے بہانے فورٹ ولیم کو وسیع کرنا شروع کر دیا تا کہ اپنے آپ کو اور زیادہ محفوظ کریں اور مجرموں کو چھپانے میں آسانی ہو۔ سراج الدولہ نے پھر جواب طلب کیا اور صاحب بہادروں نے ندامت کا اظہار کر کے اقرار کیا کہ اب ایسی خطا قبلہ حاجات نہ ہوگی۔ سراج الدولہ کچھ بھی مگر مروت کا آدمی تھا، اس نے اعتبار کر لیا اور درگزر کی۔ مگر یہ باز آنے والے نہ تھے۔ اس مرتبہ اپنی کیادی سے ہندوستانیوں کو بھرتی کر کے اپنی فوج میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ اب نواب نے ایک نہ سنی اور فوج کشی کر کے نہ صرف قاسم بازار کی کوٹھی پر قبضہ کر لیا، بلکہ فورٹ ولیم کو فتح کر کے ان

---

1 A.B. KIETH A., CONSTITUTIONAL HISTORY OF INDIA 2nd EDITION 1937, PAGE 57

مکاروں کو بھگا دیا۔ اس معرکہ میں چند انگریز گرفتار ہوئے تھے۔ انہیں مفتوحہ فورٹ ولیم کی ایک کوٹھڑی میں مقید کر دیا گیا تھا۔ ہونے والی بات کہ کافی ہوا کا گزر نہ ہونے کی وجہ سے کچھ قیدی دم توڑ گئے۔ انگریز مورخین نے بلیک ہول کی اصطلاح ایجاد کر کے عجیب روح فرسا داستان گڑھی اور نواب کو مطعون کر کے ساری دنیا کے دماغ سے یہ خیال محو کر دیا کہ ان قیدیوں کو محبوس کرنے کے بجائے قتل کرنے کا بھی سراج الدولہ پورا حق حاصل تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد فورٹ ولیم کو واپس لینے کے لئے مدراس سے کمک آئی۔ بحری فوج کا امیر واٹسن تھا، اور بری فوج کی قیادت کلایو کے سپرد تھی، کلایو کے قدم پہلی مرتبہ بنگال میں اسی وقت آئے تھے۔ بحری حملہ کی مدافعت سراج الدولہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ لہذا انگریزی افواج نے کلکتہ کو تسخیر کر کے ۲ جنوری ۱۷۵۷ء کو ہگلی بھی فتح کر لیا، صلح ہو جانے پر نواب کو فورٹ ولیم اور ہرجہ دینا پڑا۔ اس کے بعد کامیابی پر نازاں ہو کر انگریزوں نے چندر نگر کا رخ کیا۔ نواب نے فرانس والوں سے مدد لے کر مدافعت کی، مگر قسمت نے یاوری نہ کی اور شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور دوبارہ صلح ہو گئی۔

یہی وہ زمانہ تھا جبکہ ابدالی نے پنجاب پر تاخت کی تھی۔ کلایو کی آنکھوں میں سراج الدولہ خار کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اب کلایو کو نئی سوجھی، اتفاق سے ایک سکھ تاجر امی چند کلایو سے مشورہ کرنے کے لئے آیا کہ نواب سے اپنا قرضہ کس طرح وصول کروں۔ کلایو نے جواب دیا کہ میر جعفر کو میر اطرفدار بنا دو تو تمہارا قرضہ ادا کر دوں گا اور جعفر کو نواب کی گدی دلوا دوں گا، جب یہ تدبیر مکمل ہو گئی تو خوئے بدرا بہانہ بسیار۔ سراج الدولہ کو الٹی میٹم دیا کہ گزشتہ معاہدہ کی خلاف ورزی جو آپ سے سرزد ہو رہی ہے، وہ گوارہ نہیں کی جا سکتی۔ نواب ابھی جواب نہیں دے پایا تھا کہ پلاسی پہنچ کر کلایو نے حملہ کر دیا۔ میر جعفر نے سازش کے مطابق سکوت اختیار کیا اور سرج الدولہ کو گرفتار

کر کے کچھ عرصہ بعد شہید کر دیا گیا۔ پلاسی کی یہ جنگ ۲۳/جون ۱۷۵۷ء کو ہوئی تھی۔
معاہدہ کے وقت امی چند نے قرضہ کی ادائیگی کی شرط لکھنے کے لئے اصرار کیا۔ کلایو کے
تکلف کو دیکھ کر اس نے دھمکی دی کہ سازش کا راز افشا کر کے پانسہ پلٹ دوں گا۔
لہذا کلایو نے دو معاہدے لکھوائے۔ ایک میں قرضہ والی شرط مذکور تھی، اور دوسرے
میں نہیں تھی، پہلی کاپی دکھا کر امی چند کو مطمئن کر دیا، مگر دوسری کاپی پر دستخط کرادائے
جس میں قرضہ کا ذکر نہیں تھا۔ معاہدہ بغیر وانسن کے دستخطوں کے مکمل نہیں ہو سکتا تھا،
اور اس نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ پلاسی کے حملہ کو وہ غلط سمجھتا تھا، مگر
کلایو نے وانسن کو اطلاع کئے بغیر اس کی لاعلمی میں خود اپنے ہاتھ سے اس کے دستخط
بنا دیئے۔ کلایو کی ان ہی حرکتوں کی وجہ سے سلطنت انگلشیہ کی بنیاد پڑی۔ میر جعفر نے
نوابی کی خوشی میں کلایو اور ممبران کونسل کو دس لاکھ کا انعام دیا۔ اور کمپنی کے نام چوبیش
پرگنہ کا علاقہ لکھ دیا۔ یہ علاقہ کلایو کی جاگیر کے نام سے مشہور ہوا۔

پلاسی کی فتح کے بعد انگریز سوداگر اپنے آپ کو حاکم سمجھنے لگے۔ ان کی نظر
میں حکومت کا مقصد ہر جائز و ناجائز طریقے سے روپیہ وصول کرنا تھا۔ چنانچہ خوب
نذرانے لئے، ڈٹ کر جرمانے کئے، زبردستی لوٹ مار کی اور پھر ضرورتمند امراء کو حد
سے زیادہ شرح سود پر قرضے دیئے، ان حرکات ناشائستہ کی وجہ سے لوگ تھرانے لگے۔
انگریز کی صورت دیکھ کر گاؤں والے اپنے اپنے گھروں سے بھاگ جاتے تھے۔
دکانیں بند ہو جاتی تھیں اور راہگیر بدحواس ہو کر رہ جاتے تھے۔ (۱)

میر جعفر کے نواب ہو جانے کی خبر سن کر دہلی کا شہزادہ عالی گہر یعنی شاہ عالم
نواب وزیر اودھ کی معیت میں حملہ آور ہوا، مگر کلایو کا نام سنتے ہی نواب اودھ میدان
چھوڑ کر بھاگ گیا اور مجبوری میں شاہزادے نے اپنے آپ کو کلایو کے حوالے کر دیا مگر
کلایو کی سجھ بوجھ اور دور اندیشی قابل غور ہے۔ اس نے شہزادے کی تعظیم و تکریم دل
کھول کر کی اور نذرانہ کے طور پر پانسو اشرفیاں پیش کیں۔ شاہزادہ ہنسی خوشی واپس چلا

1. LOEKY; A HISTORY OF ENGLAND IN THE 8th CENTURY VOL IV, PAGE 264.

گیا۔ اب میر جعفر کو وہم پیدا ہوا کہ اس کا کرم فرما اس کی دولت لوٹ کرا سے ذلیل و تباہ کر رہا ہے۔ لہذا نجات پانے کے لئے میر جعفر نے ڈچ سے سازش کی مگر اس مقابلہ میں بھی کلایو کو فتح ہوئی اور اس نے پھر میر جعفر کو اپنی غلامی میں قبول کر کے بحال کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۷۵۹ء کا ہے۔ جس کے بعد ۱۷۶۰ء میں کلایو انگلینڈ واپس گیا۔

فتح پلاسی کے بعد جو دور شروع ہوا۔ اس کی مثال دنیائے تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ اب تک متعدد ایشیائی فاتحین نے ہندوستان پر تسلط جمایا تھا مگر اس قسم کی تبدیلی کبھی نہیں ہوئی۔ شائد اس لئے کہ ان فاتحین کا طرز زندگی اور طرز حکومت مفتوحین سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ مسلمان فاتحین کا مذہب اور ان کی زبان عربی یا فارسی اگرچہ مفتوحین سے ملتی جلتی نہیں تھی۔ مگر اس سے اجنبیت و غیریت نہیں پیدا ہوئی۔ مسلمانوں نے یہاں کی اقتصادیات، زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کو نقصان نہیں پہنچایا۔ قصبات کی زندگی کو بحال رکھا۔ ان کے یہاں سیاسی معاملات فاتح کے قبضہ میں رہے۔ اور نظامی و مالی معاملات میں ہندوستانیوں کو شریک کیا، یہی نہیں بلکہ وہ ایسے گھل مل کر رہے کہ یہاں کے تمدن کو خود قبول کر لیا۔ بعض ہندو مصلح اگرچہ ذات پات کے خود مخالف تھے مگر مسلمانوں نے ان کے ذات پات اور رسم و رواج اپنے یہاں رائج کر لئے، اس کے برخلاف انگریزی راج میں ان کے اصول اس درجہ علیحدہ تھے کہ سوسائٹی میں یکسانیت نہیں رہی اور زندگی کے ہر معاملہ اور شعبہ میں غیریت پیدا ہوگئی۔ فاتح و مفتوح میں بعد ہونے کی وجہ سے جو اختلاف ہوا وہ ہر طرف ملازمین کی دولت اندوزی سے خود کمپنی کو بے حد نقصان ہوا، اور ان میں تفریق پیدا ہوگئی۔ ملازمین مالدار بن گئے اور کمپنی غربت و افلاس کی زد میں آگئی۔ میر جعفر میں اتنی استطاعت نہیں تھی کہ بدنظمی کو دور کرنے کے لئے ہر مرتبہ روپیہ مہیا کر سکے۔ لہذا ابدا منی کا ملزم بنا کر اسے معزول کر دیا گیا اور اس کے داماد میر قاسم کے سپرد نوابی کی گئی۔ اس صلہ میں میر قاسم کو بہت بڑی رقم اور چند اضلاع نذر کرنا پڑے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ میر

قاسم میں اپنے خسر سے زیادہ شئے لطیف تھی، اس نے مرشد آباد کے بجائے مونگیر کو اپنی راجدھانی بنایا اور کمپنی کے ناجائز طریقوں پر کڑی نظر رکھی جس کی وجہ سے کمپنی کے ملازمین اور نواب کے گماشتوں میں چھڑ پیں ہونے لگیں۔ مئی ۶۲ ۱۷ء میں اس نے گورنر اور کونسل سے شکایت کی کہ کمپنی کے ملازمین ریاست میں فساد کرتے ہیں۔ لوٹ مار کرتے ہیں، گماشتوں کو زدوکوب کرتے ہیں، بازار سے چوتھائی قیمت پر اشیاء لیتے ہیں۔ اور اپنا مال پانچ گنی قیمت پر فروخت کرتے ہیں (۱)۔ جب شنوائی نہیں ہوئی۔ تو اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دے دیا کہ جہاں ملیں، انگریزوں کو قتل کر دو۔ اس کے بعد شاہ عالم (۱۸۰۶ء۔ ۱۷۵۹ء) اور نواب اودھ سے میر قاسم نے سازش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۶۳ ۱۷ء میں اسے معزول کر کے میر جعفر کو سہ بارہ نوابی عطا کر دی۔ مگر میر قاسم اپنے رفیقوں کو ساتھ لے کر ۶۴ ۱۷ء میں انگریزوں کے مقابل آیا۔ اس جنگ بکسر کی کامیابی نے انگریز سوداگروں کو مستقل طور پر بنگال کا مالک و حاکم بنا دیا۔ بوجہ علالت کلایو کو ۶۷ ۱۷ء میں ہندوستان چھوڑنا پڑا اور اسی سال میر جعفر کا بھی انتقال ہو گیا۔۔۔ دوسری مرتبہ جب لارڈ کلائیو ہندوستان تشریف لائے تو حسب عادت اپنی حرفت سے کام چلایا۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد کمپنی کے ملازمین نے ڈائرکٹروں سے ان کی رشوت ستانی اور انفویات کی شکایت کی۔ لہذا صاحب بہادر بیمار ہو گئے اور یہاں سے چلے گئے۔ شاہ عالم سے ۶۵ ۱۷ء میں دیوانی حقوق حاصل کرلینے کے بعد سات برس تک خوب جبر و تشدد کیا اور دو عملی کی اصلاح کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ پھر آسمانی غضب یہ ٹوٹا کہ ۶۹ ۱۷ء میں زبردست قحط پڑا۔ جس کی وجہ سے ایک تہائی آبادی جانبر نہ ہو سکی، اور ہزاروں بیگھہ زمین بنجر ہو کر رہ گئی۔ (۲) رابرٹ اور کیتھ نے اس قحط کے جانی نقصان کو بہت زیادہ لکھا ہے۔ اب کمپنی کی جان مصیبت میں تھی۔ نہ آمدنی ہوئی نہ مصارف پورے ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۶۷ ۱۷ء میں شرکا، کمپنی کے منافع کی شرح جو

1. WOODRUF, PHILIP, THE MAN WHO RULE IN INDIA, THE FOUNDERS,PAGE106
2. MILLS, HISTORY OF INDIA, VOL V PAGE 376.

چندلی صدی سے دس فی صدی تک تھی۔ وہ اب ۱۷۷۲ء میں ساڑھے بارہ فیصدی تک پہنچ گئی۔ اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے کمپنی کو حکومت انگلستان سے دس لاکھ پونڈ قرض لینا پڑا۔ غرض انقلاب یوں آتے ہیں۔ اور قسمتیں یوں بنتی اور بگڑتی ہیں۔
بہرحال کلائیو کو بانی سلطنت انگلشیہ کا لقب ملنا تھا۔ وہ بغیر کسی حجت کے مل گیا۔
۱۷۷۲ء میں گورنر بنگال وارین ہیسٹنگز ہوا۔ اس نے اپنے ہندوستانی تجربہ اور ذاتی فراست سے کلائیو کی حکمت عملیوں کو شرمندہ کر دیا۔ اخلاق و قانون اس کی نظر میں بے معنی الفاظ تھے نواب بنگال اور مغل بادشاہوں سے جو معاہدے تھے اس نے سوخت کر دیئے۔ ۱۷۷۳ء کا ریگولیٹنگ ایکٹ جو خرابیوں کو دور کرنے کے لئے بنایا گیا تھا ہیسٹنگز کی بے ضابطگیوں کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ دیسی عملہ کو اس نے برطرف کر دیا۔ روہیلوں کو تباہ کر کے روہیل کھنڈ نواب اودھ کے سپرد کر دیا۔ نواب سے روپیہ ملنے پر جبر و تشدد کے ساتھ بیگمات اودھ سے روپیہ وصول کیا۔ مہاراجہ بنارس سے کئی مرتبہ روپیہ وصول کیا مگر وہ جب نہ دے سکا تو اسے معزول کر دیا۔ اپنے مظالم سے ہندوستانیوں کو تباہ و ذلیل کیا مگر یہ سب کچھ کمپنی کو مالدار بنانے کے لئے کیا۔ لہذا ۱۷۷۴ء میں وہ گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ زمینداری کا نیا بندوبست بنایا۔ مالگذاری وصول کرنے کے لئے کلکٹر کا عہدہ ایجاد کیا۔ مگر بایں ہمہ کاشتکاروں اور زمینداروں میں حد درجہ اختلاف بڑھ گیا اور اس سے کسی کو فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ رشوت ستانی اور منافع کے لئے راستے کھل گئے۔ ۱۷۷۳ء سے ۱۷۹۳ء تک حکام نے تہائی اراضی کا مالک اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ بنیوں کو بنا دیا۔ لگان و مالگذاری ادا نہ ہونے پر جائدادیں نیلام ہوتی تھیں اور بنئے روپیہ دے کر خرید لیتے تھے۔ (۱) مثال کے طور پر اس طرح اس نے اپنے ملازم خاص کنتو کو بہت بڑی جائداد حاصل کر لینے کا موقع دیا (۲)۔ ہندوستانیوں کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے صدر دیوانی اور صدر نظامت کے محکمے قائم کئے جن سے مقدمہ بازی میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اس کی زیادتیوں اور بدعنوانیوں کی وجہ سے

1. R.C. DUT PAGE 61.
2. COMMITTEE OF CIRCUITS MINUTES DATED SEP 15- 1775

کونسل کے ممبروں نے اعتراض کیے تو ۱۷۸۵ء میں اس نے استعفیٰ دے دیا اور بعد کو انگلستان میں اسی وجہ سے مقدمات میں ماخوذ ہوا۔

لارڈ کارنوالس کا عہد (۹۳-۱۷۸۶ء) دانشمندی و بیوقوفی کا مجموعہ۔ اس کی قابلیت میں کچھ شک نہیں۔ وہ نہ صرف ہندوستانی رسم و رواج سے ناواقف تھا بلکہ ہندوستانیوں سے نفرت کرتا تھا اور ان کا بہترین دشمن تھا۔ ان کے مذہبی اختلافات کی وجہ سے نہیں نااہل، بے ایمان اور تنگ نظر سمجھتا تھا۔ اس لئے کہ وہ توہمات عجائبات اور خرافات کی پرستش کرتے تھے۔ سرجان شور نے لکھا ہے کہ:۔

''وہ ہندوستانیوں کی عزت و ناموس کو فنا کرنا چاہتا تھا اور انہیں بیکار بنا کر اور شرفاء کو ذلیل کر کے اپنی قوم کو فائدہ پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ ہندوستانیوں کو عہدوں سے علیحدہ کر کے اپنے نالائق اور نکمے انگریزوں کو آسانیاں بہم پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کے استمراری بندوبست کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیلام کی کثرت کی وجہ سے ۱۸۱۳ء تک زمینداری بنیوں کے قبضہ میں پہنچ گئی۔ کاشتکار اس قدر پریشان ہوئے کہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ اس کی قانونی اصلاحات سے طویل مقدمہ بازی کا آغاز ہوا۔ جرائم بڑھے، فساد پھیلا اور بدامنی میں اضافہ ہو گیا۔ وہ اپنی قوم کی برتری اور افضلیت کا قائل تھا۔ انگریزوں کو اس قدر فوقیت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ ہندوستانیوں کو حقیر خیال کرتے تھے''(۳)

کمپنی کے فوجی افسر آوارہ و بدمعاش قسم کے تھے۔ ان کو دولت کمانے کے علاوہ اپنے فرائض کا مطلق خیال نہیں تھا۔ ڈیوک آف یارک کا خط بنام کارنوالس اور ٹامس و گراٹ کی کتاب ان حقائق سے بھری ہوئی ہیں۔ ڈیوک آف ونگٹن کی کتاب Making ریمزے میور کی کتاب/Narrative of Marguess of wellsh Govt. of India The English of tilitarian & India اور برک اسٹوکس کی کتاب of India Page-209 اور کلیک کے Memories میں کارنوالس نے جو اصلاحیں کیں وہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ ہندوستانیوں کے خلاف جو قوانین بنائے وہی اس کی غیر مقبولیت کا باعث ہوئے۔ مگر

1. NOTES OF INDIAN AFFAIRS, VOL II, PAGE 577

راس نے گورنمنٹ کو مضبوط بنانے کے لئے جو خاکہ بنایا اگرچہ اس کے عہد میں ناکام ہوا مگر آئندہ اسی پر عمل کر کے سرکار انگلشیہ کو تقویت حاصل ہوئی۔ اس کے صرف دو اصول تھے۔ یعنی انگریزی حکومت کا استحکام اور ہندوستانیوں کی آزادی کو فنا کرنا تاکہ وہ بغاوت نہ کرنے پائیں۔ مگر اس کے استمراری بندوبست سے ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا جو دولت جمع کرنے کے بعد حکومت کے لئے مضر ہوا۔ فوجداری اور عدالت ہائے انصاف کی علیحدگی کی وجہ سے افسروں کے اختیارات کم ہوگئے اور گورنمنٹ کے وقار کو نقصان پہنچا۔

وارن ہیسٹنگز کے عہد سے لے کر ۱۷۹۳ء تک ہندوستانی اور انگریزوں میں روابط رہے اور قومی و ملکی امتیازات تفرقہ نہ پیدا کر سکے۔ انگریزوں نے ہندوستانی رسم ورواج سیکھے اور میل جول کو جائز رکھا۔ وارن ہیسٹنگز خود فارسی و بنگالی خوب جانتا تھا۔ سر ولیم جونز سنسکرت کا ماہر تھا۔ اور اس نے کالی داس کی شکنتلا کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا۔ انگریز ہندوستانی رؤساء و شرفا کی دعوتوں اور جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ انہیں ناچ رنگ کا شوق تھا۔ ہاتھی کی لڑائیوں کا تماشا دیکھتے تھے اور حقہ بھی پیتے تھے۔ کمپنی کے ملازمین ناکتخدا ہوتے تھے۔ اس لئے ہندوستانی عورتوں کو ملازم رکھ لیا کرتے تھے۔ اور چار روپیہ ماہوار پر ان کے یہاں رہتی تھیں۔ ہندوستانی شرفاء انگریزوں کی دعوتوں میں شرکت کرتے تھے۔ انگریزی کھانے کھاتے تھے اور شراب پیتے تھے۔ مسلمان سور کا گوشت بھی کھانے لگے تھے۔ اور اس کا نام انہوں نے ولایتی ہرن کا گوشت رکھا تھا۔ ہیسٹنگز کے ہم جلیس اور خاص دوست بینی رام، اس کا بھائی بشمبر، پنڈت گنگا، گوبند سنگھ اور علی ابراہیم خان تھے۔ مگر کارنوالس کے زمانہ میں یہ سب باتیں متروک ہوگئیں۔ تفریق شروع ہوگئی۔ غیرت کے حجاب حائل ہوگئے اور ملنا جلنا ختم ہوگیا۔ (۱)

ویلزلی (۱۷۹۸ء، ۱۸۰۵ء) دیسی ریاستوں کو ختم کرنے کے درپے تھا۔ ڈائریکٹروں

1. TG, SPEAR THE NOBLES PAGE 131

کی ہدایات کی پرواہ نہ کر کے اس نے ریاستوں میں امدادی طریقہ جاری کیا کہ فرانسیسی وہ بنگالی علیحدہ کر دیئے جائیں، اوران کے بجائے انگریزی فوج اپنے خرچے پر رکھی جائے۔ ٹیپو نے انگریزی فوج اپنے یہاں رکھنے سے انکار کر دیا۔ تو اس کے خلاف ۱۷۹۹ء میں جنگ شروع کی۔ وزیر میر صادق کی سازش سے سلطان ٹیپو شہید ہوا۔ سب ریاستوں پر قابو پالینے کے بعد مرہٹے رہ گئے تھے۔ لہٰذا جنرل لیک نے شمالی ہند کی طرف کوچ کیا۔ کرنل ویلزلی (ڈیوک آف ولنگٹن) اور اسٹیونسن دکن کی طرف روانہ ہوئے، جنہوں نے سندھیا اور بھونسلا کو شکست دی۔ جنرل لیک نے علی گڑھ کا قلعہ لیا۔ دہلی پر حملہ کیا اور آگرہ فتح کیا۔ شاہ دہلی کی پنشن مقرر کر دی گئی اور اس کی حکومت قلعہ کے اندر رہ گئی۔ ویلزلی سے ڈائریکٹر خوش نہ تھے۔ اس لئے ۱۸۰۵ء میں اس نے استعفیٰ دے دیا۔ پھر انگلستان میں اس پر بڑی بوچھاڑ ہوئی۔ ناخوشی کی وجہ یہ تھی کہ برٹش حکومت کے استحکام کے ساتھ وہ عوام کو قعر مذلت سے نکال کر خوش حال بنانا چاہتا تھا۔

لارڈ منٹو (۱۸۱۳ـ۱۸۰۷ء) کا کارنامہ یہ ہے کہ ۱۸۰۹ء میں رنجیت سنگھ سے معاہدہ کر کے دوستی کی۔ اور کابل وایران کو سفارت بھیج کر یورپ کی کسی حکومت کو اپنے ملک سے ادھر آنے کا راستہ نہ دیا جائے۔ ۱۸۱۳ء میں لارڈ موئرا یعنی لارڈ ہیسٹنگز نے مغل بادشاہ اکبر ثانی (۱۸۳۷ء۔۱۸۰۶ء) کو نذرانہ دینا بند کر دیا، اور اکبر ثانی سے اختیارات چھین لئے۔ اسی سال انگریزی تعلیم شروع ہوئی۔ مسلمان انگریزی تعلیم کے خلاف تھے، مگر شاہ عبدالعزیز نے جب فتویٰ دے دیا تو استفادہ کرنے لگے۔

لارڈ ہیسٹنگز (۱۸۱۳ـ۲۳ء) کے آنے پر یہاں غدر مچا ہوا تھا اور ریاستوں میں جھگڑے ہو رہے تھے۔ اس نے ڈائریکٹروں کو لکھا کہ ویلزلی کے طرز عمل سے جو فتنہ اٹھا ہے اس کو رفع کرنے کے لئے مجھے اختیار دیا جائے۔ چنانچہ گورکھوں کو اس نے ۱۸۱۶ء میں زیر کیا۔ اس کے بعد بمبئی اور مدراس سے فوجیں منگا کر پنڈاریوں کو محصور

کرلیا۔ پنڈاری حکومت نہیں چاہتے تھے۔ صرف لوٹ مار کے عادی تھے۔ اور معاوضہ لے کر مرہٹوں کے ساتھ انگریزوں سے لڑتے تھے، ۱۸۱۷ء و ۱۸۱۸ء میں میدان صاف کرکے امیر خان کو ریاست ٹونک دی۔ کریم خان کو گورکھپور میں ریاست ملی، مگر چیتو فرار ہوگیا، اور چیتے کا شکار ہوگیا، ۱۸۱۹ء تک مرہٹوں سے فیصلہ کیا، ۱۸۲۳ء تک ہندوستان پر تسلط ہوگیا۔ اسی سال ڈائریکٹر کو ناراض دیکھ کر استعفیٰ دے کر وہ وطن چلا گیا۔

۱۸۳۱ء میں لارڈ بینٹنگ نے رنجیت سنگھ سے دائمی صلح کا معاہدہ کیا اور شاہ عالم کو قلعہ سے ہٹا کر قطب مینار کے محلوں میں بھیج دیا۔ بہادر شاہ (۱۸۳۷ء۔ ۵۷ء) کے بعد لارڈ کیننگ نے مغلوں کی فرضی بادشاہی بھی ختم کردی۔ اور ۱۸۰۷ء میں غدر پڑا (۱)۔ کارنوالس نے بڑے عہدوں سے ہندوستانیوں کو محروم کردیا تھا، جس کی وجہ سے بد امنی ہوئی۔ ویلزلی نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کو لکھا کہ یہ قانونی کوتاہی ہے جس کی وجہ سے محکوموں میں ہردلعزیزی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ لہذا ان کے قلوب سے نفرت و مخالفت کو دور کرنا ضروری ہے۔ ہم نے ان کے اختیار، آمدنی اور عزت چھین کر ابھی تک ان کے زخموں کا مداوا نہیں کیا ہے۔ (مکتوب ویلزلی مورخہ ۲۳ اپریل ۱۷۹۹ء) جو ٹامسن اور گیراٹ نے اپنی کتاب The rise and fulfilment of British rule in India میں درج کیا ہے۔ مزو نے اپنی رپورٹ ۱۲ اگست ۱۸۱۷ء میں لارڈ ہارڈنگ کو لکھا کہ برٹش گورنمنٹ کی فوجی قوت بغاوت کو دفع کرسکتی ہے۔ بیرونی حملوں کا تدارک کرسکتی ہے۔ اور رعایا کی حفاظت کی ضامن ہوسکتی ہے جو کسی نیٹو ریاست سے ممکن نہیں۔ قانون و اصول ان کی خانگی معاملات کی بھی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ مگر یہ قوت وطاقت بڑی قیمت پر خریدی گئی ہے یعنی اپنے نیشنل کیریکٹر کو فنا کرکے۔ اس لئے اس قوت کو معزز و وقیع نہیں سمجھا جاسکتا۔ برٹش صوبوں کے باشندے بغیر کسی خوف کے اپنے اپنے پیشوں میں مصروف رہ سکتے ہیں اور محنت کے پھل پاسکتے ہیں۔ مگر ان میں

1. CAMBRIDGE SHORT HISTORY OF INDIA.

سے کوئی بھی اس وحشیانہ حالت میں رہ کر ترقی نہیں کر سکتا۔ ان کا مستقبل کچھ نہیں ہے۔ قانون سازی میں ان کا دخل نہیں ہے نہ ان کا کوئی حصہ فوجی و سول ملازمتوں میں ہے وہ محض حاکموں کے حکم کے بندے ہیں لیکن جہاں کوئی حاکم نہیں ہے وہاں ان کی جماعت میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو رہبری کر سکے۔ یہ لوگ پسماندہ ہو کر رہ گئے ہیں، ان کے اخلاق میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ لہذا برٹش کی فتح و کامیابی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بجائے ترقی یافتہ اور مہذب ہونے کے یہ لوگ مردہ دل ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کے بعد ۱۲ نومبر ۱۸۱۸ء کو پھر لکھا کہ بیرونی فاتحین نے ہندوستانیوں پر سختی کی بلکہ مظالم بھی کئے لیکن ان فاتحین سے برتاؤ سے ہمارا برتاؤ سب سے زیادہ قابل نفرت ہے۔۔۔ یہ نہ صرف نامہربانی نہیں ہے بلکہ سیاست سے بھی بعید ہے کہ ان لوگوں کے کیریکٹر جو ہمارے دست نگر ہیں حد سے زیادہ گرادیں۔ پھر چند برس کے بعد اس سے بھی زیادہ سخت لکھا(۱)۔ الفنسٹن نے لکھا ہے کہ ہم نے ان کے ذہن کو خشک کر دیا ہے اور ہماری فتوحات نے انہیں مردہ بنا دیا ہے۔ اب ان میں نہ علم رہ سکتا ہے نہ ان میں کوئی مجتہد پیدا ہو سکتا ہے۔ لہذا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ اپنے پہلے والے امورثوں کو بھی بھول جائیں گے۔ مرہٹوں کی جنگ کے آخر میں میلکم نے بھی لکھا ہے کہ ہمارے قانون و آئین بغاوت آفرین ہیں۔ کیونکہ یہاں والوں کے سامنے ان کی موت کھڑی ہے۔ ہمارا سلوک اگرچہ صحیح ہے مگر سخت و سرد ہے۔ اس سے سے خوف پیدا نہیں ہوتا، مگر خوف کے آثار محسوس ہوتے ہیں۔ لوگ اگرچہ محفوظ ہیں، مگر بیکار و نادار ہیں اور ان سے کوئی ہمدردی نہیں کی جاتی۔ یہ صحیح ہے کہ انہیں جان کی امان حاصل ہے۔ مگر ان کی عزت و ناموس خطرے میں ہے اور ترقی کے مواقع نہیں ہیں۔ جس کی آزادی سلب کر لی جاتی ہے، اس کے اخلاق گر جاتے ہیں۔ اور قومی عزت کا پاس جاتا رہتا ہے۔ ان کے گلوں میں طوق غلامی ڈال دیا گیا ہے۔ ہر فرقہ کمزور ہے۔ سانس لینا دشوار ہے۔ ہندو اور مسلمان کی جاگیریں ختم کر دی گئیں ہیں۔ ان کے اسلحہ ضبط کر لیے گئے ہیں۔ ہر

1. REGENOL REYNOLD,THE WHITE SAHIES OF INDIA.

عہدے سے برطرف کر دیئے گئے ہیں اور ان کی سرپرستی و حمایت نہ کر کے کتے کی موت مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ رہا عام طبقہ تو اس پر ٹیکس لگا دیئے گئے ہیں سختی سے مالگذاری وصول کی جاتی ہے۔ کسانوں کی زندگی حرام ہو گئی ہے اور اہل حرفہ گورنمنٹ کی پالیسی کی وجہ سے بے زمین کے کاشتکار معلوم ہوتے ہیں۔ اس مایوس کن حالت اور زمانہ کا تقاضا ہے کہ ان کے سدھارنے کے لئے نیا عنصر پیدا ہو اور وہ حکومت کا نشہ اتار دے۔(۱)

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر گو مسلمانوں کا دشمن ہے مگر اس نے اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں مسلمانوں کی زبوں حالی کی صحیح تشخیص کی یعنی لکھا ہے:

اس حقیقت سے چشم پوشی بے سود ہے کہ ہم پر کیسے کیسے شدید الزام عائد کرتے ہیں۔۔۔۔ وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے ان پر ہر قسم کی باعزت زندگی کا دروازہ بند کر دیا ہے۔۔۔۔ وہ ہمیں یہ بھی الزام دیتے ہیں کہ ہم نے مسلمان قاضیوں کی برطرفی سے ہزاروں خاندانوں کو مبتلائے آفات کر دیا ہے۔۔۔۔ ان کو شکایت ہے کہ ہم نے مسلمانوں سے مذہبی فرائض ادا کرنے کے ذرائع چھین لئے ہیں۔ اور اس طرح روحانی اعتبار سے ان کے ایمان کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ ہمارا بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے مذہبی اوقاف میں بددیانتی سے ان کے تعلیمی سرمایہ کا غلط استعمال کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی شکایتیں ہیں جو جذبات پر مبنی ہیں۔۔۔۔ وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہم نے بنگال میں قدم رکھا تو مسلمانوں کے ملازمین کی حیثیت سے لیکن اپنی فتح و نصرت کے وقت ان کی مطلق پرواہ نہیں کی اور نو دولتوں نے گستاخانہ ذہنیت کے ساتھ اپنے سابق آقاؤں کو پاؤں تلے روند ڈالا۔۔۔۔ ہنٹر صاحب ہی مسٹر بیلے حکومت ہند کے محکمہ داخلہ کے سیکرٹری کی رائے نقل کرتے ہیں کہ:

"کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ (مسلمان) اس طریقہ تعلیم سے پرہیز

1. THOMSON EDWARD: THE MAKING OF INDIAN PRINCES.

کرتے ہیں، جو کتنا ہی اچھا ہو ان کے ملی رجحانات کے خلاف ہے۔ ان کی ضروری احتیاجات بھی پوری نہیں ہوتیں، یہ طرز تعلیم ان کے مفاد کے خلاف اور ان کی مدنی روایات کے منافی ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمان۔۔۔ حکومت کے ان عہدوں اور ملازمتوں پر کوئی جگہ نہیں پاتے، جن پر ان کی اجارہ داری قائم تھی۔۔۔ جن مسلمانوں کی تعلیم ذرا بہتر ہے وہ بھی نالاں ہیں۔ ان کا یہ احسان ایذا رسانی تک نہیں پہنچتا مگر ان کے مذہبی خیالات کے مطابق لاپروائی تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ ان کے تعصب کو۔۔۔ یہاں تک برانگیختہ کیا گیا ہے کہ ڈر ہے کہیں ساری مسلمان قوم بے وفا، جاہل اور متعصب باغی کی شکل اختیار نہ کر لے۔۔۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بڑے افسروں سے لے کر چھوٹے افسروں تک کسی نے بھی مسلمانوں کے متعلق ناانصافیوں پر زیادہ غور نہیں کیا۔۔۔ ہندوستان کی آبادی کا بہت بڑا حصہ۔۔۔ اپنے آپ کو برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ و برباد ہوتا دیکھ رہا ہے، اس کو شکایت ہے کہ جو لوگ کل تک اس ملک کے فاتح اور حکمران تھے آج نان جویں کے روکھے سوکھے ٹکڑوں کو ترس رہے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ یہ نتیجہ ہے ان کے اپنے انحطاط کا، عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہوگا۔ ان کا انحطاط بھی ہماری ہی سیاسی غفلت ولاپرواہی سے ہوا ہے۔ جب تک اس ملک کی عنان حکومت ہمارے ہاتھ میں نہیں آئی تھی تب بھی مسلمانوں کا یہی مذہب تھا۔ وہ ایسا ہی کھانا کھاتے۔ اور جملہ ضروریات زندگی میں ویسی ہی بود و ماند رکھتے تھے جیسا کہ اس زمانہ میں۔ وہ اب بھی وقتاً فوقتاً اپنے احساس قومیت اور جنگی اولوالعزمیوں کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ بایں ہمہ یہ وہ قوم ہے جسے برطانوی حکومت نے تباہ کر دیا ہے۔۔۔ انہیں گلہ ہے تو یہ کہ اور کہیں نہیں تو کم از کم بنگال میں ان کے لئے عرصہ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں کہئے کہ یہ قوم وہ ہے جس کی روایات شاندار ہیں مگر جس کا

مستقبل کچھ نہیں ہے۔۔۔۔ دنیا کی بے ثباتی بھی کیا چیز ہے کہ جو شے مضبوطی سے قائم کی جائے وہی تباہ ہو جاتی ہے اور جو شے نقل مکانی کرتی رہتی ہے اس کو ثبات و دوام ہے۔۔۔۔ ان تبدیلیوں کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں جو لارڈ کارنوالس نے رائج کیں، جن سے ۱۷۹۳ء کا دوامی بندوبست مرتب ہوا۔ اس سے مسلمانوں کا سب کاروبار ہمارے ہاتھ میں آ گیا۔ مسلمان گھرانوں کو سخت نقصان پہنچایا۔۔ وغیرہ وغیرہ۔"

مگر افسوس کہ ہندوستان میں کسی کو بھی ہمت نہیں ہوئی کہ اپنی زبوں حالی کو سرکار والا جاہ کے سامنے پیش کر کے دادخواہی کرتا۔ البتہ دور بیٹھے ہوئے غم و غصہ میں بغیر اسباب کے گورنمنٹ کے خلاف بغاوت کا جذبہ بھڑکایا گیا اور یہ تجاویز ایسی تھیں کہ باوجود صحیح اور جائز ہوتے عوام کے موافق نہ آ سکیں، اور کیوں آتیں جبکہ ان کی بیماری دور کر کے روح کو قوی نہیں بنایا گیا مگر شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی یہی کوشش تھی کہ پہلے قوت اور اتحاد پیدا کرنے کی طرف توجہ کرنا چاہیے اور جب ایسا کر لیا جائے تو جہاد کی تیاری کی جائے۔ ان کے بعد جو جہاد کیا گیا وہ طفلانہ جہاد تھا، اور جملہ عیوب سے بھرا ہوا تھا اور بغیر سیاسی حالات کو سمجھے ہوئے محض مذہب کے نام سے کیا گیا تھا۔ اب آخر میں سرسید احمد نے ہنٹر کی پیدا کردہ نفرت کو دور کر کے گورنمنٹ کے سہارے مدرسہ جاری کیا کہ مسلمانوں میں روح پیدا ہو مگر دیوبند کے بعض علماء نے سرسید کی مخالفت کو عین مذہب سمجھا کہ کافر گورنمنٹ سے مدد لیں اور آج دیوبند سرکار کی مدح سرائی میں اس درجہ منہمک ہے کہ ایسے اپنے اتحاد کا مطلق خیال نہیں اور اس میں بھی مختلف جماعتیں پیدا ہو گئیں ہیں، مطلب یہ کہ ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا۔

گورنمنٹ برطانیہ کی ایک معزز ہستی نے جو کرنل ولزلی اور ڈیوک آف ولنگٹن کے نام سے شہرۂ آفاق ہے۔ لکھا ہے کہ:۔

"برٹش حکومت تلوار کے زور سے قائم ہوئی ہے اور ثبوت یہ دیا ہے کہ جتنے بھی حاکم ہوئے ان میں زیادہ تر سپاہی اور فوجی تھے۔ مثلاً کارنوالس ہیسٹنگز ہارڈنگ،

ویلزلی، ہیٹنگ، آکلینڈ اور الن برو وغیرہ"۔ مگر وہ بیانات جو ان صفحات میں مذکور ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کو انگلشیہ مکاری اور کیادی سے بنایا گیا ہے یا پھر یہ بھی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جان کر یا بے صبری میں اس استقلال حکومت کا سہرا شاہ اسماعیل کے سر ہے۔ اس لئے کہ قبل از وقت جہاد کا رخ انگریز کی طرف سے پھیر کر سکھوں کی طرف کر دیا اور اگر وہ اپنی رائے میں حق بجانب تھے تو انہیں یہ بھی مدنظر رکھنا تھا۔ سکھوں کو کمزور کرنے سے انگریز کو طاقت پہنچے گی، جب رنجیت سنگھ نے بذریعہ سفارت صلح کی پیش کش کی تھی تو وہ صلح کر لیتے اور اس سے مل کر انگریزوں پر حملہ کرتے، بہر حال ان کے اس کارنامہ جہاد نے وہ کام کیا جو میر جعفر اور میر صادق سے نہ ہو سکا اور مزید یہ کہ شاہ اسماعیل نے مسلمانوں میں ایسی فرقہ بندی پیدا کر دی جس سے توحید کی علانیہ توہین ہو گئی۔ ان کی تو تو میں میں سن کر کوئی ذی ہوش اور صاحب تہذیب اس کو گوارہ نہیں کر سکتا۔ ضرورت ہے کہ گذشتہ سے سبق لے کر حال کو درست کر کے مستقبل کو سنبھالنے کی فکر کی جائے کہ مقصد توحید کی تکمیل ہو سکے۔ یہ اختلاف رائے اور اختلاف عقائد ذاتی معاملات ہیں، ان سے اصلی مقصد کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ان اختلافات کو بجائے زحمت کے رحمت بن جانا چاہیے۔ یہ فساد پیدا کرنے والے اگرچہ توحید کے مدعی ہیں مگر درحقیقت دشمن توحید ہیں اور نئی نئی اشکال نکال کر فتنے پیدا کرتے ہیں۔ یہ لوگ توحید کے معنی علم معقول کے ذریعے سمجھتے ہیں لیکن پائے استدلالیان چوبین و دلہذا ازق زق و بق بق میں مبتلا ہیں اور اتحاد کی غلط طریقہ سے عبث کوشش کرتے ہیں۔ توحید کا مفہوم صحیح جذبات و احساسات کی معرفت پر خلوص عمل سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اغراض و نفسانیت سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس تحریک میں اضداد و افتراق کا شائبہ ہو وہ پروان نہیں چڑھ سکتی اور اتحاد سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

دیکھیں کیا ہوتا ہے آہوں کا اثر ہونے تک

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جہاد

شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے بعد جب ہندوستان تباہی میں مبتلا ہوا تو سلطنت مغلیہ سلطنت انگلشیہ بن گئی، غیر مسلموں سے زیادہ مسلمانوں پر آفتیں آئیں، ان ہی کو سب سے زیادہ پامال بھی ہونا تھا، کیونکہ یہ تباہی ان ہی کے کرتوتوں کا نتیجہ تھی، ان کا سب سے بڑا دشمن انگریز تھا، وہ حکومت اپنی قائم کرنا چاہتا تھا، اس نے نہ صرف غیر مسلموں کو برگشتہ کیا بلکہ مسلمانوں میں بھی جوتا چلوایا اور خوب لڑایا، مظالم کی ان فضاؤں میں مسلمان جان سے بیزار تھے، زمین سخت تھی آسمان دور تھا، خیال تھا کہ پنجاب کے مسلمانوں سے تقویت حاصل ہوگی مگر وہ خود سکھوں کے مظالم سے بے چین و پریشان تھے، مسلمان بادشاہوں نے ہی سکھوں کو پنجاب میں بسایا تھا اور ہر طرح ان کی سرپرستی کی تھی۔

علماء وصوفیاء اپنے مدرسوں اور خانقاہوں سے مردہ دلوں میں روح پھونکنے کی کوشش کر رہے تھے، مردہ قلوب میں شگفتگی کی لہر آ بھی جاتی تھی مگر راحت وسکون کی کوئی صورت نہ تھی، جب سید احمد بریلوی کا قافلہ زیارت حرمین سے واپس آیا تو وہ اپنی کارگزاریوں پر نازاں تھا۔ اس نے اپنی للّٰہیت کی بنا پر سینہ ٹھونکا اور اپنے ملتوی کردہ جہاد کی تبلیغ شروع کر دی کہ ہندوستان نمونہ سقر ہے، یہاں سے ہجرت کر کے پنجاب جانا چاہیے، پھر وہاں کے مسلمانوں کو بھی سکھوں کی دستبرد سے نجات دلا دیں گے۔ یہ اقدام بڑی جرأت کا کام تھا مگر انہیں فخر تھا کہ تبلیغی دوروں کے ذریعہ ضائع شدہ قوتوں میں روح پیدا کر چکے ہیں، سفر حج میں درخشاں کامیابی حاصل کی ہے، لہذا ہجرت اور

جہاد کا اعلان کر دیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے تبلیغی دوروں سے اتحاد کے بجائے اختلاف پیدا ہو گئے اور سفر حج میں تنازعات کی وجہ سے تارج حج چھوڑ کر واپس آنا پڑا تھا۔ یہ بہر حال ان کی شان بے نیازی نے ان کو ڈگر سے ہٹنے نہیں دیا، اور ذوق وشوق میں بغیر زمان ومکان اور اونچ نیچ کا لحاظ کئے ہوئے ہجرت وجہاد کی طے کر لی۔

تذکرہ نویسوں نے جہاد کی داستانیں جو لکھی ہیں ان سے تنگ نظری ٹپکتی ہے اور وسیع النظری کا کسی طرح پتہ نہیں چلتا، کاش وہ زمان ومکان کو پیش نظر رکھتے تو بات بن جاتی۔

زمانہ کے متعلق صاحب بیرسٹر امروہوی کا شعر ہے:

ہر زمانہ کا اک فسانہ ہے
ہر فسانہ کا ایک زمانہ ہے

اور مکان کے متعلق مولانا حالی نے لکھا ہے:

جا کے کابل میں آم کا پودا
کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا

مقصد نصب العین مستقل رہتا ہے مگر وقت ومقام کی وجہ سے اس کے حصول کا طریقہ بدل جایا کرتا ہے، وہی بات شمال میں ایک طریقے سے حاصل ہوتی ہے اور جنوب میں دوسرے انداز سے، ایک زمانہ تھا کہ لڑائیوں میں تیر وتیغ سے کام لیا جاتا تھا مگر آج توپ وٹینک اور ایٹمی اسلحہ ان کے قائم مقام بن گئے ہیں، موجودہ دور میں انگلینیئر وں نے سبک اور خوبصورت عمارتیں بنائی ہیں مگر پہلے والے محلوں کی بنیادیں سنگین ہوتی تھیں، اور دیواریں ضخیم ضخیم قلعوں کی مانند بنائی جاتی تھیں، کون نہیں جانتا کہ صبح بنارس، شام اودھ اور شب وروز مالوہ وکشمیر کس قدر روح افزا ہوتے ہیں مگر دوپہر کو ان میں ناگوار کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، موسم گرما میں یہ سب جھانسی اور ایبٹ آباد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور بارش کے وقت چیراپونجی بن جاتے ہیں، معلوم ہوا کہ اصولوں کی تعمیل میں وقت وزمانہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، قرآن پاک خود اپنی

تنزیل سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے، صحیح حدیث ہے کہ ایک زمانہ ایسا
آئے گا کہ ایمان تالاب کے کناروں کے جھاگ کی طرح ہوگا کہ جلد بنتے ہیں اور بگڑ
جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ زمان و مکان سے جو فائدہ اٹھالے وہی میر کامران و کامیاب
ہے، یہاں یہ اصحاب ہر بنیاد غلط، ترغیب جہاد اور فراہمی اسباب کے لئے ہندوستان
کے گوشے گوشے میں پھیل گئے، اپنے ظاہری و باطنی کمالات سے ایک سال دس ماہ
کے اندر اپنے جھنڈے کے نیچے پانسو چھ سو مجاہد جمع کر لئے۔

ان حضرات کی تبلیغ کا رنگ ڈھنگ نیا تھا، اصلاح رسوم کے انداز نرالے
تھے اور ادائیگی حج بھی امتیازی شان رکھتی تھی۔ اب اس ہجرت و جہاد کو بغیر کسی ظاہری
اسباب وسامان کے کرامت ہی خیال کیا جا سکتا ہے، معتقدین و مریدین کو یقین تھا کہ
دوران حج میں سید صاحب کو الہام ہوا ہے کہ پشاور سے تا دریائے ستلج کا ملک بھی سید
صاحب کے اثر سے ہندوستان کی طرح رشک چمن ہو جائے گا۔ (۱) اس پر اگر کسی کو
شک ہوا تو آئندہ کے الہامات نے مکرر و سہ کرر اطمینان دلا دیا کہ "۔۔۔ میرے رب
نے مجھے وعدہ واثق کرایا ہے کہ ان چیزوں کو میرے ہاتھ سے پورا کر کے مجھے مارے گا۔
"فقیر دریں باب باشارت غیبی ماموراست و بہ بشارت الہامی مبشر، ہرگز ہرگز شبہہ و
وسوسہ شیطانی وشائبہ ہوا نفسانی بایں الہام ممتنع نیست" (۲)

اب کون متنفس ایسا تھا جو یقین نہ کرتا، خوشا وہ قوم جس کا نصب العین اعلاء
حق اور رضائے خدا ہو، بہر حال نہایت خلوص سے سکھوں کے خلاف جہاد کرنے کے
لئے ۷ رجمادی الثانی ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۷ رجنوری ۱۸۲۶ء کو بہ عمر چالیس سال قدم اٹھا
دیا، اس میں توکل و تدبر دونوں شامل تھے، خادمہ سے تہہ خانہ میں سے دس ہزار روپے
نکلوائے، پانچ ہزار بیویوں کو دیئے اور بقیہ پانچ ہزار چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں سلوا کر
غازیوں کی کمر میں باندھ دیئے۔ اس وقت یہاں غازیوں کی تعداد چھ سو بہت کم تھی مگر
یاغستان میں یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی، اس بے سروسامانی میں عزم و ایمان کی

۱۔ سوانح احمدی اور مہر صاحب کی سید احمد شہید ۲۔ جملہ تذکرہ جات

قوت سے ساڑھے چار برس سکھوں کے چھکے چھوڑا دیئے اور وہاں کے مسلمانوں میں صحیح وغلط کا امتیاز کر کے دکھا دیا، سکھوں نے تنگ آکر صلح کی درخواست کی مگر جذبہ ایمانی کی تقویت پرستر دکر دی، اس کے بعد مقامی حکومتوں اور روساء نے سکھوں سے ساز کر لیا اور سید صاحب کی مخالفت کی، وہاں کے مسلمانوں کے فریب ودغا کی وجہ سے الہام غلط ٹھہرا اور نتیجہ وہ ہوا جو تاریخ میں موجود ہے۔ اس طرح وہ دنیا کو ایسا سبق دے گئے جو قیامت تک نہیں بھلایا جا سکتا، اتنے بڑے لشکر کا انتظام کرنا معمولی بات نہ تھی جیسی ضرورت پڑتی گئی، ویسے ویسے اصول بناتے رہے، اب اگر بدانتظامی کی وجہ سے کسی کو تکلیف ہوئی تو مرضی الٰہی سمجھ کر صبر کر لیا۔

لاہور پہنچ کرنے کے لئے سیدھا راستہ براہ دہلی بعد عبور دریائے ستلج تھا، مگر ۱۸۰۹ء میں انگیریزوں اور سکھوں سے معاہدہ ہو گیا تھا کہ دونوں کے درمیان دریائے ستلج حد فاصل رہے گا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمنوں کی مدد نہیں کریں گے، سید صاحب نے یہ راستہ اس لئے اختیار نہیں کیا کہ انگریزی عملداری میں خلل پڑے گا اور راہ درازیوں پسند کی کہ درمیانی بستیوں اور ریاستوں کو جہاد پر آمادہ کر لیں گے، پھر بخارا، ایران اور ترکستان سے بھی مدد مل سکے گی، اس سفر کی ابتدائی منزلوں کے اختلاف کو دور کرنے کے لئے مولانا غلام رسول مہر صاحب نے حتمی رائے لکھی ہے کہ سید صاحب نے ٹونک یا اجمیر، شکار پور پہنچے، گوالیار میں پنڈاریوں والے رفیق غلام حیدر کو سب سے پہلے سید صاحب کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، اور ان ہی کی وجہ سے وہاں شاندار استقبال ہوا۔

مہاراجہ کے سالے اور وزیر راجہ ہندو رائے نے سید صاحب کو موتیوں کا ہار اور چغہ نذر کیا، مہاراج خود ادب سے حاضر ہوئے اور مہارانی نے اصرار کیا کہ ان کے خاص محل میں قیام فرمائیں، لیکن سید صاحب نے معذرت کر لی، افغانستان کے ایک شاہزادے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے وہ اس قدر گرویدہ ہوئے کہ احتراماً اپنی

صاحبزادی کو سید صاحب کی خدمت میں زوجیت کے لئے پیش کیا، مگر سید صاحب نے اپنے بھتیجے یا بھانجے کے لئے اسے قبول فرمالیا، یہاں دس دن کے قیام میں لشکر کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا، اس کے بعد ٹونک میں نزول اجلال فرمایا، یہاں قیام ایک مہینہ سے کچھ زائد رہا، سب سے پہلے نواب امیر خاں کو ایک عربی گھوڑا مرحمت کیا، پھر انہیں مرید کیا، نواب نے دل کھول کر تواضع کی اور مستقل مدد دینے کا یقین دلایا، ٹونک کے قیام میں ایک عجیب کرامت ظاہر ہوئی، سید صاحب کے محبوب مرید میاں الطاف پر دحی نازل ہوتی تھی، شاہ اسماعیل نے بڑے طوم وطراق سے سید صاحب کے مناقب میں لکھا ہے کہ یہ مرتبہ سید صاحب کی عنایت سے میاں الطاف کو حاصل ہوا تھا، وہ روزانہ حلقہ قائم کرتے تھے اور اپنی چادر میں سے نکال کر سید صاحب کو اور حاضرین کو بہشتی میوے دیا کرتے تھے، ایک روز سید صاحب کے بھانجے سید حمید الدین کو ایک چھوارہ عنایت کیا، اس میں کیڑے تھے تو سید حمید الدین نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے تمسخر کے ساتھ سب کو بتایا کہ بہشتی میووں میں بھی کیڑے ہوا کرتے ہیں، سید صاحب نے اس گستاخی پر بھانجے صاحب کو تنبیہ فرمائی، دوسرے دن حمید الدین صاحب نے بہشتی میووں کی تقسیم کے وقت میاں الطاف کے جسم سے ان کی چادر گھسیٹ لی، کرامت یہ کھلی کہ ان کی رانوں کے بیچ میں میووں کی تھیلی رکھی ہوئی تھی، لہذا وہ خبیث وذلیل وخوار ہوا۔(۱)

نواب وزیر الدولہ رقمطراز ہیں کہ ٹونک سے اجمیر تک میں سید صاحب کے ہمرکاب تھا۔ میں نے دیکھا کہ سید صاحب کبھی ایک طرف کو منہ پھیر کر سلام کرتے ہیں اور کبھی دوسری طرف گردن موڑ کر سلام کا جواب دیتے ہیں اور بعض اوقات سوال وجواب کی بھی نوبت آجاتی ہے، یہ گفتگو جنات یا رجال الغیب سے ہوتی تھی، سید صاحب نے تشریح فرمائی تھی کہ ایک جماعت رجال الغیب کی من جانب اللہ سفر وحضر

---

(۱) مولانا فضل رسول بدایونی نے سیف الجبار میں اس کرامت کو لکھا ہے اور اس کتاب کی اشاعت تک میاں الطاف بقید حیات تھے۔

میں ہمارے ساتھ رہتی ہے، جس جگہ ترویج ہدایت باری تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے تو یہ جماعت قدسیہ کثرت سے جمع ہو جاتی ہے اور جس جگہ رب العزت کو ہدایت کم کرنا ہوتی ہے تو یہ جماعت قدسیہ کم ہو جاتی ہے، دوسرا حال اس جماعت قدسیہ کا یہ ہے کہ ہمارے مقام کے وقت یہ جماعت ہمارے لشکر سے فاصلہ پر اترتی ہے اور جب ارادۂ الٰہی ہمارے کسی طرف کوچ کرنے کا ہوتا ہے تو یہ جماعت اس طرف کو چلنے لگتی ہے، پھر اس جماعت کو ہم بھی چلتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کسی جگہ زیادہ قیام کرنا پڑتا ہے اور کسی جگہ کم، اجمیر میں چند روز قیام رہا مگر سید صاحب حضرت خواجہ غریب نواز قدس سرہ العزیز کی درگاہ میں نہیں گئے۔ [illegible] پر جودھ پور کی حد ختم ہوئی اور سندھ میں داخلہ ہوا، حاجی عبد الرحیم فاطمی کو پروانہ راہداری حاصل کرنے کے لئے عمرکوٹ بھیجا مگر نائب قلعدار بے رخی سے پیش آیا اور اجازت نہیں دی، کھادرہ میں اونٹ گم ہو گئے تو ان کی تلاش کے لئے شاہ اسماعیل چھوڑ دیئے گئے، کارو میں چورن شاہ نے امیران سندھ کو سفارش لکھی، چنانچہ حیدر آباد میں خیر مقدم کیا گیا، یہاں سے بہاولپور کو درخواست بھیجی مگر مسموع نہیں ہوئی اور نہ یہاں کسی نے استقبال کیا، رانی پور میں سو مریدوں کے ساتھ سید صبغۃ اللہ راشدی ملاقات کو آئے، ان کی جماعت حر خود جہاد کی مبلغ تھی مگر راستہ مسدود ہونے کی وجہ سے وہ سید صاحب کے جہاد میں شرکت نہ کر سکے، ان کے اخلاق کریمانہ کو دیکھ کر سید صاحب نے اپنے اہل و عیال کی بود و باش کے لئے پیر کوٹ (پیر جو گوٹھ) کو پسند کیا، شکار پور والوں نے اول اول سید صاحب کو انگریزوں کا جاسوس سمجھا مگر بعد کو خاطر تواضع کی، وقت رخصت سید صاحب نے میر کاظم علی کو گھوڑا نذر کیا اور انہوں نے جواب میں اونٹنی دی جو کابل تک ساتھ رہی، میر صاحب نے جہاد میں شریک ہونے کا وعدہ کیا تھا مگر باوجود کئی مرتبہ بلائے جانے کے شریک جہاد نہ ہو سکے اور ثواب سے محروم رہے، اب بلوچستان کے حدود شروع ہوئے، یہاں بھی انگریزوں کے جاسوس ہونے کا شبہ کیا گیا لیکن کوئٹہ میں استقبال کیا گیا اور وہاں

کے رئیس نے بیعت بھی کی، چھتر پہنچے تو حاکم ولی محمد کی معرفت محراب خاں کو دعوت
دی، یہاں بھی اہل وعیال کے ٹھہرانے کے لئے خواہش ظاہر کی، یکم محرم ۱۲۴۲ھ کو دھار
پہنچے، یہ درہ بولان کا جنوبی دھانہ ہے، اس کو پار کر کے قندھار آئے، یہاں کے حاکم پر
دل خان کو ان کی بے مائیگی پر سخت حیرت ہوئی مگر قندھاریوں نے زور شور سے
عقیدت کا اظہار کیا، حاکم نے کہلا بھیجا کہ آپ کے اجتماع کی وجہ سے انتظام میں خلل
پڑتا ہے لہٰذا یہاں سے تشریف لے جائیے۔ اس کے بعد سید صاحب نے قلعہ اعظم
پور جا کر قیام کیا، یہاں خود بخود چار سو قندھاری آگئے تو سید صاحب نے حاکم سے
اجازت لے کر دو سو کو ساتھ لے لیا اور بقیہ سے وعدہ کر لیا کہ بعد کو بلا لیا جائے گا،
آگے بڑھے تو غلزیئوں کو دعوت نامہ ملا مگر اس کا جواب نہیں دیا، جلدک میں غلزیئوں
نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم چالیس پچاس ہزار سواروں سے شرکت کریں گے لیکن
سید صاحب نے نہ ان سے بیعت لی اور نہ ان کی درخواست قبول فرمائی، اس کی وجہ یہ
تھی کہ وہ نا قابل اعتبار تھے اور پشاوروالوں سے ان کے تعلقات خوشگوار نہ تھے، مشکئی
سے روساء غزنی و کابل کو خط لکھے، غزنی میں دو روز قیام کیا وہاں سب نے بیعت کی،
جب کابل سے پروانہ آگیا تو وہاں کا رخ کیا، کابل کے حاکم سلطان محمد خاں نے شہر
کے دروازے پر آ کر پیشوائی کی، ان لوگوں نے سکھوں سے بیزار ہونے کی وجہ سے
سید صاحب کو فرشتۂ رحمت سمجھا، مگر قدسی جماعت کی قلت و بے سروسامانی دیکھ کر ان
کے دل افسردہ ہو گئے، شاید عقائد کے اختلاف بھی بے دلی کا باعث ہوئے ہوں،
یہاں ۴۵ دن کے قیام میں سرداروں کے اختلاف دور کرنے کی کوشش کی مگر دور نہ کرا
سکے، بہر حال اس پورے سفر میں خاطر و مدارات ہوئی، سب نے بیعت بھی کی، لیکن
ریاست ٹونک کے علاوہ کسی نے مدد نہیں کی، ہر جگہ لشکر کی قلت کی وجہ یہ بتائی کہ سب کو
ساتھ لانا مشکل تھا، رفتہ رفتہ مجاہدین کے قافلے آتے رہیں گے، چنانچہ بعد میں
ہندوستان سے چھ قافلے آئے، جن میں مجاہدین کی تعداد تقریباً ڈھائی سو تھی، قافلوں

کی پہلی قسط کو لی گرام پہنچی تھی، ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ مولوی قلندر کا قافلہ۔۔۔۔اسی عدد

۲۔ احمد اللہ میرٹھی کا قافلہ۔۔۔۔ستر عدد

۳۔ رسالدار عبدالحمید کا قافلہ۔۔۔۔پانچ عدد

۴۔ محمد رمضان رڑکی والے کا قافلہ۔۔۔سو عدد

۵۔ قافلہ سید مقیم رامپوری۔۔۔۔۔چالیس عدد

۶۔ مولانا عبدالحی۔۔۔۔۔۔تعداد نہیں معلوم ہو سکی

قافلوں کی دوسری قسط سوات میں موصول ہوئی، اس میں پندرہ صاحبان شامل تھے اور یہ چنگلئی میں جا کر ملے تھے، ان پندرہ کے اسماء گرامی یہ ہیں۔(۱)

۱۔ سید احمد علی خواہر زادہ سید صاحب ۲۔ عنایت علی عظیم آبادی

۳۔ مولوی قمر الدین عظیم آبادی ۴۔ قافلہ مولوی عثمان علی

۵۔ مولوی مظہر علی عظیم آبادی ۶۔ مولوی خرم علی بلہوری

۷۔ مولوی عبدالقدوس کا تپوری ۸۔ مولوی سید محمد علی رامپوری

۹۔ مولانا باقر علی ۱۰۔ مولوی عبداللہ امروہوی

۱۱۔ حافظ قطب الدین پھلتی ۱۲۔ مولوی عبدالحق نیوتنی

۱۳۔ مولوی محبوب علی دہلوی ۱۴۔ حکیم اشرف علی دہلوی

۱۵۔ میرن شاہ نارنولوی

آخری دور کے قافلوں کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سید صاحب کا قیام امب میں تھا۔

۱۔ محمد اسحاق گورکھپوری کا قافلہ۔۔۔۔۔۵ عدد

۲۔ جعفر علی گورکھپوری کا قافلہ۔۔۔۔۔۱۹ عدد

۱۔ جماعت مجاہدین از غلام رسول مہر صفحہ ۱۶۷

سید جعفر علی گورکھپوری نے چشم دید واقعات اپنی کتاب ''منظورہ'' میں لکھے ہیں جو غیر مطبوعہ ہے اور اس کتاب منظورہ کی روایات پر مولانا غلام رسول مہر صاحب کو اعتماد کامل ہے مگر اس میں حالات امب سے پہلے کے چشم دید نہیں ہیں۔

۳۔ حاجی وزیر علی خاں کا قافلہ۔۔۔۔۔۵ عدد

کالا باغ میں یہ جعفر علی نقوی سے مل گئے تھے۔

۴۔ محمد رمضان کا قافلہ۔۔۔۔۔۔۵۰ عدد

یہ قافلے اپنے ساتھ روپیہ بھی لاتے تھے جو چند روز کے لئے کافی ہوتا تھا، اس کے بعد وہی اللہ کے بھروسے پر بات، عسرت کی گھٹائیں ہر وقت سر پر منڈلاتی رہتی تھیں، سیدو کی جنگ سے پہلے اور بعد عسرت انتہا کو پہنچ گئی تھی، ہندوستانی مجاہدین کی تعداد نوسو اور ایک ہزار کے درمیان تھی، قندھاری اور سرحدی مجاہدین سے جو اضافہ ہوا اس کی تفصیل یہ ہے، اکوڑہ میں مجموعی تعداد پندرہ سو ہوگئی، منڈ میں پانچ ہزار تک بڑھ گئی اور سیدو کی جنگ کے وقت مجاہدین ایک لاکھ تھے، تعداد کی قلت و کثرت کوئی معنی نہیں رکھتی، دل کی قوت اصل شے ہے، دل کی قوت محض روح سے نہیں ہوا کرتی، اس کے لئے ظاہری غذا بھی ہونی چاہیے، جب بے سروسامانی اور عسرت ڈیرے ڈال دیتی ہے تو جان پر بن جاتی ہے، مگر یہاں مژدۂ الٰہی کی وجہ سے دل بڑھے ہوئے تھے، سید صاحب کی توجہ سے فطرت بدل گئی تھی، عسرت کی داستان بھی عجیب و غریب ہے، پہلے قدم پر چارسدہ میں کھانے کا فوری انتظام کرنا پڑا تھا اور برتن گروی رکھ دیئے تھے، بیعت امامت کے بعد جب سکھوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا تو ان دنوں سامان معیشت کی بے حد قلت تھی، روپیہ ختم ہو گیا تھا اور روپیہ آنے کی بھی امید نہیں تھی، لہذا فاقے کرنے پڑے، ساگ پات پر گذر کی، یہ عسرت کئی مہینے رہی، لیکن سب مطمئن تھے۔(۱) چنگلئی میں زہر کے اثر سے سید صاحب کو صحت ہوئی تو غازیوں میں وبا پھیل گئی، روزانہ تین تین موتیں ہونے لگیں، معاش کی تنگی رہی، سخت ابتلا میں مبتلا ہوئے

۱۔ اقتباس ''سید احمد شہید'' از غلام رسول مہر صفحہ ۱۷۲

لیکن رضا پہ قضا کا معاملہ تھا، نالے کا پانی بند ہو گیا تو پن چکیاں بیکار ہو گئیں، لہذا دستی چکیاں خریدنا پڑیں اور غازی خود آٹا پیسا کرتے تھے، کلکئی میں شاہ اسماعیل وغیرہ کو دو روز کے فاقے ہوئے، درانیوں کے خلاف ہو جانے کی وجہ سے پشاور کے ساہوکاروں نے ہنڈیاں لینے سے انکار کر دیا تو بڑی مشکل سے منارہ کے ساہوکاروں سے تبادلہ کا انتظام کرنا پڑا۔ خیبر کے قیام میں عسرت کا یہ عالم تھا کہ غازی گنے چھیل کر گذر کرتے تھے، ایک روز پیش قبض کی کفالت پر بنیے سے چاول لئے اور منارہ کے بزازوں سے کپڑے خریدے، خستگی اور بدحالی دیکھ کر یہاں کی عورتیں کہا کرتی تھیں کہ سید صاحب کے ساتھی یا تو خواہش نفس سے محروم ہیں یا پھر اولیاء ہیں، زندگی کے یہ اطوار تھے مگر ہنسی خوشی سب برداشت کر لئے جاتے تھے۔ عالی ہمتی یہ تھی کہ غازیوں نے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا، جب زیدہ کی جنگ کا مال غنیمت تقسیم کیا گیا تو غازیوں نے اپنا حصہ لینے سے انکار کر دیا، بدیں وجہ کہ خرچ جو بیت المال سے ملتا ہے وہی کافی ہے، البتہ بعض غازیوں نے فوری ضرورت کی کچھ چیزیں لے لی تھیں، یہ سب انہیں اس لئے گوارہ تھا کہ اسلام کو دور اول میں جو برتری حاصل تھی وہ خدمت دین کا ثمرہ تھی، دور اول میں جذبہ جہاد کی روح پیدا ہو گئی تھی، سب کو یقین تھا کہ تبلیغی دوروں اور سفر حجاز کے بعد دور اول کی ایمانی فراست حد کمال کو پہنچ چکی ہے۔

اس زمانہ میں جب کہ سید صاحب جہاد کے لئے روانہ ہوئے، سکھ بارک زئیوں کی لڑائیوں کی وجہ سے خستہ و پریشان تھے اور رنجیت سنگھ خود امرتسر میں بیمار پڑا ہوا تھا۔ (قندھار، غزنی، کابل، پشاور، کوہاٹ اور ہشت نگر میں بارک زئیوں کی حکومت تھی) سید صاحب نے جاتے ہی اسلامی اصول کے مطابق بمقام لاہور اعلام نامہ بھیجا، جواب نہ ملنے پر معلوم ہوا کہ بدھ سنگھ دس ہزار فوج لے کر خیر آباد (صوبہ سرحد) پہنچ گیا ہے، امیر خاں خٹک نے مشورہ دیا کہ اگر بدھ سنگھ نے دریائے لنڈ عبور کر لیا تو سمہ میں قتل و غارت کرے گا اور وہاں والے آپ کا ساتھ نہیں دیں گے، لہذا پیش قدمی کر کے اسے روک دینا چاہیے اور نوشہرہ پہنچ کر اس سے مقابلہ کیا جائے، یہ امیر خان سید صاحب کا معتقد و رفیق نہیں تھا، چونکہ اس کا بھتیجا سکھوں کا طرف دار اسی کی

ضد پر اس نے ایسا مشورہ دیا تھا۔

جنگ اکوڑہ

سید صاحب باحال تباہ چارسدہ میں ایک مہینہ قیام کر کے خویشگی تشریف لے گئے، ان کا لشکر پندرہ سو غازیوں پر مشتمل تھا، جس میں پانسو ہندوستانی، دو سو ستر قندھاری اور باقی ملکی و مقامی غازی تھے۔ اٹک سے تین میل خیرآباد ہے، وہاں سے پانچ میل جہانگیرہ روڈ ہے، پھر تین میل کے بعد شیدو ہے اور اس کے بعد اکوڑہ ہے، سید صاحب ۱۸ دسمبر ۱۸۲۶ء کو روانہ ہوئے، ۱۹ دسمبر کو ڈیرہ پھر دن چڑھے نوشہرہ میں داخل ہوئے، بدھ سنگھ اکوڑہ پہنچ چکا تھا، سید صاحب نے شب خون کی تیاری کی، اس پر بدھ سنگھ نے لکھا کہ اگر بہادر ہو اور سید ہو تو سامنے آ کر لڑو، مگر یہ اس کی چال میں کب آنے والے تھے، رات کے تین بجے جب سکھ کھلے میدان میں سو رہے تھے، شب خون مارا گیا، سکھ سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر بھاگ گئے، کامیابی سمجھ کر سرحدیوں نے مال لوٹنا شروع کر دیا، صبح ہوتے جب غازی واپس ہوئے تو سکھوں نے تعاقب کیا، سکھوں کا مالی و جانی نقصان بہت ہوا، غازی تیس کے قریب شہید ہوئے اور شاید اسی قدر زخمی ہوئے، سید صاحب کو اس کا بے حد رنج ہوا اور اس کو نقصان عظیم سمجھتے تھے، بدھ سنگھ بھاگ کر شیدو چلا گیا، سید صاحب نے اپنی پہلی کامیابی کا مژدہ ہندوستان کو لکھ بھیجا اور امیر دوست محمد خان کو بھی خوش خبری سنا دی (۱) اب اہل سرحد جوق در جوق بیعت کے لئے آنے لگے کیونکہ اس فتح سے اجنبی تسلط سے نجات کی امید ہو گئی تھی۔ (۲)

خاوے خان رئیس ہنڈ نے تعاون میں سبقت کی، اشرف خان رئیس زیدہ نے بھی بیعت کی، سید صاحب ہنڈ تشریف لے گئے اور اسے اپنا مرکز بنایا، اس سے پہلے نوشہرہ میں قیام تھا، سرحد والوں کی تعداد پانچ ہزار تک ہو گئی، ہندوستانی و قندھاری اتنے ہی رہے جتنے تھے، جوش و خروش میں معتد بہ ترقی ہوئی، مگر عملی تعاون کے لئے لوگوں نے قدم بہت کم اٹھائے۔ (۳)

۱۔ سوانح احمدی صفحہ ۱۰۲ ۲۔ "سید احمد شہید" از غلام رسول مہر ۳۔ ایضاً

جنگ خضرو بازار

عرض کیا گیا کہ خضرو بازار بڑی منڈی ہے، یہاں سے مال زیادہ ملنے کی امید ہے اس پر قبضہ کرلیا جائے، سید صاحب نے اس تجویز کو مناسب نہیں سمجھا کیونکہ جنگ اکوڑہ میں نقصان عظیم ہوا تھا، لیکن اجازت دی کہ تم لوگ اس شرط پر کہ کسی مسلمان کو گزند نہ پہنچے حملہ کر سکتے ہو، چنانچہ ملکیوں کے تیس چالیس قندھاری بھی ساتھ ہوگئے، قندھاریوں نے گڑھی پر قبضہ کیا اور سرحدیوں نے منڈی کو لوٹا، سرحدی سامان لے کر واپس آرہے تھے اور قندھاری پیچھے سے ان کی حفاظت کر رہے تھے تو پندرہ بیس سکھوں نے ان کا تعاقب کیا، قندھاری ان سے جٹ گئے، سرحدی بھاگ کھڑے ہوئے جن میں سے تیراک میں کچھ دریا غرق ہوگئے، اتنے میں پانسو سکھ آگئے، سید صاحب نے ملکیوں کو حکم دیا کہ قندھاریوں کی مدد کریں، ان کے ساتھ چند ہندوستانی بھی بغیر اجازت چل دیئے، غازیوں کو دیکھتے ہی سکھوں نے راہ فرار اختیار کی، غازی کشتیوں میں واپس آرہے تھے کہ سکھ پلٹ پڑے اور گولے پھینکے گئے، اب سید صاحب خود بہ نفس نفیس تشریف لے گئے، ان کو دیکھتے ہی سکھ ایسے غائب ہوئے جیسے شیطان لاحول سے بھاگ جاتا ہے، مال غنیمت کی تقسیم پر جھگڑا ہوا، خادی خان کے فیصلہ کو نہ سرحدیوں نے مانا نہ قندھاریوں نے، سید صاحب نے فیصلہ دیا کہ جو مال جس کے پاس ہے وہی لے لے، دو تین دن کے بعد تین ہزار سکھوں نے دریا پار آکر شاہمنین چلائیں تو اشرف خان کوان کے دفع کرنے کو کثیر لشکر کے ساتھ بھیجا، مگر گولوں کی شدت کی وجہ سے سرحدی نہ ٹھہر سکے، جب ملکیوں نے وسط دریا سے گولیاں ماریں تو سکھوں کو بھاگ جانا پڑا۔

سرحدیوں کی بے قاعدگیاں، دشمنیاں اور لوٹ مار کے مدنظر نظم جمعیت کی خاطر ۱۳ جمادی الثانی ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء کو ھنڈ کے تالاب کے کنارے سید صاحب کو امیر منتخب کیا گیا، یہ امارت محض تنظیم جہاد کے لئے تھی، اس کا ریاستوں کے انتظام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ آپس کے اختلافات کو دور کرنا اصل مدعا تھا، مگر اس کے پردے میں اختلافات نے اور بھی سر نکالا، جب یہ امارت ناقابل تسلیم ٹھہری تو سب سے پہلے

فتح خان نے سید صاحب کی امامت کی بیعت کی، پھر روساء پشاور نے بذریعہ تحریر قبول کی، لیکن وہ اس وجہ سے ناقابل اعتبار سمجھے گئے کہ رنجیت سنگھ سے بے حد دبے ہوئے تھے، بہرحال جب جمعیت اسی ہزار کی ہوگئی تو طے کیا گیا کہ نوشہرہ پر سکھوں سے مقابلہ کیا جائے۔

جنگ شیدو

شیدو میں سید صاحب یار محمد خان درانی کے یہاں مہمان ہوئے، صبح کو جنگ ہونے والی تھی، رات کے کھانے میں سید صاحب کو زہر دیا گیا، میدان میں جانے کے لئے شاہ اسماعیل صبح کو جب آئے تو سید صاحب کی حالت غیر تھی، اسی حالت میں سید صاحب میدان جنگ میں لے جائے گئے۔ ان کے پہنچتے ہی درانیوں اور سمہ والوں نے راہ فرار اختیار کی اور ساتھ چھوڑ دیا، بڑی مشکل سے سید صاحب کی جان بچا کر انہیں چندلئی لے جایا گیا، ساتویں دن جب افاقہ ہوا تو ارشاد فرمایا، یہ سب کچھ میری خطاؤں کی وجہ سے ہوا، تکلیف کے بعد اللہ راحت دے گا۔(۱) یہ صحیح ہے کہ یار محمد خان نے سکھوں سے سازش کر لی تھی لیکن مومنوں کی ہمتیں پست نہیں ہوئیں۔

اب سید صاحب نے بنیر اور سوات کا دورہ کیا اور خوب جوش کے ساتھ تبلیغ کی، ہندوستان کو داعی بھیجے، چترال، کشمیر اور بخارا کو بھی دعوت نامے لکھے، دو مہینوں کے بعد اوائل ذوالحجہ میں دہلی سے مولوی عبدالحی آگئے، اس دوران میں عسرت انتہاء کو پہنچ گئی تھی، مگر غازیوں نے دست سوال دراز نہیں کیا، البتہ امداد قبول کی، پنج تار کے فتح خان نے غلہ سے مدد کی، ہندوستانی قافلے اپنے ساتھ روپیہ بھی لاتے تھے پہلا قافلہ ۲۷/اپریل ۱۸۲۷ء کو چنگلئی میں آیا، اس وقت قندھاریوں کے علاوہ ساتھ سو غازی ہندوستان کے تھے، یہاں سے سید صاحب پنج تار گئے، پھر کچھ دن خیمہ میں قیام فرمایا اور جنوری ۱۸۲۹ء تک درانیوں کے خرخشے اور دغدغے کو دور کیا، شاہ چترال نے جو لڑکی نذر کی تھی اس کا نام فاطمہ تھا، زہر کا اثر دور کرنے کے لئے سید

۱۔ "سید احمد شہید" از غلام رسول مہر

صاحب نے اس سے نکاح کر لیا(۱) خیبر سے واپس آکر مستقل طور پر پنج تار کو مرکز بنایا(۲) یہ تبدیلی خادی خان کو ناگوار ہوئی، ہنڈ میں سکھوں کے حملے کا خوف رہتا تھا اس لئے مرکز کی تبدیلی ضروری سمجھی گئی تھی، ہر چند یہ تبدیلی بر بنائے مصلحت ہو مگر ضعف کی علامت سمجھی گئی، اس عرصہ میں شاندار تبلیغ کی وجہ سے دعوت جہاد کی قبولی و پذیرائی خوب ہوئی، جملہ خوانین نے اطاعت قبول کی اور سکھوں کے خلاف زبردست محاذ تیار ہو گیا۔ والی چترال نے گلگت کے راستہ سے مدد دینے کا وعدہ کر لیا، لہذا اپکھلی (ہزارہ) کی طرف جہاد کے امکانات قوی ہو گئے۔ (۳) سید صاحب کو اتنی کامیابی کی امید تھی کہ ستمبر ۱۸۲۷ء میں شاہ اسماعیل کو ہزارہ بھیجا، امب اور اگرور میں تبلیغ کر کے ہزارہ کو سر کرنے کی کوششیں کیں مگر کوئی صورت نہ نکل سکی(۴) صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ ڈمگلہ اور شنکیاری پر معرکے کیوں ہوئے، گڑھی میں حبیب اللہ خان کا لڑکا بند کر لیا گیا تھا، غازیوں کی آمد کی خبر سن کر سکھوں نے گڑھی سے محاصرہ اٹھا لیا اور حبیب اللہ خان کا لڑکا ان کی قید سے آزاد ہو گیا، ڈمگلہ کے شخصوں میں تقریباً چار سو ملکیوں نے علیحدگی اختیار کر لی مگر جب لشکر کے باہر سکھ نکال دیئے گئے تو علیحدہ ہو جانے والے ملکی آملے اور لوٹ مار میں شریک ہو گئے، اس کے بعد سکھ تیار ہو کر آئے تو مراجعت کرنا پڑی، شنکیاری میں کھیت کاٹنے کے لئے سکھ جا رہے تھے، شاہ اسماعیل نے حملہ کر دیا اور سکھ بھاگ گئے، اس حملہ میں شاہ اسماعیل [illegible] کو شہادت نصیب ہوئی، ہندوستان سے آنے والے قافلوں کو درانی دق کیا کرتے تھے لہذا شاہ اسماعیل بھیجے گئے تا کہ درانیوں سے ملاہمت کریں، چنانچہ شاہ اسماعیل نے جولائی ۱۸۲۷ء کو سلطان محمد خان کو خط لکھا اور ان کے شر کو دفع کر دیا۔

مولوی محبوب علی دہلی سے جہاد میں شریک ہونے کے لئے آئے مگر یہاں کے حالات دیکھ کر دل برداشتہ ہو گئے اور واپسی کی ٹھہرالی، ان کے ساتھ کچھ اور بھی مجاہدین بیزاری کی وجہ سے واپس ہوئے، اب سید صاحب نے سمہ اور خیبر کا دورہ کیا، پھر شعبان ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۸ء کو مولوی عبدالحی کا خیبر میں انتقال ہوا، اس عرصہ میں

۱،۲،۳،۴۔ "سید احمد شہید" از غلام رسول مہر

سید صاحب کو تنخواہ دار مجاہدین رکھنا پڑے، دو ماہ کے بعد ان کی تنخواہ دے کر انہیں برخاست کر دیا۔ خیمر میں قیام دسمبر ۱۸۲۸ء یا جنوری ۱۸۲۹ء تک رہا، درانیوں کی منافقت اور مخالفت دور کرنے کے لئے مئی ۱۸۲۸ء میں پیش قدمی کی گئی۔ اس جنگ تمازئی (عثمان زئی) میں وہاں کے رئیس کا لڑکا درانیوں سے ساز کر گیا، اس لئے غازیوں کو واپس آنا پڑا۔

دو سال بعد ۲۵ شعبان ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۳۹ء کو اقامت شریعت کی بیعت کا نسخہ ایجاد کیا گیا کہ یہاں کے لوگ شرع کی پابندی کریں اور بیعتوں کی تعمیل کو فرض سمجھیں، اس اجتماع میں علماء کے علاوہ فتح خان پنجتاری، اشرف خان (زیدہ) اور خاوی خان (ھنڈ) موجود تھے، انہوں نے اقامت شریعت کی بیعت بھی کی تھی، اس جدید بیعت کا اصل مقصد یہ تھا کہ شرعی احکام کو نفاذ ہو، اس طرح حکومت الٰہیہ کی بنیاد رکھ دی گئی، اس سے اختلافات کو اور بھی زیادہ ترقی ہوئی، شرعی احکام کی تعمیل ناروا سختیوں کے ساتھ کی گئی اور مصیبتوں میں اضافہ ہو گیا۔

نظام شرعی کے سلسلہ میں قصبہ مانیر کا جھگڑا طے کیا گیا، نوے برس ہوئے تو مانیر کے باشندوں کو نکال کر غاصبوں نے قبضہ کر لیا تھا، اب اس مسئلہ کو اٹھایا گیا، باشندوں کے طرف دار زیدہ کے اشرف خان تھے اور غاصبوں کے حمائتی خاوی خان ھنڈ والے تھے، شرعی فیصلہ ہوا کہ قدیم باشندوں کو حق دلایا جائے، یہ فیصلہ بزور شمشیر منوایا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اشرف خان اور خاوی خان میں ٹھن گئی، سید صاحب ان دونوں میں صلح نہ کرا سکے، آخر کار جب خاوی خان کو شکست دے کر اشرف خان اڑاتے ہوئے گھوڑے پر آ رہے تھے کہ سید صاحب کو خوش خبری سنائیں تو گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، راکب و مرکوب دونوں گرے اور اشرف خان جاں بحق ہو گئے، اشرف خان، خاوی خان کے خسر تھے، اشرف خان کی وراثت کا جھگڑا ابھی چونیوں بھرا کباب تھا، خاوی خان، اشرف خان کے لڑکے مقرب خان کے لئے کوشاں تھا، سید صاحب نے دوسرے لڑکے فتح خان کے حق میں فیصلہ کیا، اس فیصلہ کی وجہ سے خاوی خان سید صاحب سے منحرف ہو گیا اور میجر ونتورا سے سید صاحب پر اعتراض کروایا کہ آپ اس

ملک میں کیوں دخل انداز ہوتے ہیں، سید صاحب نے مولوی خیر الدین کی معرفت جواب دیا کہ یہ ملک خالصہ جی کا نہیں ہے بلکہ خدا کا ہے، اس گفتگو میں میجر اور مولوی میں تیزی پیدا ہوگئی، لڑائی کی نوبت آنے والی تھی مگر ونتورا اپنا اسباب تک چھوڑ کر بھاگ گیا، عام طور پر سمجھا یہی گیا کہ اقامت شریعت والی بیعت کے سبب دینی فضا خوشگوار ہوگئی ہے اور امن قائم ہو گیا ہے، لیکن خدا جانے واقعات کو کیا دشمنی ہے کہ اُن سے ان افسانوں کی تائید نہیں ہوتی۔

سید صاحب نے سکھوں کے قبضہ سے اٹک کو خالی کرانے کا وعدہ کیا تھا، تجویز یہ ہوئی کہ غازی برات کا جلوس بنا کر شہر میں داخل ہو جائیں اور تسلط جمالیں، اتفاق سے یہ راز فاش ہو گیا، کچھ غازی گرفتار کر لئے گئے اور کچھ نے بھاگ کر امان لی، اُن میں سید صاحب کو بد دستانی، شرعی احکامات کی تعمیل کے غلط نتائج دیکھ کر پنچتار میں ۶ فروری ۱۸۲۹ء کو علماء کا اجتماع ہوا اور طے ہوا کہ جو امام کے حکم سے سرتابی کرے گا، اسے باغی سمجھا جائے گا اور باغی کی سزا قتل ہے، اس تین ہزار کے مجمع میں سید صاحب نے جو خطبہ پڑھا وہ بصیرت افروز ہے، فرمایا کہ مجھ کو جناب باری سے ارشاد ہوا کہ دار الحرب ہند سے ہجرت کر کے دار الامان پنجاب میں جا اور کفار سے جہاد فی سبیل اللہ کر، ہندوستان میں اس لائق کوئی جگہ نہیں ملی، لوگوں نے کہا کہ ہندوستان میں جہاد کر، ہم ہر طرح سے مدد کریں گے اور سامان دیں گے، یہ مجھ کو منظور نہیں ہوا، اس لئے کہ جہاد موافق سنت کے ہونا چاہیے، ہمیں بلوہ کرنا منظور نہیں ہے۔ (۱)

اب کے ولایتیوں نے اپنے ملک کو پیش کیا کہ سب مسلمان شریک ہوں گے، رنجیت سنگھ نے مسلمانوں کو تنگ کر رکھا ہے، توہین اسلام کرتا ہے، اذان تک کی ممانعت کر رکھی ہے، مسجدوں میں گھوڑے باندھے جاتے ہیں اور گاؤ کشی بھی بند کر دی ہے، اس پر میں نے کہا کہ بہتر ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہیں چلیں اور مسلمانوں کو متحد کر کے کفار سے جہاد کریں، پھر علماء سے خطاب کیا کہ آپ نے ہمیں جگہ دی، بیعت امامت کی، آپ کے مشورہ کے مطابق جہاد کیا، اب آپ دست کش ہو

۱۔ ہندوستان میں جہاد کرنے کو بلوہ خیال کرتے ہیں، اس کے معنی یہ ہوئے کہ انگریز سے لڑنا نہیں تھا۔

رہے ہیں، اس کا سبب کیا ہے، اب شاہ اسماعیل نے جو تقریر کی اس کا خلاصہ یہ ہے،، "قصور آپ کا ہے، آپ اظہار حق میں مداہنت کرتے ہیں، ورنہ خرابی نہ ہوتی" یہ سنتے ہی خادی خان مجلس سے اٹھ کر چلا گیا، رات کو سید صاحب نے اسے بلا کر منانے کی کوشش کی، مگر اس نے بتایا کہ ان علماء کی گزر بسر اسقاط و خیرات پر ہے، وہ ہمارے تابع ہیں، انہیں کاروبار ریاست کا شعور نہیں ہے، لہٰذا ان کے مشورے قابل عمل نہیں ہوسکتے، اور آخر میں یہ بھی عرض کیا کہ آپ کا اصول میری سمجھ میں نہیں آتا، یہ سن کر سید صاحب کا چہرہ سرخ ہوگیا اور گفتگو ختم ہوگئی۔ خادی خان چاہتا تھا کہ مقرب خان کو اشرف خان کا وارث اور زیدہ کا حاکم بنایا جائے اور قصبہ مانیر پر اس کے حلیفوں کا حق تسلیم کیا جائے، لہٰذا وہ سیحبر و ستورا کو پنجتار پر حملہ کرنے کے لئے بلالایا، یہ خبر سن کر سید صاحب نے پنجتار میں مدافعت کی تیاری کی، چنانچہ مجاہدین نے موت کی بیعت اور رنگ برنگ کے جھنڈے دے کر سید صاحب نے اپنا سر ننگا کر کے دعا مانگی، خود ہتھیاروں سے اپنے آپ کو مسلح کیا، ستورا آیا مگر خفیف سی جھڑپ کے بعد واپس چلا گیا۔ اس جنگ پنجتار میں دو سکھ مارے گئے اور غازی محفوظ رہے۔

سید صاحب نے مفاہمت کی غرض سے خادی خان کو بلایا مگر وہ نہیں آیا، شاہ اسماعیل اس کے پاس گئے تو اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ میں سید صاحب کی ولایت کا قائل نہیں ہوں بلکہ ایک دنیا دار سمجھتا ہوں۔

سید صاحب اہل سمہ کی تلقین کے لئے گئے اور شاہ اسماعیل کو شرنگ کرنے کے لئے ننگی بھیجا، مگر ان کے ساتھیوں میں سے نصف سے زیادہ درانیوں سے مل گئے، اس لئے ناکام واپس ہونا پڑا، یہ واقعہ ۱۷ر جولائی ۱۸۲۹ء مطابق ۱۵ محرم ۱۲۴۵ھ کا ہے، یہاں اقامت شریعت کی بیعت پر اکثر لوگ تیار تھے مگر سرداران پشاور اور خادی خان نے انہیں باز رکھا، اس لئے ان مخالفین کو زیر کرنے کے لئے ہنڈ پر حملہ کی ٹھہرائی اور تجویز کی کہ رات کو ۲۵ غازی قلعہ کے دروازے کے قریب چھپ جائیں، صبح کو جب دروازہ کھلے تو اندر جا کر حملہ کر دیں، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، خادی خان سراسیمہ ہو

کر اپنے آدمیوں کو بلا رہا تھا کہ اس کے ایک گولی لگی اور اس کا کام تمام ہو گیا، غازیوں کی فتح ہوئی مگر اس کا مال اور روپیہ نہیں ملا، سید صاحب نے اس اہل وعیال کو معاف کر دیا اور مقرب خان کی سفارش پر امیر خان کو سردار ھنڈ بنا دیا۔ اور یہ فیصلہ شاہ اسماعیل کی مرضی کے خلاف تھا، خاوی خان کے انحراف وقتل کے متعلق علماء سرحد کا بیان اس سے مختلف ہے، ھنڈ سے مرکز ہٹا لینے کا اسے ملال اگر تھا تو اتنے عرصہ تک اس کی عقیدت مندی قائم نہیں رہ سکتی تھی اور نہ وہ اقامت شریعت کی بیعت کرتا، اصل یہ ہے کہ سوات کے حضرت اخون عبدالغفور صاحب کا وہ مرید تھا، اخون صاحب نے سوات و بنیر کے دورے کے زمانہ میں سید صاحب کی خاطر و تواضع کی تھی اور ہمنوائی و تائید بھی کی تھی، لیکن جب شاہ اسماعیل نے عدم وجوب تقلید کا اعلان کیا تو علماء سرحد ان سے علیحدہ ہو گئے، لہٰذا اخون صاحب کی تقلید میں خاوی خان نے بھی سید صاحب سے انحراف کیا اور یار محمد خان سے مل گیا، سید صاحب نے ان پر حملہ کیا تو یار محمد خان جاں بحق ہوا، یہ ستمبر ۱۸۲۹ء کا واقعہ ہے، اس طرف سے جب سید صاحب کو اطمینان ہو گیا تو کشمیر کی فتح کا منصوبہ گانٹھا۔

کشمیر میں اس وقت ترملا غیر محفوظ تھا، اس پر شاہ اسماعیل نے قبضہ کر لیا مگر دسمبر ۱۸۲۹ء میں ہری سنگھ نے واپس لے لیا، قیام پھبل میں سید اکبر شاہ نے خوب سمجھا دیا تھا کہ کشمیر والوں کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے، مگر سید صاحب نے امب کے سردار پائندہ خان سے تعلقات بڑھائے اور اس سے یہ طے کیا کہ وہ اپنے ملک سے راستہ دے گر شاہ اسماعیل جب بھیجے گئے تو کشمیر کے لئے اس نے راستہ نہیں دیا، اس لئے امب پر چڑھائی کرنا پڑی، عشرا اور کوٹلہ فتح کرنے کے بعد ۱۸۳۰ء میں یہ فیصلہ ٹھیرا کہ پائندہ خان نہ صرف راستہ دے گا بلکہ ہر قسم کی مدد بھی کرے گا اور بعد فتح کشمیر اسے مشرقی انڈس میں علاقہ دینے کے ساتھ کشمیر میں بھی جاگیر دی جائے گی، اس صلح سے پہلے شوال ۱۲۴۵ھ میں پھوسڑے پر سکھوں کے خلاف لشکر بھیجا گیا، اس زمانہ میں پائندہ

خان بچنے کے لئے ادھر ادھر بھاگتا پھرتا تھا اور اس نے حسب معاہدہ مدد نہیں کی، لہذا غازیوں کو شکست ہوئی، لیکن سکھ خود بخود میدان چھوڑ کر چلے گئے، اب پائندہ خان سے پھر صلح ہو جانے پر امب کو مرکز بنایا اور شرعی قانون جاری کیا گیا، طے ہوا کہ مشرقی سمت میں پیش قدمی کی جائے۔

سید صاحب کی کامیابیاں دیکھ کر رنجیت سنگھ نے وزیر سنگھ اور حکیم عزیز الدین کی معرفت صلح کا پیغام بھیجا کہ سید صاحب فقیر ہیں اور میں امیر ہوں، امیروں کو فقیروں کی خدمت کرنا لازمی ہے اور فقیروں کا فرض ہے کہ امیروں کے لئے دعا کریں، میں اپنی طرف سے ماورائے سندھ کا علاقہ نذر کرنے کو تیار ہوں، اس سے زیادہ مطالبہ سید صاحب کریں گے تو مثل دنیاداروں کے حریص سمجھے جائیں گے، اس پیغام کا جواب مولوی خیر الدین شیرکوٹی اور حاجی بہادر خان کی سفارت میں بھیجا گیا، لیکن یہ سفارت رنجیت سنگھ کے بجائے میجر ونتورا کے یہاں پہنچی، مولوی صاحب اور میجر میں جو گفتگو ہوئی وہ تاریخ میں یادگار رہے۔

میجر ونتورا: میں آپ سے کچھ علمی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

مولوی خیر الدین: (اس سے پہلی ملاقات میں کچھ تیز گفتگو ہوگئی تھی لہذا جواب دیا گیا) اگر دینی گفتگو منظور ہے تو خلاف امید جوابات پر کبیدہ نہ ہونا۔

میجر: میں یقین دلاتا ہوں کہ کبیدہ نہیں ہوؤں گا، لیکن جواب عالمانہ ہوں، سوقیانہ نہ ہوں۔۔۔۔ میں نے سنا ہے کہ خلیفہ صاحب کو اپنے یہاں ہر طرح کا عیش حاصل تھا۔

مولوی صاحب: ایسی ثروت و جاہ و جلال کو چھوڑ کر ایسی تکالیف سفر اختیار کرنا بلا کسی سبب کے نہیں ہے، اب آپ غور سے سنیں، وہ قوی سبب یہ ہے کہ دین اسلام میں بعد ایمان توحید کے پانچ احکام فرائض اور ضروری رکن

ہیں، ان کے ادا کرنے کی تاکید ہے، نماز، روزہ، زکوۃ، اور جہاد، جہاد کا ثواب سب سے زیادہ ہے، جہاد انبیاء اسرائیل پر بھی فرض تھا۔

میجر: بجا ارشاد ہے، مجھے معلوم ہے کہ جہاد کی اہمیت قدیم زمانہ سے ہے۔

مولوی صاحب: اب خلیفہ صاحب کی ذات مقدس مثلاً انبیاء سابقین مقبول بارگاہ ایزدی ہے۔۔۔۔ اس جہاد شاقہ کی دو شرطیں ہیں، ایک وجود امام اور دوسری جائے امن، قوم یوسف زئی سکھوں سے لڑتی رہتی ہے، لیکن ان میں اس قابل سردار رہنمائی کے لئے نہیں ہیں، اسی غرض کے لئے سید صاحب آئے ہیں، اس ملک کے لاکھوں آدمیوں نے خلیفہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت امامت کر لی ہے اور آپ کو یہ بھی جان لینا چاہیے کہ جہاد سے مطلب ملک گیری اور جنگ و جدال نہیں ہے بلکہ واسطے اعلاء کلمۃ اللہ و اطفاء نائرہ ادیان باطلہ اور کفار کی ذلت کے لئے کوشش کرنا ہے۔۔۔ جہاد سے اصل مطلب ترقی دین ہے اور فتوحات اس کا ثمرہ ہیں، مجاہدین کے فرائض قرآن شریف اور حدیث میں بہت ہیں۔

میجر: مجھے یہ سب باتیں قبول ہیں لیکن ایسی بے سروسامانی میں بادشاہوں سے لڑنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔

مولوی صاحب: دنیاداروں کو فوج و خزانہ اور اسباب پر اعتماد ہے اور ہم کو خدا پر بھروسہ ہے، ہمیں نہ جیتنے کی خوشی اور نہ ہارنے کا غم۔

میجر: میرے دل میں خلیفہ صاحب کی بے حد عظمت ہے۔۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے اور خلیفہ صاحب کے درمیان ارسال تحائف کی رسم جاری ہو جائے، پہلے میں ان کی خدمت میں ہدیہ بھیجوں گا، پتہ نہیں اس کے جواب میں وہ کیا تحفہ دیں گے، تا کہ یہاں سے جا کر اپنی اس عزت پر فخر کر سکوں، اس سلسلہ میں ملک یوسف زئی پر ان کا تصرف کرا دوں گا اور

خالصہ کی فوج پھر بھی خلیفہ صاحب کے خلاف حملہ نہیں کرے گی۔

مولوی صاحب: خلیفہ صاحب کو آپ کے اظہار عقیدت وعظمت کی پرواہ نہیں، اگر آپ کی کوئی غرض ہے تو سلسلہ جنبانی کیجئے، خلیفہ صاحب عالی حوصلہ اور صاحب ہمت ہیں، آپ کے تحفوں کے جواب میں اچھے سے اچھا تحفہ دیں گے۔

میجر: اگر سر بند وکلاہ یا اسلحہ سے مجھے نوازا تو ایسے تحفہ میرے کام کے نہیں، لیکن گھوڑا مرحمت فرمائیں تو ان کی ناموری اور میری سرخروئی ہو۔

مولوی صاحب: آپ کا مطلب اب میں سمجھا، ہم آپ کو گھوڑا کبھی نہیں دیں گے۔

میجر: یہ آپ اپنی طرف سے کہہ رہے ہو مگر میں سمجھتا ہوں خلیفہ صاحب سخی اور عالی حوصلہ ہیں وہ میری درخواست ضرور قبول فرمائیں گے۔

(پرچہ نویس حاجی بہادر شاہ خان اور حکیم عزیز الدین نے مولوی صاحب سے اشارہ کیا کہ میجر کی بات مان لیں۔)

مولوی صاحب: یہ بات وہ مان سکتا ہے جو ملک وجاگیر کا خواہش مند ہو، ایسی نیت وارادہ سے جہاد کا ثواب باطل ہو جاتا ہے۔

بہر حال جب میجر ونتورا نے گھوڑے کے لئے اصرار کیا تو مولوی صاحب نے فخر یہ فرمایا! گھوڑا تو گھوڑا ہے ہم آپ کو گدھا بھی نہیں دیں گے، انہیں تو آپ کی سرکار سے جزیہ لینا ہے۔

میجر: یہ آپ کا محض وہم ہے، اگر آپ نے خالصہ جیسی سرکار کو زیر کر کے جزیہ لے لیا تو میں حتمی وعدہ کرتا ہوں کہ مسلمان ہو جاؤں گا۔

مولوی صاحب: اگر مسلمان ہونا چاہتے ہو اور آپ کی یہی شرط ہے تو آپ خلیفہ صاحب سے مل لیں، ان کو دیکھتے ہی آپ مسلمان ہو جائیں گے۔

میجر: (مولوی صاحب کی فہم وفراست کو سمجھ کر) خیر دیکھا جائے گا، مہربانی کر کے میری درخواست کا جواب خلیفہ صاحب سے بمقام حضرو بھجوادیں۔

مولوی صاحب: میں خلیفہ صاحب سے عرض کروں گا، جواب دینا ان کی مرضی پر منحصر ہے۔

میجر: معاف فرمائیے گا، آپ کے نزدیک سکھ کافر ہیں اور ہم نصرانی بھی کافر ہیں، تو ہم دونوں کے کفر میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟

مولوی صاحب: کفر میں دونوں برابر ہیں۔

میجر: ہندوستان پر انگریز نصرانی مسلط ہیں تو خلیفہ صاحب ان سے جہاد کیوں نہیں کرتے؟

مولوی صاحب: انگریزی سرکار ہم کو دینی فرائض ادا کرنے سے منع نہیں کرتی اور سکھ مانع ہیں، اس لئے ہم ان سے جہاد کرنے آئے ہیں۔(۱)

یہاں سے جا کر مولوی صاحب نے سید صاحب کو جملہ احوال سے مطلع کیا، انہوں نے ارشاد فرمایا: شاباش! جزاک اللہ تمہارے جوابات میری مرضی کے مطابق ہیں، گھوڑے اور گدھے کی بات سن کر محظوظ ہوئے اور فرمایا کہ آپ نے اچھا کیا کہ ارسال جواب کا وعدہ نہیں کیا۔(۲)

اس گفتگو کے متعلق ''جماعت مجاہدین'' کے صفحہ ۱۵۶ پر جناب مہر صاحب نے یہ رائے قائم کی کہ مولوی صاحب نے اچھے انداز میں مسائل کی توضیح فرمائی اور تاریخی حوالوں سے اپنے موقف کو ثابت کیا، پھر ''سید احمد شہید'' کے اکیسویں باب

ا۔ مگر شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے فتویٰ میں لکھا ہے: اگر بعضے احکام اسلام کی مثل جمعہ عیدین، اذان اور ذبیحہ بقر کے تدارک نہ کرتے ہوں لیکن اصل اصول ان کے نزدیک (یعنی انگریزوں کے) غلط و بیکار ہے۔ (فتاویٰ عزیزیہ جلد اول صفحہ ۱۷) اس فقرے میں انگریزوں کے ہی نہیں بلکہ سکھوں کے وحشیانہ وظالمانہ طریقے پر بھی توجہ فرمائی ہے۔)

۲۔ منقول از سوانح احمدی اور مہر صاحب کی سید احمد شہید، باب اکیسواں

کے آخر میں رقم طراز ہیں: "یہ گفتگو ۱۸۳۰ء میں ہوئی تھی، یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ونتورا جب پہلی مرتبہ مولوی خیر الدین سے مل چکا تھا تو اس ملاقات کا حوالہ کیوں نہیں دیا، اس کے متعلق یہی خیال ہے کہ یہ فروگذاشت راوی سے ہوئی، جس نے صرف خاص مطلب بیان ضروری سمجھا، مگر مہر صاحب یہ نہ بتا سکیں گے کہ مولوی صاحب نے تاریخی حوالے کون سے دیئے تھے اور انہوں نے توجہ نہیں فرمائی کہ ونتورا نے پہلی ہی ملاقات کے متعلق بتایا تھا کہ جوابات عالمانہ ہوں اور سوقیانہ نہ ہوں، اب راوی کو ملزم بنانا مہر صاحب کی زیادتی ہے یا ان کی خوش مذاقی ہے، مولوی صاحب کی گفتگو اور سید صاحب کی پسندیدگی پر کسی کو چوں وچرا کرنے کا حق نہیں ورنہ کافر گردد کی مثل صادق آئے گی، بہر حال اس گفتگو اور تصدیق سے اور کچھ نہیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سید صاحب کا انگریزوں سے جہاد کرنے کا خیال کبھی ہرگز نہیں تھا، لہذا سید صاحب کے وہ خطوط جن میں انگریزوں سے جہاد کرنے کا ذکر ہے جو شاہ بخارا اور راجہ صاحب سندھیا کو لکھے ہیں وہ بربنائے مصلحت ہی ہو سکتے ہیں، مولوی خیر الدین نے رنجیت سنگھ کی پیش کردہ شرائط صلح کو مسترد کر دیا لیکن اپنے شرائط کیوں نہیں بتائے اور محض جہاد کی تعریف کر کے رہ گئے، ارشاد قرآنی ہے کہ جہاد کے دوران میں اگر کفار صلح کرنا چاہیں تو کر لینی چاہیے۔ اس کے علاوہ تقاضائے سیاست بھی یہی تھا کہ صلح کر لی جاتی، پھر سید صاحب اور سکھ دونوں مل کر انگریزوں کی خبر لیتے، ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں پادری صاحبان لوگوں کو زبردستی عیسائی بنا رہے تھے اور انگریز مسلمانوں کا ہی نہیں کل ہندوستان کا خون چوس رہا تھا۔"

یار محمد اور خادی خان کے مارے جانے کے بعد سید صاحب کے یہاں عید منائی جا رہی تھی جس کی وجہ سے سلطان محمد خان پر بری بنی تھی، آخر کار اپنی ماں کی ہدایت سے مجبور ہو کر اسے ہنڈ پر حملہ کرنا پڑا، اس زمانہ میں سید صاحب کھبل میں قیام پذیر تھے اور کشمیر فتح کرنے کی تدابیر سوچ رہے تھے، ہنڈ فتح کر کے سلطان محمد خان نے امیر خان کے سپرد کر دیا اور خلاف معاہدہ غازیوں کو قید کر کے چارسدہ بھیج دیا، مگر

غازی دیوار میں نقب لگا کر سیدھے سید صاحب کی خدمت میں پنجتار پہنچ گئے، جب پنجتار سے امب تک کے علاقہ پر سید صاحب کا تسلط ہو گیا تو سلطان محمد خان اور پائندہ خان نے سکھوں سے ساز کر کے سید صاحب کی مخالفت کی، لہٰذا سید صاحب مورچوں کی مرمت کروانے لگے اور شاہ اسماعیل کو بار بار لکھا کہ مستورات کو یہاں سے لے جا کر ستھنہ پہنچا دیں، انہوں نے جواب دیا کہ اگر مستورات اور خصوصاً آنجناب کے حرم محترم کو امب سے ستھنہ پہنچانے سے شوکت اسلام کو ضرر پہنچا تو خدا کے یہاں آپ جوابدہ ہوں گے، یہ بھی یقین رکھیے کہ جب تک سو غازیوں کے سر نہیں کٹ جائیں گے، خدا نخواستہ آپ کے حرم تک نوبت نہیں آئے گی، سید صاحب نے اس تحریر پر فرمایا کہ میرے بھائی سید احمد علی کی طرح سچی بات کہنے میں میاں صاحب بھی مراعات ادب کی پرواہ نہیں کرتے، مگر مہر صاحب سید صاحب کے اس شبہہ کی تکذیب کرتے ہیں کہ اس تحریر میں مراعات ادب کے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔(۱)

عشر وصول کرنے کے لئے عمال مقرر کر دیے گئے، سب نے اسے قبول کیا مگر ہوتی مردان کے احمد خان نے عمال کی تقرری پر اعتراض و اختلاف کیا، لہٰذا سید صاحب کے عتاب سے بچنے کے لئے اس نے گڑھی چھوڑ کر پشاور میں پناہ لی۔

سلطان محمد خان ھنڈ فتح کرنے کے بعد پنجتار پر حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن پائندہ خان اس سے علیحدہ ہو کر ہزارہ چلا گیا، لہٰذا ارادہ ترک کرنا پڑا مگر بعد کو احمد خان کی تقویت پر جب حملہ کیا تو مہیار پر شکست ہوئی۔

ہوتی پر تسلط جمانے کے بعد مفاہمت کے لئے سید صاحب نے سلطان محمد خان کو خط لکھا، اس نے جواب میں لکھا کہ تم مصنوعی فقیر ہو، ہم نے تمہارے قتل کی ٹھان لی ہے اور تمہارے ناپاک وجود سے ہم اپنے ملک کو بچانا چاہتے ہیں، اس جواب کے بعد لڑائی ناگزیر تھی، مہیار پر سلطان محمد خان کے خلاف مردان والوں سے تصفیہ کر لیا اور شرط یہ ٹھہری کہ سید صاحب کا لشکر گڑھی کے باہر ٹھہرے اور امیر المومنین گڑھی

۱۔ سید احمد شہید، ص ۳۳۱

میں قیام فرمائیں، مگر جب تورو سے سید صاحب یہاں آئے تو مع لشکر کے گڑھی میں داخل ہو گئے، مردان والوں نے اس کی شکایت شاہ اسماعیل سے کی تو شاہ اسماعیل نے سید صاحب کے پاس جا کر فرمایا کہ جناب خود خلاف شرع امور کے مرتکب ہوتے ہیں۔۔۔ لشکر کو باہر میدان میں ٹھہرنا چاہئے تھا، آپ پیرزادوں کے قافلہ کی طرح گڑھی میں کیسے گھس آئے، حاضرین کو شاہ صاحب کا یہ طرز کلام پسند نہیں آیا تو شاہ اسماعیل نے اپنی سخت کلامی کی معافی مانگی، اس پر سید صاحب نے اقرار کیا کہ مجھے معاہدہ کی خبر نہ تھی ورنہ مع لشکر کے اندر نہ آتا۔(۱)

تورو کے قیام میں سید صاحب کو جو گوشت کھانے میں دیا گیا وہ کچھ جل گیا تھا، سید صاحب نے نہیں کھایا، دال پر گزر کی اور گوشت پکانے والے کو خطابات از قسم مردود وغیرہ مرحمت فرمائے، میاں نظام الدین کے ٹوکنے پر اقبال کیا کہ بے اختیاری میں منہ سے یہ الفاظ نکل گئے اور گوشت پکانے والے میاں عبد اللہ سے معافی مانگی (۲)

سلطان محمد خان کی منافقت کی وجہ سے سید صاحب پشاور پر حملہ کیا، راہ میں ہر جگہ استقبال ہوا اور پشاور فتح کر لیا، سلطان محمد خان کے وکیل ارباب فیض اللہ خان نے سید صاحب سے سلطان محمد خان کو معافی دلوائی تو امارت شرعیہ کا انتظام اسی کے سپرد کر دیا۔ سلطان محمد خان کی بحالی کے ہر شخص خلاف تھا اور خود بھی سید صاحب صحیح نہیں سمجھتے تھے۔(۳)

بہر حال یہ سب انتظام کر کے سید صاحب پنجتار کو تشریف لے گئے اثناء راہ میں گڑھی امان زئی (عثمان زئی) کے بالا خانہ پر قیام فرمایا، ایک لڑکا تحفہ میں کچھ پھل لایا تھا اور لکڑی کی سیڑھی پر کھڑے کھڑے زیادہ انعام کی درخواست کر رہا تھا، جس کی وجہ سے راستہ مسدود ہو گیا تھا، شاہ اسماعیل نے ہٹانے کی کوشش میں اس کے چند طمانچے رسید کئے، اتفاق سے ایک مرتبہ وار خالی گیا اور سیڑھی کی ایک کیل ان کے ہاتھ میں چبھ گئی جس کی وجہ سے خون نکلنے لگا۔ سید صاحب نے سبب دریافت کیا تو نشی

ا۔ سید احمد شہید، ص ۲۶۴، ۲۔ سید احمد شہید ۳۔ سید احمد شہید صفحہ

محمد انصاری نے شاہ اسماعیل کے اس جہاد کی پوری روئیداد سنادی تو سید صاحب نے فرمایا کہ ان دنوں میاں صاحب کا غصہ تیزی پر ہے، اسے دور کرنا چاہیے، اس پر منشی محمد انصاری نے کہا کہ مولانا عبدالحی کو جب غصہ آتا تھا تو وہ جادہ شرع سے نہیں ہٹتے تھے، لیکن شاہ اسماعیل نے اس کی توجیہ فرمائی۔۔۔ ان کا غصہ آورد تھا۔۔۔ اور میرا غصہ آمد ہے، جب آتا ہے تو عقل وہوش پر غلبہ کر لیتا ہے۔ زبان کیا کسی عضو پر قابو نہیں رہتا۔

یہ آخری فقرہ وضاحت کی جان ہے، مہر صاحب نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ شاہ صاحب حقانی وربانی آدمی تھے، اس لئے اپنے عیوب کا اقرار کر لیتے تھے۔(۱) یہ تشریح فصاحت کے ساتھ ظرافت بھی رکھتی ہے، قرباِنش شوم، بروز محشر پیش داور مولانا مہر کی تشریح وتاویل کا معاملہ کہاں تک پہنچے گی پنبہ کجا کجا نہم۔

فتح پشاور کے بعد راوی یوں لکھتا ہے، لہذا سکھوں کی مزاج پرسی کرنے کا یہ بہترین موقع تھا، مگر قضاء وقدر اور شامت اعمال کو کیا کہا جائے، عمال اور قاضیوں کی نفسانیت بروئے کار آئی، عشر کی وصولی کے لئے بے حد زیادتیاں کی گئیں، شادی شدہ کنواریوں اور بیواؤں کے زبردستی نکاح پڑھوا دیئے گئے، اس سے پہلے یہاں کی عورتیں سمجھتی تھیں کہ سید بادشاہ کے غازی اولیاء ہیں، اب وہ سمجھیں کہ اولیاء بے قید ہیں، مرد وزن ان سے پناہ مانگنے لگے، اپنی عزت وناموس کو برباد ہوتے ہوئے دیکھ کر ان اولیاء بے قید کے خلاف سازش گانٹھی جانے لگی، سید صاحب کو متعدد مرتبہ اس سازش سے آگاہ کیا گیا مگر سمجھا دیا گیا کہ مجاہدین کفار وشیاطین سے مقابلہ کرنے کے لئے سینہ سپر رہتے ہیں، ان کے قدم جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹ سکتے اور شیطان انہیں نہیں بہکا سکتا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز فجر پڑھتے میں مجاہدین کو فردوس بریں کا رستہ دکھا دیا گیا، انا للہ و انا الیہ رٰجعون۔ (۲) جب پشاور میں یہ واقعہ ہو گیا تو طوطے ہرن ہو گئے اور زبان فیض ترجمان گویا ہوئی کہ "ہم ابتداء میں یہاں آئے تھے تو ان لوگوں کے

ا۔ سید احمد شہید صفحہ ۲۸۵ ۲۔ "سید احمد شہید" از غلام رسول مہر

عادات وحالات سے واقف نہیں تھے، وعظ ونصیحت کا اثر نہ ہوا تو حاکمانہ فہمائش سے
کام لیا، مگر یہ بھی غلط فہمی، اجراء دین کے علاوہ ہمارا کچھ اور مدعا نہ تھا۔۔۔اب ہم
وہاں جا کر مقیم ہوں گے جہاں صادق القول ہوں گے۔"(1)

نہایت سچائی سے سید صاحب نے حقیقت واقعی کا اقرار کر لیا، مگر ان کی
سادگی و معصومیت نے ان کے ابتدائی دعووں اور پیش گویوں کو فراموش کر کے الزام
یہاں والوں کے سر تھوپ دیا، ناکامی و پشیمانی کا ثبوت یہ ہے کہ سب کو بیعت کے
بندھن سے آزاد کر دیا اور اعلان فرمایا کہ مجھے ان لوگوں سے ایسی نفرت ہے جیسے کسی کو
قئے سے ہو، لہٰذا یہاں سے ہجرت کرنا ضروری ہے، فتح خاں سے کہا کہ یہ لوگ کلمۂ
توحید عادۃً پڑھتے ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اپنے دل کی دوا کریں تا کہ کلمہ گویوں کی
طرف سے شک زائل ہو جائے، یہ فقرے جذباتی تھے اور ان کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں،
وقت وداع آخری خطبہ میں نصیحت کی کہ ہمارے ساتھ وہی آئے جو تکالیف پر مالک
کے خلاف حرف شکایت زبان پر نہ لائے، ایسا نہ ہو کہ تکلیف کی صورت میں کہا جائے
کہ سید نے دھوکہ دیا، پھر وصیت فرمائی کہ ہم سے جدا ہو جانے والے بھائیوں کو
خراسان یا ہندوستان یا دوسرے ممالک میں نہیں بسنا چاہیے بلکہ عرب کے سوا اور کہیں
توطن اختیار نہ کریں، اگرچہ عرب بھی بدعات سے خالی نہیں ہے، سب سے آخر میں
شاہ اسماعیل سے سرگوشی کی کہ آپ قرآن پاک کی تلاوت فرمائیں اور میں مراقبوں
میں مشغول رہوں گا، یہاں تک کہ ہم ایسے مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے جہاد کا انتظام
ہو سکے، دیوانہ بہ کار خویش اسی کو کہتے ہیں، چو میر دھتلا میر د چو خیز دھتلا خیزد۔

یہاں سے رخصت ہو کر دامن کوہ میں پہنچے، جنوری ۱۸۳۱ء کی ابتداء میں راج
دواری میں قیام فرمایا اور ہمراہیوں سے اس امر پر بیعت لی کہ خواہش نفسانی وغیرہ میں
مسلمان بھائیوں کو مقدم رکھیں اور مقام تکلیف میں اپنے آپ کو مقدم سمجھیں، سب
نے بیعت کی مگر شاہ اسماعیل نے بیعت سے انکار کر دیا کہ وہ اس شرط کو نباہ نہ سکیں گے،

1۔ "سید احمد شہید" از غلام رسول مہر

دراصل یہی جواں مردی کی بات ہے کہ صاف انکار کر دیا۔

۵ ذی قعدہ کو اتوار کے دن بچوں سے جماعت کے ساتھ چلے اور اپریل ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ پہنچے، اب ان کی طبیعت میں تغیر واقع ہوا، تفویض و توکل کا رنگ نمایاں ہوا اور تدبیروں سے دل چسپی نہیں رہی، اتنے میں شیر سنگھ نے بالاکوٹ کا محاصرہ کر لیا اور سید صاحب کے کسی فرشتہ صفت مجاہد نے گڑھی میں داخل ہونے کا خفیہ راستہ اسے بتا دیا۔ ۶ مئی ۱۸۳۱ء مطابق ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو سید صاحب مسجد زیریں میں اطمینان و محویت کے ساتھ مصروف عبادت تھے، لیکن شیر سنگھ نے جب حملہ کیا تو یکدم تکبیر پڑھتے ہوئے چل پڑے اور دلدل میں چھلانگیں مارتے ہوئے جا رہے تھے کہ ایک پہاڑی پر پہنچ کر نظروں سے اوجھل ہو گئے نہ بصارت کو نظر پڑے نہ بصیرت کو دکھائی دیئے، اب جس کا جیسا جی چاہے ویسا ہی قیاس کر لے، کسی نے کہا کہ توپ کا گولہ اڑا لے گیا، کوئی سمجھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان پر چڑھا لئے گئے، بعض نے قیاس کیا کہ کسی بگڑے دل غازی نے تلوار کے گھاٹ اتار کر دلدل میں دبا دیا اور خوش عقیدہ اصحاب نے وثوق سے کہا کہ پھر نمودار ہونے کے لئے پردہ فرما لیا ہے، پروفیسر فری لینڈ ایبٹ کی تحقیق ہے کہ لاش پہچان لی گئی تھی اور نذر آتش کر دی گئی تھی، یہ بھی شہرت ہے کہ شیر سنگھ نے سید صاحب اور شاہ اسماعیل کی لاشوں کو دوسرے دن اچھی طرح شناخت کروانے کے بعد عزت کے ساتھ دفن کروا دیا تھا، اب شاہ اسماعیل کی قبر بالاکوٹ میں موجود ہے اور سید صاحب کی قبر مشتبہ ہے۔ (۱) شاہ اسماعیل کی قبر پر لوگ نسوار چڑھا کر مرادیں مانتے ہیں حالانکہ شاہ صاحب قبر پرستی کے سخت مخالف تھے۔ (۲)

نتیجہ قدرت کے اختیار میں ہے مگر مرد آخر بیں مبارک بندۂ ایست، لہذا یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس ناکامی یا کامیابی کے اسباب کیا ہوئے، سید صاحب کے سوانح نگاروں کے بیان لکھ دیئے گئے، اب دوسروں کی رائے بھی دیکھنا چاہیے، مولانا

۱۔ حیات طیبہ ۲۔ موج کوثر صفحہ ۲۱ کا نوٹ

ابوالکلام آزاد صاحب نے اپنے والد سے سن کر جو حالات لکھے ہیں، ان میں اہمیت ہے۔(۱) مولانا کے والد کی روایت ہے کہ جب شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی جائیداد اپنے عزیزوں میں تقسیم کردی۔۔۔اور مولوی اسماعیل کے لئے کچھ بھی نہ رہا تو دنیا کی طلب ان کے دل میں سمائی اور یہ ڈھنگ نکالا کہ پیری مریدی کا نیا کارخانہ جمایا جائے، سید احمد بریلوی ٹونک کی فوج میں ایک ان پڑھ سپاہی تھے، سازش کر کے انہیں پیر بنایا، مولوی عبدالحی جو شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کے داماد تھے وہ بھی اس کے محروم رہ جانے سے برداشتہ خاطر تھے، شریک سازش ہو گئے اور صورت یہ قرار دی کہ خدا کی دین میں کسی کا کیا لینا دینا ہے، ہم نواسے اور داماد تھے مگر محروم رہ گئے اور شاہ صاحب کا تمام باطنی فیض ٹونک کے اس سپاہی کو مل گیا، آدمی یعنی مولانا اسماعیل شہید ذہین ولسان تھے، بہت جلد لوگوں میں غلغلہ مچادیا، لوگوں نے جب دیکھا کہ ایک معمولی ان پڑھ آدمی کو شاہ صاحب کے نواسے (۲) نے پیر مان لیا ہے، اس کی پالکی پکڑ کر جوتی بغل میں داب کر دوڑتا ہے اور اعلانیہ اپنی محرومی اور ان کے فیضان کا اقرار کرتا ہے تو اس سے لوگوں میں بڑا رنگ جما اور ہر طرف سے چاندی سونے کی بارش ہونے لگی، اس زمانہ میں ''صراط مستقیم'' لکھی اور اس میں سید احمد کو ولایت سے بڑھا کر نبوت تک پہنچا دیا اور ساری باتوں میں آنحضرت ﷺ سے تشبیہ دی، گویا پورا آنحضرت ﷺ کی ریس اور مقابلہ کر دکھایا، مہر میں ''احمد'' نقش کرایا، لوگوں سے کہتے کہ جو شخص مرید ہوتا ہے اسے فوراً کشف و مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے، لوگ اس شوق میں آتے اور مرید ہو جاتے، چالاکی یہ تھی کہ ڈیوڑھی پر مولوی اسماعیل موجود رہتے، وہ نو واردوں کے کان میں کہہ دیتے کہ جو شخص صدق دل سے مرید ہوتا ہے، ان کی پہلی ہی توجہ میں فائزہ المرام ہو جاتا ہے، ہاں جو شخص خدانخواستہ ولد الزنا ہو اسے خبث ولادت کی وجہ سے کچھ بھی نظر نہیں آتا، اب وہ غریب جاتا ہے اور مرید ہونے کے بعد نکلتا ہے تو نظر تو اسے خاک نہیں آیا تھا، لیکن وہ سوچتا ہے کہ اگر کہتا ہوں

۱۔ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی، صفحہ ۳۵۴ ۲۔نواسے کے بجائے بھتیجا ہونا چاہیے۔

کہ کچھ نظر نہیں آیا تو سب ولد الزنا کہیں گے، اس ڈر سے وہ کچھ نہ کہتا اور جب لوگ مبارک، مبارک کی صدائیں بلند کرتے تو سر جھکا کر خاموش رہ جاتا، اس طرح جب خوب رنگ جم چکا تو اب موقع آیا کہ جو اصل شیطنت اس کارخانہ سے مقصود تھی اسے عمل میں لایا جائے، وہ کیا تھی، یہ بھی ایک مشکل کہانی ہے، یہ گویا ہندوستان میں وہابیت کی تولید وشیوع کی تاریخ قرار دی گئی تھی اور زیادہ تر مقصود اس سے یہ تھا کہ ہندوستان کی وہابیت کا شجرہ نسب بآسانی نجد کی وہابیت سے ملا دیا جائے۔

جب دیکھا کہ دین جدید کی مخالفت کی وجہ سے پیری مریدی کا رنگ پھیکا پڑنے لگا ہے اور علماء اہل سنت کی مقاومت روز بروز بڑھتی جاتی ہے تو جلب زر کی نئی راہ پیدا کر لی اور لوگوں کی توجہ فتنے کی طرف سے ہٹانے کے لئے جہاد کا غلغلہ بلند کیا اور سید احمد کی امامت کا اعلان کیا، اس پر خوب حسن برسنے لگا، جوق در جوق احمق دام میں پھنسنے لگے، ہزاروں روپیہ کی ہنڈیاں آنے لگیں، اور مجاہدین کا غول لے کر سکھوں سے لڑنے کے لئے روانہ ہوئے، سکھوں سے کیا لڑنا تھا خود مسلمانوں کو مشرک و بدعتی بنا کر دین جدید کا فتنہ پھیلانا تھا، سرحد پہنچ کر خود مسلمانوں سے لڑنا شروع کر دیا، آخر کار جب غیرت مند سرحدی جوش میں آئے اور سلطان محمد خان غیرت دینی سے آمادۂ مقابلہ ہوا تو جان بچا کر بھاگنا چاہا مگر اس نے مہلت نہ دی اور سب کا قلع قمع کر دیا، مریدوں نے سوچا کہ پیروں کا قتل خود مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہوا ہے اور جہاد و شہادت کی جگہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہلاکت ہوتی ہے، اب کس طرح بات بنانی چاہیے، تب یہ سازش کی کہ سکھوں سے لڑائی کا بہانہ گھڑا، اور مسلمانوں کو لوٹنے کے لئے مشہور کر دیا کہ سکھوں سے لڑتے ہوئے میدان جہاد میں سید احمد اور مولوی اسماعیل شہید ہوئے، لیکن وہ اب پھر زندہ کئے جائیں گے اور بھیجے جائیں گے تاکہ سکھوں سے پنجاب کو نجات دلائیں، چنانچہ کچھ دنوں بعد سرحد کے ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھال میں بھوسہ بھر کر ایک ڈھانچہ تیار کیا گیا اور سید احمد کے کپڑے پہنا کر مشہور کیا

کہ وہ زندہ و سلامت مشغول مراقبہ ہیں اور اس طرح اپنی دکان جمالی۔"

اپنے والد کا یہ بیان لکھنے کے بعد مولانا ابو الکلام آزاد صاحب نے اپنے عقیدے کے مطابق لکھا ہے کہ بلاشبہ ان کی شہادت کے بعد سرحد کی مقیم جماعت میں بعض غلاۃ اس قسم کے وہم میں پڑ گئے تھے ۔۔۔۔ کہ بعض عزم و جوش کے کلمات کو بطور پیش گوئی کے قرار دیں اور اس کی تکمیل کے لئے ان کی رجعت کا عقیدہ تراشیں ۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید مولوی ولایت علی صادق پوری ان دو وہموں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ایک رجعت، دوسرے روایات ظہور مہدی کا ان پر انطباق، لیکن یہ ایک محدود جماعت کا خیال تھا۔۔۔۔ یہ بھی مشہور ہے کہ چند چالاک دنیا پرست آدمیوں نے اپنی ذاتی اغراض سے واقعی ایک پتلا بنایا تھا، لیکن اس کارروائی کی حقیقت بہت جلد کھل گئی، ایسے واقعات ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔

مولانا فضل رسول بدایونی صاحب کے متعلق مشہور کیا جاتا ہے کہ وہ انگریزوں کی ملازمت میں تھے، انہیں سید صاحب کی مخالفت کرنے کے لئے وظیفہ ملتا تھا، مگر اسی قسم کا الزام مولوی عبد الحی پر عائد ہو سکتا ہے کیونکہ وہ بھی میرٹھ میں انگریزی ملازم تھے اور انگریزوں نے ان کے ذریعے اپنی بلا یہاں سے پنجاب میں بھجوائی تھی، مولانا فضل رسول نے مولانا خیر الدین کے بیان کی ہی تائید کی ہے اور اس کے علاوہ جو باتیں لکھی ہیں وہ ان کی چشم دید ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ شاہ اسماعیل کے نئے عقائد کی وجہ سے شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دیکھنے والے ان سے دست و گریبان ہو گئے، مولوی مخصوص اللہ، مولوی موسیٰ اور صاحبزادگان شاہ رفیع الدین نے شاہ اسماعیل کے خلاف فتوے لکھے، حضرت مولوی فضل حق خیر آبادی نے شاہ اسماعیل کا ابطال کیا، شاہ اسماعیل صبح کے وقت منگل کے دن ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۳۵ھ کو جامع مسجد میں وعظ فرما رہے تھے، ایک استفسار مرتب کیا گیا، جس پر مولوی فضل حق، مولوی مخصوص اللہ، مولوی موسیٰ، مولوی محمد شریف، مولوی عبد اللہ اور اخون شیر محمد صاحبان

کے دستخط تھے، مولوی عبدالحی اسے دیکھ کر قائل ہو گئے اور شاہ اسماعیل غصہ سے مغلوب ہو کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، ہزاروں آدمی اب اس عقیدے سے تائب ہوئے، اب جہاد کا نعرہ شروع کیا اور ایک جماعت کے ساتھ بغرض جہاد افغانستان کو گئے، سید احمد کو امیر المومنین بنایا اور پیش گوئیاں مشہور کیں کہ فلاں تاریخ رنجیت سنگھ مارا جائے گا، فلاں دن فلاں ملک فتح ہوگا اور فلاں سال عید کی نماز لاہور کی جامع مسجد میں امیر المومنین پڑھیں گے، اللہ کا یہی حکم ہوا ہے اور لڑائی میں امیر المومنین سکھوں کی توپوں اور بندوقوں کا منہ بند کر دیتے ہیں، کچھ افغان داخل بیعت ہوئے لیکن مقابلہ کے وقت جان بچا کر علیحدہ ہو گئے، پنجتار کا رئیس فتح خاں اور سب افغان تعظیم سے پیش آئے، سب نے جہاد کی بیعت کی، خراج بھی دیا، عامل و حاکم مکانوں پر مقرر کر دیئے گئے اور امیر المومنین کا حکم جاری ہو گیا، جو شرکت جہاد سے معذور تھے انہوں نے عورتوں کے زیور سے مدد کی۔ ۔۔۔ مولوی اسماعیل خوشی میں بے آپ ہو گئے، دین جدید کی تبلیغ کی گئی، سید صاحب کے نام میں "صلی اللہ علیہ وسلم" جوڑا گیا، سکہ میں اسمہ احمد لکھوایا، ان کے بزرگ شروع سے شاہ اسماعیل کی بے قیدی اور جدت پر ان سے ناراض تھے، شاہ عبدالعزیز نے اپنا مملوکہ نواسہ ان کو دے دیا تو مولوی اسماعیل کھل کھیلے، عقائد کے علاوہ دوسرا افساد سید صاحب کو متبنی بنانے کا ہے، عبدالحی میرٹھ میں انگریزوں کے محرر تھے، انہوں نے شاہ اسماعیل کو لے کر سید احمد کو پیر بنایا، ساتھ لے کر شہروں میں گشت کیا، نذرانوں کی قبولیت میں حرام و حلال کی تمیز نہیں کی، بنارس میں آکسلس بروک کی داشتہ کو مرید کیا، اس کی نذر قبول کر کے سید صاحب نے اسے اپنی بیٹی بنایا، راقم (یعنی مولوی فضل حق) وہاں موجود تھا، عبدالحی سے جب رقم نذرانہ کے متعلق میں نے استفسار کیا تو جواب نہ بن پڑا، یہ عبارت سیف الجبار سے ماخذ ہے، صحیح واقعات اس میں لکھے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر کا عہد ہر نوعیت سے مثالی ہے، اس میں "خزاں و بہار پوری

آب وتاب سے جلوہ نما ہیں، ایک طرف انحطاط وابتذال نمایاں ہے اور دوسری طرف اردو زبان کمال کو پہنچ رہی ہے، اسی زمانہ میں شاہ اسماعیل نے مذہبی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تھا اور سید احمد کی سربراہی میں سکھوں سے جہاد کی بناڈالی تھی، ظفر کے زمانہ کے شاعر محض شاعر نہیں تھے بلکہ مختلف علوم وفنون میں دستگاہ بھی رکھتے تھے، جب شاہ اسماعیل نے اپنی نجدیت نوازی سے ''امکان نظیر'' کی لاطائل بحث چھیڑی اور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے خاتم النبیین ہونے کی اہانت کی تو مولوی فضل حق خیر آبادی نے ان کی دھجیاں بکھیر دیں اور مرزا غالب نے فیصلہ کن مثنوی لکھی، کہتے ہیں کہ:

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمۃ للعالمین ہم بود
کثرت ابداعِ عالم خوب تر یا بہ یک عالم دو خاتم خوب تر
منشائے ایجادِ عالم یکے است
گر دو صد عالم بود خاتم یکے است
در یکے عالم دو خاتم را مجو
صد ہزاراں عالم و خاتم بگو

مومن خان حضرت سید احمد صاحب کے معتقد اور شاہ اسماعیل کے ہمنوا تھے، انہوں نے تحریک جہاد میں بہت خوب مثنوی لکھی ہے، محمد شاہ بادشاہ کے استاد شاہ نصیر اس تحریک جہاد کے خلاف تھے، جب جہاد کی ناکامی کی خبر دہلی میں آئی تو انہوں نے پر لطف قصیدہ لکھا:

کلام اللہ کی صورت ہوا ان کا دل سی پارہ
نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نص قرآنی
ہرن کی طرح میدان وغا میں چوکڑی بھولے
اگرچہ تھے دم شملہ سے وہ شیر نیستانی

اس قصیدے سے ناراض ہو کر اسماعیلیوں نے ان پر حملہ کیا تو دہلی کے کوتوال میرزا خانی نے انہیں بچایا، چنانچہ یہ شعر اضافہ کر کے کوتوال صاحب کی مہربانی کا اعتراف کیا ہے:

نصیر الدین بیچارہ تو رستہ طوس کا لیتا
نہ ہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی

اس جہاد کا زمین سے آسمان تک ڈنکہ بج رہا ہے لیکن سکھوں کی پیشانی پر بمانے کو بھی بل نہیں آیا، ان کی تاریخ اس جہاد کو پرکاہ کے برابر نہیں سمجھتی، وہ کہتے ہیں کہ جنگ اکوڑہ میں بدھ سنگھ کو شاندار کامیابی ہوئی، مجاہدین کو بری طرح پسپا ہونا پڑا، اس زمانہ میں رنجیت سنگھ، بدھ سنگھ سے ناراض تھا، اس لئے کہ بدھ سنگھ نے فریب دے کر قلعہ گوبند نگر پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن اکوڑہ پر بدھ سنگھ کی کامیابی پر اس کا جرم معاف کر دیا، سکھ اقرار کرتے ہیں کہ اکوڑہ میں غازیوں کو شکست دینے کے بعد ہم جہانگیرہ پہنچے تو غازیوں نے ہمیں محصور کر دیا، لیکن رسد ختم ہو جانے پر ہمیں موروچوں سے باہر آنا پڑا، پھر بھی بڑی خون ریزی کے بعد غازیوں کے ہم نے منہ پھیر دیئے، وہ فار بندی سے باہر چلے گئے، لیکن ہم نے ان کا تعاقب نہیں کیا، یہاں سے فرار ہو کر غازیوں نے یوسف زئی کی پہاڑیوں میں پناہ لی اور عرصہ دراز تک سر نہ اٹھا سکے۔

برخلاف اس کے حق پرست مجاہدین کا بیان ہے کہ ہمارے شب خون سے بدھ سنگھ کا لشکر منتشر ہو گیا، بعد کو مجتمع ہو کر اس نے عقب سے حملہ کیا، لیکن ہم فار بندی سے بخیر و خوبی باہر نکل آئے اور سکھوں کو تعاقب کرنے کی ہمت نہیں ہوئی، ایماندار تذکرہ نگاروں نے غازیوں کے شب خون کا قصیدہ لکھا ہے کہ یہ شب خون جنگ بدر کے یوم الفرقان کی طرح لیلۃ الفرقان تھا۔(۱) مزید بیان ہے کہ بدھ سنگھ لاہور کی طرف بھاگا جا رہا تھا تو اٹک کے قلعہ دار نے اسے سمجھایا کہ خلیفہ صاحب خیرآباد و اٹک فتح کر لینے کے بعد اس ملک پر تسلط جما لیں گے، یہ سمجھ کر بدھ سنگھ واپس ہوا۔(۲)

۱۔ سیرت سید احمد شہید از مولانا ابوالحسن علی ندوی، صفحہ ۱۴۷۔ ۲۔ سوانح احمدی: ۱۰۰

معتقدین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملکوتی صفات درجہ بشریت میں اتر آئے تھے، ان کا جہاد از قسم فساد تھا، ان کے خیال کو نیک سمجھا جاسکتا ہے لیکن فروعی مسائل میں مشغول ہو جانے کی وجہ سے مقصد کو کھو دیا۔ اکثریت ان سے علیحدہ ہوگئی، انہوں نے اوہام کو الہام ظاہر کیا اور ان کی خوابپرستی سے کام نہ بنا، ظاہر ہے کہ مقام جہاد انہوں نے غلط تجویز کیا، سرحد میں مختلف قسم کی بیعتیں اور ہر مرتبہ مرکز کی تبدیلیاں وبال جان بن گئیں، یہ وہاں کے فریع سے واقف نہ تھے اور کبھی ہرگز نہ سوچا کہ اپنی اس کارگزاری سے انگریزوں کو قوت پہنچا رہے ہیں، ان کے کمالات سے نہ یہاں کے مسلمانوں کو فائدہ ہوا اور نہ وہاں کے مسلمانوں کے کچھ ہاتھ آیا، رنجیت سنگھ نے صلح کا پیغام بھیجا مگر مسترد کر دیا، اگر صلح کر لیتے تو دونوں مل کر انگریزوں کو آسانی سے نکال سکتے تھے، مرشد بن کر انہیں حکم چلانا آیا مگر خدمت کرنے کا خیال نہیں بندھا، یہاں کے نفاق کو وہ دور نہ کر سکے، دشمنوں کو دوست بنانے کے بجائے دوستوں کو دشمن بنالیا، شاہ اسماعیل نے جس طرح ہندوستان میں تفرقہ کی بنیاد رکھی تھی، اسی طرح یہاں افغانستان میں بھی فساد کی فضا پیدا کر دی، وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو انہیں سورہ توبہ پڑھ کر سنا دیتا یا غزوہ تبوک کے حالات بتا کر ان کے دماغ میں روشنی پہنچاتا اور ان کی سمجھ میں آجاتا کہ منافقوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرنا چاہئے، وہاں کے ملاؤں کے حقوق غصب کر لئے، عشر کی آمدنی سے غریبوں کی مدد نہیں کی، شرع کے نام سے ایسی سختی کی کہ شرع شرما کر رہ گئی، کسی کی عزت و ناموس کا بھی لحاظ نہیں کیا، اب کیسے سمجھا جائے کہ انہوں نے اسلام کے دور اول کا اتباع کیا، سید صاحب نے اعلان تو برابر کیا کہ ہمارا مدعا حکومت نہیں ہے، ہم دین کی خاطر جہاد کرنے آئے ہیں مگر چند روز کی حکومت الٰہیہ وہ کمالات دکھائے کہ در و دیوار خون کے پیاسے ہو گئے، ان کی جنگیں سکھوں سے اتنی اہمیت نہیں رکھتیں جتنی وہاں کے مسلمانوں سے لڑنے کی اہمیت ہے، سکھوں کا وہ کچھ نہ بگاڑ سکے مگر مسلمانوں کے لئے ملک الموت ثابت ہوئے۔ جہاد سے بجائے فائدہ اٹھانے کے مسلمانوں کی مٹی خراب کر دی، سکھوں کو پریشان کیا اور انگریزوں کو تقویت پہنچائی، امیر المومنین مرشد بے فیض تھے، وہاں والے بیعت

توڑنے کے لئے مجبور تھے، سید صاحب کے ارشادات، ہجرت ثانیہ کے بعد کے فرمودات اور غیوبیت کی داستانیں شان ولایت کے خلاف ہیں، ان میں اتحاد کی بوباس نہیں، انہیں ہر وقت شرک ہی شرک کے خواب نظر آئے، اسی بدحواسی میں پچون کے مقام پر فرمایا کہ میں جہاد کو کھیل سمجھتا تھا۔(۱) سوانح سازوں نے جو حالات لکھے ہیں ان کے متعلق ان کی روح برملا کہہ رہی ہے:

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن آنچہ کرد ہم آشنا کرد

شاہ اسماعیل کی تفرقہ اندازیوں اور ان کی معقولات کی جدت طرازیوں نے یہاں اور وہاں مخالفت پیدا کر دی تھی، سرحد میں رجال الغیب نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، سید صاحب انتقال کے بعد فاتحہ درود سے بھی محروم ہو گئے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد سید صاحب کے بلند و بالا دعویٰ کو عزم کا جوش کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، مگر اس کا کیا جواب ہے کہ انہوں نے بارہا فرمایا کہ "فقیر دریں باب باشارات غیبی مامور است و بہ بشارت لاریبی مبشر، ہرگز ہرگز شبہ و وساوس شیطانی و شائبہ ہوائے نفسانی بایں الہام ممزوج نغیمت۔ اس یقین دہانی پر ان کی غیوبیت پائی گئی ہے، غیوبیت کے قائل عوام ہی نہیں بلکہ مولانا ولایت علی صادق پوری جیسے علماء بھی ہیں (۲) کالے پانی میں مرتے وقت مولانا یحییٰ علی کی زبان پر یہ شعر تھا:

کون سی رات آن ملے گا
دن بہت انتظار میں گذرے

مولانا رشید احمد گنگوہی ان کی غیوبیت کو اکمن سمجھتے ہیں، جعفر علی تھانیسری کو وقت رہائی ۱۳۰۰ھ میں سید صاحب سے سلام و پیام پہنچنے کا فخر حاصل ہوا تھا، لکھتے ہیں کہ مجھے حضرت مرشدنا کی حیات اور ان کے ظہور کا ایسا یقین ہے جیسے اپنی موت کا، اور یہ بھی بتایا ہے کہ میر حیدر علی ۱۳۰۲ھ میں زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔(۳) مگر

ا۔ سید احمد شہید از مولانا غلام رسول مہر
ا۔ مولوی ولایت علی جو شہادت سے محروم ہو گئے تھے، دہلی آئے تو زینت محل کے استاد مولوی امام علی نے ان سے بیعت کی، مولوی صاحب کا انتقال محرم ۱۲۶۹ھ میں ہوا۔ ۳۔ سید احمد شہید: ۲۰۱، اڈیشن ۱۹۳۹ء

بایں ہمہ مایوس ہو کر جعفر علی تھانیسری نے مسئلہ غیوبیت کو وہم سے بھی تعبیر کیا اور غلط سمجھا، رہا ان کا پتلا بنانا تو وہ کسی وجہ سے بھی ہو بدعت ہے، جوان توحید پرستوں اور تقلید کے منکروں نے یا د مرشد کے لئے ایجاد کر لیا۔

سکھوں کے بیان غلط سہی مگر ان کی رائے کو غلط نہیں کہا جا سکتا، انہیں اقرار ہے کہ سید صاحب نے یہاں پہاڑی جماعتوں میں ہل چل ڈال دی تھی، مگر ان کا تحت جوش پھونس کی آگ کی طرح کا تھا، جس کا ذرا سی دیر میں شعلہ ختم ہو جاتا ہے، ان میں بگاڑنے کی قابلیت تھی سنبھالنے کی نہیں تھی۔

جعفر تھانیسری نے خون کے آنسو بہا کر حقیقت لکھ دی ہے کہ وعدہ فتح پنجاب پر مکمل وثوق تھا۔۔۔۔ از روئے شرع محمدی الہام ایک ظنی چیز ہے، سید صاحب کی بایں جملہ دینی اوصاف پولیٹیکل پیچیدگیوں اور علم جنگ کی طرف توجہ بالکل نہیں تھی، ان ہی دو نقصوں نے اس کے بنے کام بگاڑ کر بالاکوٹ میں وہ دن دکھایا جس کی یاد سے خلقت کے دل دہلتے ہیں، اگر ان میں فن ملک گیری اور فن جنگ بھی ہوتا تو پنجاب کیا ساری دنیا کا بادشاہ ہوتا۔

مرزا حیرت دہلوی نے بھی دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں، لکھتے ہیں کہ مولانا شہید کی رائے پر اعتماد کر لیا گیا کہ رنجیت سنگھ سے سرحدی ناراض ہیں، لہذا وہ سب ساتھ دیں گے، اس میں انہیں کامیابی ہو جاتی اگر ان کے عمال بے اعتدالی نہ کرتے اور مجبور نہ کرتے کہ وہ ناگوار طور پر شریعت کی پابندی کریں، اس میں سرداران سمہ و پشاور کی زر پرستی و بے ایمانی کا بھی دخل و شمول تھا۔۔۔۔ مقصد اشاعت دین تھا اور ملک گیری کی ہوس نہ تھی۔

صاحب سیرت سید احمد شہید ابوالحسن علی ندوی اپنے قومی غم کو چھپا نہ سکے، سب سے زیادہ ان کو افسوس اس بات کا ہے کہ اس تاریخ کو مسلمانوں کے اقبال کا ستارہ غروب ہو گیا، مسلمانوں کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی، حکومت شرعی سینکڑوں برس کے لئے ایک خواب بے تعبیر ہو گئی، شرع اور دین کا جلال اور اس کا تخت و تاج لٹ گیا

اور ہندوستان کی آزادی صدیوں کے لئے بچھڑ گئی، بالاکوٹ کی زمین چند مذہبی دیوانوں کا ہی مقتل نہیں بنی بلکہ بہت سے سیاسی ہوشمندوں کی بھی عبرت گاہ ہے اور سارے ہندوستان کے یکساں احترام کی مستحق ہے۔ (سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۹۷)

صاحب سید احمد شہید جناب مولانا غلام رسول مہر صاحب کا نوحہ معقولات کے بہترین نکات اپنے اندر رکھتا ہے، فرماتے ہیں کہ:

"بڑا افسوس ہے سید صاحب کی توقعات پوری نہیں ہوئیں، ان کی (یعنی سرحد والوں کی) اسلامی حمیت بھی پائیدار نہیں نکلی اور سید صاحب کی عزیمت بہترین متاع تھی سرحد کی نااہلیت کی نذر ہوگئی، لیکن ظاہری عقل کی بنا پر سید صاحب کا فیصلہ ہر اعتبار سے محکم اور صائب تھا، جو کچھ پیش آیا اس کا علام الغیوب کے سوا کسی کو اور علم نہیں"۔

حیرت ہے کہ مہر صاحب نے سید صاحب کے علم باطن سے استدلال نہیں کیا گویا اس سے انکار کر دیا، سرحد کی بات تو علیحدہ رہی، اپنی تعلیم سے انہوں نے ہندوستان میں بھی تفرقہ ڈال دیا تھا مختصر یہ کہ یہ آہ و شیون اپنی ذاتی تسلی کے لئے ہے اور اسی اصول پر سید صاحب اور شاہ صاحب کو انہوں نے خطاب دیا ہے "تیرھویں صدی کے دو مجاہد"۔

میرزا حیرت نے لکھا ہے کہ عظیم الشان کام کی وہ ابتداء تھی یہ انتہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ محرک جہاد کون تھا اور اس میں قیادت کے جوہر تھے یا نہیں، کیا یہ محرک مجدد کی حیثیت رکھتا تھا، یہ کہنا کہ سید صاحب پیدائشی طور پر شوق جہاد رکھتے تھے لغو ہے، اگرچہ وہ مجذوب مطلق نہیں تھے، کم از کم دسواں حصہ مجذوبیت کا رکھتے تھے، ایسا شخص رہنما نہیں ہوسکتا، لہذا میرزا حیرت کا کہنا یہ صحیح ہے کہ جہاد کا تصور شاہ اسماعیل کے دماغ میں پیدا ہوا تھا، شاہ اسماعیل کو بڑا بننے کا شوق تھا، ہر زندگی میں انہوں نے نئی راہ نکالی ہے، وہ وحدت الوجود کے قائل تھے اور خاندانی عقیدہ وحدت الشہود کے خلاف تھے، ان کے عقائد سے علماء کو اختلاف ہوا، اسی زمانہ میں تقویت الایمان لکھی، اس کتاب میں جہاد کا مطلق ذکر نہیں ہے، ریذیڈنٹ نے جب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر وعظ کہنے

کی ممانعت کر دی تو وعظ کہنے کی ریزیڈنٹ سے مل کر اجازت حاصل کی، اس وقت ریزیڈنٹ منکاف تھا (۱۸۱۱ تا ۱۸۱۸ء) اس نے شاہ صاحب سے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ دار الحرب کا مطلب دریافت کیا اور سمجھایا کہ دراصل سکھ مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں اور ہمیں بے وجہ دشمن سمجھا جاتا ہے، یہ اشارہ شاہ اسماعیل کے لئے تازیانہ ہوا اور حقیقت معلوم کرنے کے لئے انہوں نے پنجاب کا خفیہ دورہ کیا، بعد تحقیق و معائنہ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ سکھ مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں اور انگریز ان مظلوموں کو پناہ دے کر تسکین فرماتے ہیں، اسی لئے ان کے دماغ میں سکھوں سے جہاد کرنے کا تصور پیدا ہوا، شاہ عبدالعزیز کے فتوے میں سکھ اور انگریز دونوں سے جہاد کرنے کا مفہوم تھا، شاہ ولی اللہ پہلے ہی فرما گئے تھے کہ حکومت کرنے کی قابلیت افغانوں میں منتقل ہو گئی ہے، علاوہ ازیں شاہ اسماعیل کو انگریزوں سے پوری مدد ملنے کی امید تھی، منکاف کے بعد اکٹرلونی ۱۸۱۸ء میں دہلی کا ریزیڈنٹ ہوا، مولوی عبدالحی انگریزوں کی ملازمت میں رہنے کی وجہ سے ان کے مزاج اور طبیعت سے واقف تھے، اس لئے سکھوں سے جہاد کرنے کے متعلق مولوی عبدالحی کے ذریعہ اکٹرلونی سے مشورہ کرنا چاہتے تھے مگر مولوی عبدالحی نے انہیں روحانی بزرگ سید احمد صاحب سے ملنے کا مشورہ دیا، سید صاحب اسی زمانہ میں مالوہ سے دہلی آگئے تھے، جب شاہ اسماعیل سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس درجہ مسخر ہوئے کہ مرید ہو گئے اور ان کی روحانی صحبت میں جہاد کے تصور اور ارادہ کو فراموش کر گئے، ان تینوں صاحبان نے مختلف شہروں کا دورہ کر کے دین کی تبلیغ شروع کی، تبلیغ کے ان دوروں میں جہاد کا نام بھی نہیں لیا گیا ہے، لیکن رام پور میں ایک افغانی نے سکھوں کے مظالم کی طرف توجہ دلائی تو سید صاحب متاثر ہوئے اور شاہ اسماعیل کو جہاد کے متعلق اپنا بھولا ہوا خواب یاد آگیا اور خیال جمایا کہ نواب رامپور احمد علی خان کی سفارش سے انگریزوں کی مدد حاصل ہو سکے گی، اب سید صاحب کے تبلیغی دوروں میں جہاد کا بھی ذکر ہونے لگا، پھر اپنے وطن رائے بریلی پہنچ کر جہاد کی تیاری کی، اسی کوشش میں نواب اودھ کے یہاں لکھنؤ پہنچے تو وہاں متروک حج کے مسئلہ پر بحث چھڑی، نتیجہ یہ ہوا کہ جہاد کرنے سے پہلے حج کرنا چاہیے، اور

عازمین حج کو اپنے صرفہ سے لے جانے کا بھی اعلان فرما دیا، انگریزوں سے مراسم رکھنے والے روساء اور نیل کے تاجروں اور ان کی داشتہ کسبیوں نے اتنا چندہ دیا کہ قافلہ حج کے مصارف کے لئے کافی سے زائد ہو گیا، شاہ صاحب جیسی بھی روحانیت کے حامل ہوں مگر ان کا اشتہار دینے والے شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحی تھے، تکیہ رائے بریلی کے قیام میں سید صاحب کی کتاب ''صراط مستقیم'' لکھی گئی، حج میں عالم اسلامی کی تائید ہو جاتی مگر شاہ اسماعیل کے عقائد کی وجہ سے وہاں مسلمان برگشتہ ہو گئے، حج سے واپس آ کر سکھوں سے جہاد کرنے کے لئے قدم اٹھا دیا گیا، انگریزوں سے بار ہا شکایت کی گئی کہ سید صاحب کی جدوجہد انگریزی سرکار کے خلاف ہے مگر اس شکایت کو مسترد کر دیا گیا اور سید صاحب نے بھی ہر ممکن طرح یقین دلایا کہ انگریزی حکومت میں ہم خلل نہیں ڈالیں گے اور شاہ اسماعیل نے تو صاف کہہ دیا کہ جو انگریزوں کا دشمن ہے وہ ہمارا دشمن ہے، جب دہلی کے راستہ سے لاہور پر حملہ کی اجازت مانگی تو انگریزی سرکار نے سمجھایا دیا کہ ہم سے اور سکھوں سے معاہدہ ہو گیا ہے کہ دریائے ستلج حد فاصل رہے گا اور دشمنوں کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں گے، چنانچہ سید صاحب نے لاہور پر حملہ کرنے کے لئے راہ دراز اختیار کی، اس میں یہ بھی فائدہ تھا کہ درمیانی بستیوں اور ریاستوں سے انہیں مدد مل سکے گی اور حج میں عالم اسلامی کی تائید حاصل ہو سکتی ہے، چونکہ اس زمانہ میں مسلمان راہ حق سے ہٹ گئے تھے اور روح جہاد ان میں نہیں رہی تھی، لہٰذا سید صاحب نے سیاسی عظمت کو اپنا نصب العین نہیں بنایا اور صرف احیائے اسلامیت پر اپنی دعوت کی بنیاد رکھی، دور اول میں دین جو برتری حاصل تھی وہ خدمت دین کا ثمرہ تھی، دور اول کو قوت کے اسباب حاصل نہیں تھے، بلکہ ان میں جہاد کی روح پیدا کر دی گئی تھی، سید صاحب اسی دور مسعود کو زندہ کرنا چاہتے تھے، بات تو صحیح ہے لیکن دور اول کی خصوصیت، قوت ایمانی سے پیدا ہونے والی فراست جیسی خوبی ان صاحبان میں تھی یا نہیں، ایسی فراست کا یہاں دور تک پتہ نہیں تھا، وحی الٰہی کا فراست کے ساتھ استعمال کرنا دور اول کی امتیازی شان تھی، یہ لوگ تو آنکھیں بند کر کے اندھی تقلید کے قائل تھے، لہٰذا وحی والہام کا ذکر کرنا بھی

فضول ہے، دور اول کی پختگی یہ تھی کہ کفار کی زیادتیوں پر بے تکلف حبشہ کو ہجرت کی، نصرت الٰہی یہ تھی کہ شاہ حبشہ نے ان کافر دشمنوں کی نہیں سنی اور مہاجرین کی عزت و محبت سے خاطر و مدارت کی، دور اول کی روحانی فراست یہ تھی کہ مدینہ والوں کی دعوت پر وہاں کے لئے یکدم ہجرت کی اور طرز واخلاق سے دشمنوں اور منافقوں کو زیر کرلیا، جب کفار مکہ نے حملہ کیا تو باوجود بے سروسامانی جنگ احد و بعد میں کامیابی عطا ہوئی، یہ مٹھی بھر مسلمان نور سے معمور تھے، رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آنکھوں کا تارا تھے اور اللہ رب العزت ان کا مددگار تھا، فرشتوں کی مدد آگئی، فتح ہو جانے پر دھاک بیٹھ گئی، جنگ احد میں کامیابی کے آثار نمودار ہوئے، کفار نے ہزیمت اختیار کی، مگر جو صحابہ عقب میں پہاڑی کے دہانہ پر اس حکم کے ساتھ متعین کئے گئے تھے کہ کسی حال میں اپنی جگہ سے جنبش نہ کرنا، مال غنیمت کی ہوس میں انہوں نے اپنے مقام کو چھوڑ دیا، کفار نے بھاگتے بھاگتے اسی طرف سے حملہ کر دیا تو لینے کے دینے پڑ گئے، شان کریمی نے اس وقت جلوہ دکھایا اور دشمنوں کو پسپا ہونا پڑا اب اگر نورانی فراست والوں سے لغزش ہوسکتی ہے تو پھر علمی و عقلی فراست تو قابل ذکر ہی نہیں، فرشتے ہر طرف یہاں کی کسی لڑائی میں رجال الغیب یا جنات بھی مدد کو نہیں آئے، اب یہ عقل پر بھروسہ کرنے والے دور اول کی نقل کرنے کے کیسے مدعی ہو سکتے ہیں۔

مہر صاحب کی کتاب "سید احمد شہید" کے تیسویں باب میں شاہ اسماعیل نے خود اقبال کیا ہے کہ "زمانہ رسالت میں بذریعہ وحی منافقین کے متعلق علم ہو جاتا تھا، اب وہ ذریعہ باقی نہیں رہا، اب صرف علامتوں پر حکم لگایا جاتا ہے۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ اپنے ہر منصوبہ کو بغیر کسی سند یا معیار کے دور صحابہ سے تشبیہ دے دی جاتی ہے، صراط مستقیم کی فصل سوئم میں بھی سید صاحب نے لکھا ہے کہ "اپنی مرضی کے مطابق کسی کام کو رضائے الٰہی سمجھنا غلط ہے۔"

ان حضرات کا اعلانیہ دعویٰ ہے کہ سید صاحب نے صرف احیائے اسلامیت پر اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھی تھی، اب انہیں کون سمجھائے کہ احیائے اسلامیت کا نتیجہ سیاسی عظمت ہے، ان مصاحبین نے سید صاحب کا ایک بازار پٹ کر دیا اور ان کی زبان

مبارک سے کہلوایا کہ:

"میرے دل میں حکومت اور دولت کا خیال کبھی پیدا نہیں ہوا"۔

پھر خدا کے لئے بتایا جائے کہ حکومت الٰہیہ بنانے کے لئے پاپڑ کیوں بیلے، قصہ مختصر تذکرہ نویسوں نے اپنی اپنی بولیاں بول کر اپنا دل بہلایا ہے، وہ نہ اپنے آپ کو سمجھے اور نہ سید صاحب کو سمجھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆



حقیقت واقعی

دیران ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں، سید صاحب کے پرانے اور نئے سوانح نویسوں کے بیانات طلسم ہوش ربا کی مثال ہیں، ان میں اختلاف وتضاد موجود ہے، لیکن عقیدت مند الہامی سمجھ کر ان پر یقین رکھتے ہیں، افسوس یہ ہے کہ نئے سوانح نگاروں نے اور خصوصاً جناب مولانا غلام رسول مہر صاحب جیسے محقق نے اشرف نامہ اور سوانح میر تیتو شہید کو کیوں نظر انداز کر دیا، حالانکہ یہ دونوں کتابیں سید صاحب کے سوانحوں کی مستند و مضبوط کڑی ہیں اور ان میں بے غل وغش جملہ واقعات لکھے گئے ہیں، ان دونوں مطبوعات کے اقتباس یہاں اس لئے لکھے جاتے ہیں کہ عقیدت مند حضرات خود غور کر کے اصلیت کو سمجھیں۔

ٹھاکر اشرف علی خان نے اشرف نامہ میں اپنے حالات لکھے ہیں، وہ ۱۸۰۹ء سے لے کر آخر تک مالوہ میں رہے ہیں، پنڈاریوں سے ان کے خاص تعلقات تھے اور وہاں کے راجاؤں کے یہاں ان کی رسائی تھی، ٹھاکر اشرف علی خان ٹھاکر دوندے خان رئیس کمونہ پرگنہ پیتم پور ضلع کول (علی گڑھ) کے منجھلے صاحبزادے ہیں، ٹھاکر دوندے خان نے ۱۸۰۲ء میں علی گڑھ کا قلعہ فتح کرنے میں جنرل لیک کی بھرپور مدد کی تھی اور انگریز ان کے مرہون منت بھی تھے، مگر ان کے اثرات کی وجہ سے جب کچھ نہ چلی تو خلاف معاہدہ علی گڑھ کے انگریز حاکموں نے اپنی فطرت کے مطابق ۱۸۰۵ء میں قلعہ کمونہ کا محاصرہ کر لیا، یہ محاصرہ ایک مہینے تک رہا، جب یہ سنا کہ امیر خان اپنا لشکر لے کر اپنے وطن سنبھل سے انگریزوں کو خارج کرنے کے لئے آ رہے ہیں تو محاصرہ اٹھالیا اور ٹھاکر صاحب سے صلح کر لی، نواب اکبر خان یہاں آ کر کالی ندی پر سید نور

صاحب کے یہاں مقیم ہوئے تھے، ٹھاکر دوندے خان انہیں اپنے یہاں قلعہ کمونہ میں بلا لائے، ہر چند سمجھایا کہ انگریزوں سے مقابلہ نہ کرو، اس لئے کہ انہیں ہر وقت تازہ کمک پہنچتی رہے گی اور تمہارے لشکر میں کمی واقع ہوتی رہے گی، مگر انہوں نے ایک نہ سنی، نتیجہ یہ ہوا کہ شکست کھائی، انگریزوں نے ان کا تعاقب کیا، مگر ٹھاکر دوندے خان نے بحفاظت تمام بھرت پور تک پہنچا دیا، اس کے دو برس بعد کلکٹر رسل اور کرنل گلبر نے ٹھاکر صاحب کے تین قلعوں پر یکدم حملہ کر دیا، آخر کار وہ اپنے خاندان کو خفیہ طور پر براہ بھرت پور راجہ سندھیا کی چھاؤنی میں ہوتے ہوئے اوائل ۱۸۰۹ء میں نواب امیر خان کے پاس مقام ناگپور پہنچے اور ان کے یہاں کئی مہینہ مہمان رہے، باوجود خاطر تواضع کرنے کے امیر خان ٹھاکر صاحب کے گزارے کی کوئی مستقل صورت نہ نکال سکے، تو انہوں نے اپنے سالار محمد شاہ خان کے پاس کشن گڑھ بھیج دیا، جب یہاں بھی کوئی مستقل انتظام نہ ہو سکا تو ٹھاکر صاحب راجہ سندھیا کے یہاں چلے گئے، یہ خبر سن کر اب امیر خان نے انہیں ندامت ومعذرت کا خط لکھا اور اپنے یہاں آنے کی التجا کی، لہذا ۱۸۱۰ء میں وہ پھر نواب امیر خان کے لشکر میں پہنچ گئے، دو ماہ بعد نواب محمد شاہ خاں نے اپنی مدد لے لئے ٹھاکر اشرف علی خان کو جودھپور بلا لیا، وہاں انہوں نے اپنی بہادری کا سکہ منوالیا، لکھا ہے کہ معرکہ کھریر پر نواب محمد شاہ خان کی مدد کے لئے رواں دواں گھوڑے پر جا رہے تھے کہ راہ میں ایک دیوانہ فقیر نے بددعا دی کہ بہت اترا گیا ہے، یہ نہ سمجھے کہ اس کا خطاب ان سے تھا، اس جنگ مین ان کا ہاتھ زخمی ہوا اور ساتھ والوں نے ساتھ چھوڑ دیا، پھر اتفاق یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد گھوڑے سے گرا تو ٹانگ ٹوٹ گئی، کئی سال بعد جے پور میں ملازمت مل گئی، سرکار جے پور کی بدانتظامی کی وجہ سے عرصہ تک تنخواہ نہ مل سکی تو فاقوں کی نوبت آگئی اور میاں ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں جا کر لنگر پر بسر کی، ایک روز رات کو مسجد میں اپنی بدقسمتی کا رونا رو رہے تھے اور دربار الٰہی مین فریاد کر رہے تھے کہ ایک مجذوب آ کر بیٹھ گیا اور اس نے

ایک پرچہ دیا جس میں حافظ شیرازی کے حسب ذیل دو شعر تھے:

الا اے طوطی گویائے اسرار
مبادا خالیت شکر ز منقار
سرت سبز و دولت خوشباد جاوید
کہ خوش نقشے نمودی از خط یار

خدا کی شان کہ اسی صبح کو کار بستہ کھل گئے اور خزانے سے نہ صرف تنخواہ ملی بلکہ راجہ نے انہیں جاگیر بھی مرحمت فرمائی۔

سید صاحب کے تذکرہ نویسوں نے میجر آکڑلونی کے متعلق جو بے پر کی ہوائیاں اڑائی ہیں، ان کی اشرف نامہ سے تردید ہو جاتی ہے، ٹھاکر اشرف علی خان نے لکھا ہے کہ امیر خان جے پور کے خلاف دو مہینوں سے مورچہ بنائے ہوئے تھے، اس وقت راجہ جگت سنگھ سوائے نے انگریزوں کے پاس دہلی درخواست بھیجی کہ ان کی مدد کی جائے، لہذا میجر اکڑلونی کثیر فوج لے کر آگئے، اور امیر خان کو شکست فاش دی، اس ہنگامہ میں اکڑلونی کے دوش بدوش ٹھاکر اشرف علی خان رہے، لہذا میجر ان سے بہت خوش تھا، اس فتح کے دو تین ماہ بعد راجہ جگت سنگھ صاحب کا انتقال ہو گیا، میجر اکڑ لونی کے ذریعہ ان ٹھاکر صاحبان کی انگریزی سرکار میں رسائی ہوئی اور ان کے بڑے بھائی رن مست خان نے جودھپور کے ایجنٹ رابرٹ صاحب کی بھی سفارش حاصل کی۔ دہلی سے خوشنودی کے پروانے لے کر کلکتہ میں گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز کی خدمت میں حاضر ہوئے تو معافی ملی اور ان ٹھاکر صاحبان کو وطن جانے کی اجازت ہوئی، پھر یہ خاندان از سر نو موضع سونگرہ متصل کمونہ میں آباد ہوا، اشرف علی خان نو سال بعد یہاں سے علاقہ جے پور میں اپنی جاگیر لومروائی میں رہنے کو چلے گئے، ٹھاکر اشرف علی خان فقیر دوست تھے، پنڈاریوں میں کئی مرتبہ مہینوں اور دنوں تک تین مرتبہ رہے تھے مگر انہوں نے سید صاحب کے متعلق ایک حرف بھی اپنے تذکرہ میں نہیں لکھا ہے، اگر ذرا

بھی ان کے کانوں تک سید صاحب کی بھنک پہنچ جاتی تو وہ دل و جان سے ان کے قدموں پر سر رکھتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب مالوے میں تشریف فرما نہیں ہوئے تھے، یا نواب امیر خان کے لشکر میں گمنام و بے نشان زندگی گزار رہے تھے، اللہ بس باقی ہوس۔

اب میر تیتو شہید کے مطبوعہ سوانح سے حسب ذیل معلومات ملتی ہیں جن پر انگلی کسی طرح نہیں رکھی جا سکتی، میر تیتو شہید جنگ پلاسی کے ۲۵ سال بعد ۱۷۸۲ء میں بنگال کے موضع چاند پور میں پیدا ہوئے تھے، اٹھارہ برس کی عمر میں کلام پاک حفظ کر لیا تھا، علم حدیث پر بھی عبور حاصل تھا، عربی، فارسی و بنگالی میں بے تکان تقریر کرتے تھے، شریعت و طریقت میں دستگاہ حاصل کرنے کے ساتھ پہلوانی، نیزہ بازی اور شمشیر زنی میں بھی برق تھے، وہ چاہتے تھے کہ کوئی مرشد مل جائے، لہذا تلاش مرشد میں بنگال اڑیسہ اور دہلی آگرہ تک سفر کئے، آخر کار ایک بزرگ نے بتایا کہ خانہ کعبہ کا طواف کرنے کے بعد مکہ معظمہ میں مرشد مل سکے گا، لہذا پہلی فرصت میں وہ حج کے لئے روانہ ہو گئے، ایک بزرگ نے یہ بھی پیشین گوئی کی تھی کہ تمہیں شہادت نصیب ہو گی، مکہ معظمہ میں اتفاقیہ ان کی ملاقات کلکتہ کے مولانا شاہ محمد حسین سے ہوئی، انہوں نے میر صاحب کو بتایا کہ میرے پیر حضرت سید احمد رائے بریلوی یہاں موجود ہیں، اگر مناسب سمجھو تو ان سے مل لو، چنانچہ میر صاحب سید احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، سید صاحب نے دیکھتے ہی فرمایا کہ مرید ہونے کے جملہ شرائط و اوصاف تم میں ہیں اور میں تمہیں مرید کر سکتا ہوں، اس کے تیسرے روز میر صاحب سید صاحب سے بیعت کر لی اور میر صاحب مستقل طور پر سید صاحب کی خدمت میں رہنے لگے۔

تیتو شہید نے لکھا ہے کہ اسی حج کے موقع پر سید صاحب نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے علماء سے پوچھا تھا کہ ہندوستان میں جماعت جمعہ جائز ہے یا نہیں، ان

سب کا ارشاد ہوا کہ ہندوستان دار الحرب ہے، اس لئے وہاں جماعت جمعہ نہیں ہو سکتی، ہندوستانی مسلمانوں کا فرض ہے کہ ہندوستان کو دارالامن بنائیں، اس کے بعد ہم لوگ مدینہ منورہ سے رخصت ہو کر مقدس مقامات کی زیارت کرتے ہوئے اور دمشق، مصر اور افغانستان کے تاریخی مقامات پر حاضری دیتے ہوئے براہ خشکی رائے بریلی چلے گئے، تیسرے دن سب ساتھیوں کو گھر جانے کی اجازت دی کہ اپنے خانگی انتظامات سے فارغ ہو کر یہاں آجائیں تاکہ مختلف صوبوں اور شہروں میں تبلیغ و جہاد کے لئے چلیں، بنگالی مریدوں کو خاص تاکید کی کہ کلکتہ کے تمام بزرگوں کو مطلع کر دیں کہ ہم کلکتہ آکر سب کے مشورے سے نصب العین مقرر کریں گے۔

جب شاہ اسماعیل اور مولانا اسحاق دہلی سے آگئے تو دورہ شروع ہوا، ہر جگہ سے ایک یا دو نمائندے لے لئے جاتے تھے، بہار پہنچتے تک مجاہدین کی تعداد ایک سو تک ہو گئی اور کلکتہ تک یہ تعداد دو سو ہو گئی، روانگی حج سے پہلے دو مرتبہ کلکتہ آئے تھے، پہلی ہی مرتبہ بیگم شمس النساء خانم ان کی مرید ہو گئی تھیں اور انہوں نے اپنے یہاں ''بگان باڑی'' میں ٹھہرایا تھا، اس کے بعد دوسری مرتبہ بھی یہاں ہی جلوہ افروز ہوئے تھے مگر معلوم نہیں تذکرہ نویسوں نے کس بنیاد پر لکھ دیا ہے کہ سید صاحب نے وکیل سرکار امین الدین کے یہاں قیام فرمایا تھا، اب جب سید صاحب نے کلکتہ میں نزول فرمایا تو یہاں کے مریدوں نے صرف تشریف آوری کی خبر کر دی تھی بلکہ فرید پور، حکیم پور، رسول پور اور رنگ پور وغیرہ کے لوگوں کو رضا کارانہ طور پر سید صاحب کے جلسے میں شرکت کے لئے بھی آمادہ کر لیا تھا، بگان باڑی میں تین دن قیام رہا، شریک ہونے والے مقتدر صاحبان میں مولانا عبدالباری خان، مولانا شاہ محمد حسین، مولانا شریعت اللہ، مولانا صوفی خداداد خان صدیقی، مولانا کرامت علی جونپوری، مصری سوداگر مولانا جمال الدین آفندی اور مولانا ابوالکلام کے والد ماجد مولانا خیر الدین جیسے عالم و فاضل حضرات تھے، طول طویل مباحثہ و مناکرہ کے بعد طے یہ ہوا کہ جہاد ضرور کیا جائے،

پٹنہ کو مرکز بنایا جائے اور اس کی شاخیں پورے ہندوستان میں کھولی جائیں، تیتو شہید نے بنگالی مسلمانوں کی زبوں حالی کو واضح کیا کہ یہاں کے برہمنوں، کالستھیوں اور راجاؤں نے مسلمانوں کو اس درجہ مجبور کر دیا ہے کہ وہ مذہب کا نام تک نہیں لے سکتے۔ ان کی اولاد کو پاٹ شالاؤں میں ہندو مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے، وہ اپنے نام بنگالیوں کی طرح کے رکھنے کے لئے مجبور کئے جاتے ہیں، داڑھیاں منڈانے اور ہندوانہ رسوم ولباس کے عادی بنا دیئے گئے ہیں، اندریں حالات تحریک جہاد یہاں کامیاب نہیں ہوسکتی، لہٰذا میں نے طے کیا ہے کہ پہلے یہاں کے مسلمانوں کو تعلیم اسلام سے آراستہ کروں، مجھے امید ہے کہ ہماری اس تحریک جہاد میں نیچی ذات کے ہندو جو برہمنوں اور چھتریوں سے بیزار ہیں شریک ہو جائیں گے، اس کے بعد ہم ولائتی اور دیسی سوداگروں پر ان شاءاللہ غلبہ حاصل کرلیں گے۔

میر صاحب لکھتے ہیں کہ مولوی کرامت علی جونپوری نے میری تائید کی اور اعلان کیا کہ وہ ہندوستان کو کبھی ہرگز دارالحرب نہیں سمجھتے، لہٰذا جمعہ کی جماعت یہاں جائز ہے، اسے کبھی ترک نہ کیا جائے، ورنہ مسجدیں ویران ہو جائیں گی اور مخالفین ان پر قبضہ کرلیں گے، مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے، پنجگانہ نماز مسجدوں میں پابندی سے ادا کیا کریں، اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ہندوستان کو غیروں سے نجات ضرور ملنا چاہیے، لہٰذا صحیح جذبہ پیدا کرکے اور سامان مہیا کرنے کے بعد جہاد کرنا لازمی و ضروری ہے، فی الحال بنگالی مسلمان اپنی خستگی اور اسلام سے دوری کی وجہ سے ہماری اس تحریک جہاد میں کھلے بندوں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ بہر حال طے یہ ہوا کہ میر نثار علی عرف تیتو شہید بنگال میں مسلمانوں کو تلقین کریں اور سید صاحب انگریزوں اور سکھوں سے نجات کی کوشش فرمائیں۔

اس کے بعد میر نثار علی نے بنگال میں دین کی تبلیغ کی اور مسلمان بڑی تعداد میں اسلامی تعلیم پر عمل کرنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ برہمنوں، کالیستھوں اور راجاؤں نے

پادریوں سے ساز کر کے انگریزوں کی سرپرستی حاصل کر لی، انگریز اپنے اثرات کو قائم رکھنے اور بڑھانے کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ مسلمان متحد ہو کر ترقی نہ کرنے پائیں، ورنہ وہ ناقابل فتح قوت ہو جائیں گے، لہذا انہوں نے مسلمانوں میں نہ صرف تفرقہ ڈالنے کی تدابیر اختیار کیں کہ اسلامی ممالک سے تعلقات پیدا کر لیں گے اور قید و بند کے ذریعہ بھی بدترین مخالفت کی، میر صاحب تن تنہا نہایت مردانگی سے ان سب کا مقابلہ کر کے جدوجہد کرتے رہے، مگر ان کی قسمت میں شہادت تھی، اس لئے ۱۲ مارچ ۱۸۳۲ء کو جب کہ وہ مصروف عبادت تھے جنرل اسٹوارٹ نے حملہ کیا اور اس کے دو گولوں نے میر صاحب کو دربار الٰہی میں پہنچا دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تیتو شہید کی کارگزاریاں یادگار روزگار ہیں، ان ہی کے دم سے مشرقی بنگال میں اسلام اور آزادی کی شمع روشن ہوئی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ان ہی کی وجہ سے سید احمد صاحب کو یہاں مقبولیت حاصل ہوئی۔

مجلس شوریٰ کی قرارداد کے مطابق سید احمد رائے بریلوی کو انگریزوں اور سکھوں سے جہاد کرنا تھا مگر وہ دونوں سے ایک ساتھ برسرپیکار نہیں ہو سکتے تھے، لہذا انہوں نے طے کیا کہ پہلے سکھوں کی خبر لی جائے، اس کے بعد انگریزوں کی مزاج پرسی کی جائے، مگر اس فیصلہ کے ساتھ انہوں نے یہ غور نہیں کیا کہ سکھوں سے جہاد کرنے کے عرصہ میں انگریز ہندوستانی مسلمانوں کو کچل ڈالے گا اور یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی شمالی و جنوبی ریاستیں انگریزوں کے خلاف معاہدہ کرنا چاہتی تھیں، برخلاف اس کے انہیں انگریزوں سے سکھوں کے خلاف مدد کی امید تھی، ان ہی کوتاہیوں کو دیکھ کر جعفر تھانیسری نے خون کے آنسو بہائے ہیں کہ "سید صاحب کو سیاست نہیں آتی تھی، اب رہا ان کا الہام تو یہ ظنی چیز ہے۔"

اب اتنے عرصہ کے بعد ان امور پر چہ میگوئیاں کرنا تضییع اوقات کے سوا کچھ نہیں۔ ان کے معتقدین آج بھی نتائج سے عبرت حاصل نہیں کرتے اور اطمینان سے

بیٹھے ہوئے انتظار کررہے ہیں کہ سید صاحب آزادی دلانے کے لئے پھر نمودار ہوں گے۔

دیگر تذکرہ نویسوں کی طرح میر تقیؔ شہید اور مرزا حیرت دہلوی سید صاحب کی کرامتوں کے قصیدے نہیں گاتے، میر تقیؔ شہید نے سید صاحب کا اتباع مکمل طور پر کیا اور تن من دھن کی بازی لگادی مگر سید صاحب کی کوشش جہاد میں استقلال دکھائی نہیں دیتا، واقعہ پشاور کے بعد سید صاحب نے جہاد سے توبہ کی اور مجاہدین کو آزاد کرکے خود ہجرت کرنے کا اعلان کردیا اور فرمایا ہمارے ساتھ وہی آئے جو تکالیف پر مالک کے خلاف حرف شکایت زبان پر نہ لائے، ایسا نہ ہو کہ تکلیف کی صورت میں کہا جائے کہ سید صاحب نے دھوکہ دیا، دامن کوہ میں پہنچ کر جہاد کا سودا پھر سر میں پیدا ہو گیا اور ساتھ میں رہ جانے والے غازیوں سے اس امر پر بیعت لی کہ خواہش نفسانی وغیرہ میں اپنے اوپر مسلمان بھائیوں کو مقدم رکھا جائے اور مقام تکلیف میں خود کو مقدم خیال کیا جائے، سب ساتھیوں نے بیعت کی مگر شاہ اسماعیل نے نہیں کی اور فرمایا کہ وہ اس بیعت کو نہیں نباہ سکیں گے، اس سے شاہ اسماعیل کی فلسفیانہ مولویت اور عقیدت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، ان دونوں صاحبان ٹھاکر اشرف علی خان اور میر تقیؔ کے بیانات کی حق بیانی کی موجودگی میں سید صاحب کے پرانے اور نئے تذکرہ نگاروں کے بیانات کو ہذیانات ہی کہا جاسکتا ہے۔ فاعتبروا یا أولی الابصار۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تعلیم

بیا ور ید گر اینجا بود سخن فہمے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

زمان و مکان، زمین و آسمان، فضاء و خلا، شجر و حجر، جن و انس، غرض ہر مخلوق اپنے خالق کی خود شہادت ہے، یہ ذات واجب الوجوب واحد ہے اور لاشریک۔ اسم ذات اس کا "اللہ" ہے، اور اسمائے صفت ہزاروں ہیں۔ یہ صفات کسی کی دی ہوئی نہیں ہیں بلکہ خود ہی ہیں اور ذاتی ہیں، اس ذات مقدس کے بغیر نہ نظام سنبھل سکتا ہے اور نہ بات بن سکتی ہے، اس کا جان لینا اور ہے اور مان لینا اور ہے۔ اصل پہچان دل سے ہوتی ہے، دماغ سے نہیں ہوا کرتی۔ باری تعالیٰ کا خود ارشاد ہے کہ

"قدرت کا ظہور اسی لئے کیا ہے کہ پہچانا جاؤں"۔

اس کی معرفت کا ذریعہ اس کی کتابیں ہیں اور اس کے رسول ہیں۔ ان سے علم بھی حاصل ہوتا ہے اور مشاہدہ بھی۔ ورنہ قیاسی، ظنی و جذباتی طریقوں سے نہ کوئی کلیہ بنا ہے اور نہ بن سکتا ہے اور اگر بنایا جائے گا تو آخر آخر غلط ثابت ہوگا۔ بغیر رسول کے کتاب ایک معمہ ہے۔ رسول اسی لئے بھیجا جاتا ہے کہ اجمال و غوامض کی تفصیل بتائے۔ انسانی فطرت جتنی ترقی کرتی گئی اتنے ہی کتاب و رسول کے مدارج بلند ہوتے گئے۔ ہر مرتبہ نئی کتاب اور نئے رسول کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ لوگوں نے تحریف کرکے تعلیم الٰہی کو مسخ کر دیا، مگر جب انسانی فطرت کمال کو پہنچ گئی تو اکمل

کتاب اور اکمل رسول مبعوث کیئے گئے۔ اس کتاب و نبی کا سکہ ہر زمان و مکان میں قیامت تک چلے گا۔ گویا اس طرح دین مکمل ہوگیا، اس آخری کتاب قرآن مجید نے پہلی والی تمام سماوی کتابوں کو منسوخ کر دیا۔ یہ جملہ قسم کے علم و حکمت سے معمور ہے، اس کی حفاظت خود رب العالمین نے اپنے ذمہ رکھی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

''اور بے شک ہم نے قرآن یاد کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے، ہے کوئی یاد کرنے والا۔'' (سورہ قمر)

گویا حفظ کر دینا حفاظت کی ایک ظاہری صورت ہے، اور یہ محیر العقول ہے کہ قرآن پاک کے علاوہ کوئی اور کتاب آج تک حفظ نہ کی جا سکی۔ اور اس میں ذرہ برابر بھی زیر و زبر کا فرق نہیں آیا۔ اس آیت قرآنی کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کا سمجھنا آسان ہے اور اس کے مطالب ہر کس و ناکس سمجھ سکتا ہے۔ حدیث ہے کہ:

''جس نے اپنی رائے سے قرآن مجید کے متعلق کچھ کہا وہ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں اپنا ٹھکانا بنالے۔''

ایک اور حدیث ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ اس امت کی اصلاح کے لئے ہر صدی کے آغاز میں ایک ایسا شخص بھیج دیتا ہے جو دین حق کی تجدید کرے۔''

تعلیم دین کی حفاظت و تبلیغ کا کام خود آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے خلفائے راشدین، تابعین اور آل کے سپرد کیا ہے۔ آل میں نسبی و معنوی اولاد دونوں شامل ہیں، لیکن پھر بھی نبی کریم ﷺ کے بعد ان کی تعلیم میں تحریف کرنے والے پیدا ہو گئے۔ ارشاد نبوی یہ بھی ہے کہ:

میری امت میں سے بہتر فرقے پیدا ہوں گے، ایک ناجی فرقہ ہوگا جو میری راہ پر چلے گا اور عقیدہ و عمل میں ظاہر کتاب و سنت پر کاربند ہوگا۔ باقی فرقے غیر ناجی ہوں گے جو سلف صالحین کے عقیدہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا طریقہ تلاش کر لیں گے۔

مختصر یہ کہ قرآن کی جامعیت ، فصاحت و بلاغت ، اسرار و حقائق بے مثل ہیں، بلکہ یہ کہہ دینا صحیح ہے کہ وجود نبوی خود قرآن پاک کا مظہر ہے۔

حضرت محمد ﷺ حق تعالیٰ کے آخری رسول ہیں ، وہی خاتم النبیین ، سید المرسلین ، رحمۃ للعالمین ، شفیع المذنبین اور نبی الامی بھی ہیں ۔ بعثت سے پہلے قوم نے انہیں "امین" کا لقب دیا تھا ، ان کا اسوۂ حسنہ سارے جہان کے لئے نمونہ ہے ۔ ان کے خلق عظیم کی زمین و زمان میں دھوم ہے ، ان کو علم اولین و آخرین عطا کیا گیا ہے ۔ وہ اپنی رحلت کے بعد بھی اپنی قبر مطہر میں زندہ ہیں ، جس طرح ان کی رسالت و نبوت کامل ہے اسی طرح ان کی عبدیت بھی اکمل ہے ۔ عبودیت ان کا وصف ہے ۔ رسالت و نبوت ان کا عہدہ ہے "عبدہ" کا درجہ "رسولہ" پر تقدم و فوقیت رکھتا ہے ۔ حضرت والا کا وجود مبارک حرف مشدد ہے ۔ ادھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل ۔ ان کو بے مثل بے مثال ، ہمہ جلوۂ خدا اور ہمہ شان کبریا ہونے کی وجہ سے بجا طور پر کہا گیا ہے :

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

قرآن اور رسول نے شرک کو مٹایا اور توحید کو چمکایا ، مختصراً شرک کی تشریح یہ ہے اور اہل کتاب ، کفار و مشرکین کے شرک کی کئی قسمیں ہیں :

اشراک فی العلم ، اشراک فی التصرف ، اشراک فی العبادت اور اشراک فی العادت وغیرہ ۔

جو صفات اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہیں ، ان سے یہ لوگ اپنے معبودان باطل کو متصف کرتے ہیں ، ان سب باطل عقائد کی تردید کے لئے توحید کی واضح طور پر حقیقت سمجھائی گئی ہے اور وہ خصوصیات یہ ہیں :-

۱ ۔ اللہ تعالیٰ کو واجب الوجود سمجھنا ۔

۲ ۔ عرش و کرسی ، آسمان و زمین اور ان میں جو کچھ ہے اس کا خالق اللہ تعالیٰ کو تسلیم کرنا ۔ ہر شے کا وجود اسی کی حکمت کاملہ کی وجہ سے ہے ۔

۳۔ زمان ومکان میں اللہ تعالیٰ کا تصرف ہے۔
۴۔ سوائے اللہ کے کسی اور کی عبادت نہ کرنا کیونکہ وہی عبادت کے لائق ہے: اللہ کے واجب الوجود اور خالق ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ البتہ تصرف، عبادت کے متعلق اختلاف ہے اور یہ دونوں لازم وملزوم بھی ہیں۔ عبادت کے معنی یہ ہیں کہ اپنے سے زیادہ جلیل وعظیم ہستی کے سامنے اپنے عجز وتذلل کا اظہار کیا جائے۔ مثال کے طور پر ایک محتاج وغریب بادشاہ کی قدم بوسی کرتا ہے اور ایک عبد مومن اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتا ہے، ان دونوں کی صورت ایک ہے، مگر دونوں کے معنی ایک نہیں ہیں۔ بادشاہ کے سامنے جھکنا، تحیت وتعظیم ہے اور رب العالمین کے سامنے سرنیاز جھکانا سجدۂ عبودیت ہے، مگر بادشاہ کی قدم بوسی کے معنی اور ہیں اور اللہ کے سجدے سے مختلف ہیں بادشاہ کی عظمت فانی ہے، رب العالمین کی شان رفیع حدوث وامکان کے عیوب سے منزہ وبالاتر ہے۔ بادشاہ والی عظمت کو ساجد حاصل کرسکتا ہے اور رب العالمین کی رفعت وعظمت کو ساجد کبھی بھی حاصل نہیں کرسکتا۔ معبود کے خاص صفات، قدرت، عظمت وجلال، تسخیر وتصرف اور نفاذ کلمہ ہیں، اوصاف تکوین وتخلیق سے بجز اللہ کے کوئی بھی متصف ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا اور نہ کسی انسان میں اتنی استعداد ہے مگر ذات باری تعالیٰ کے اوصاف میں سے بعض اوصاف ایسے بھی ہیں جن کا بندہ میں ہونا ممکن ہے۔ چونکہ مشترکہ اوصاف کے لئے عام طور پر ایک سے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں اور قرآن پاک میں بھی ان کے متعلق کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اس لئے اکثر کلام مقدس کے نصوص وتصریحات کو غلط معانی پر محمول کرلیا جاتا ہے۔ بس اسی کا نام شرک ہے۔ ایجاد وتخلیق اور اس نوع کے دیگر تصرفات ذات بے ہمتا کے لئے مخصوص ہیں۔ ان صفات عالیہ سے بندہ ومخلوق کی مجال نہیں کہ اپنے آپ سے متصف کریں، یا ان صفات سے کوئی کسی کو موصوف سمجھے، مشرک وہ ہیں جو اللہ کی عظمت و کبریائی کو فراموش کرکے غیروں کی پرستش کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی کامل اشخاص اور

ملائکہ سے ایسے افعال سرزد ہو جاتے ہیں جن کا صادر ہونا ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ لہذا غلط فہمی واقع ہو جاتی ہے اور بے بصیرت لوگ ان افراد کامل و ملائکہ کی تسخیر و نفاذ کلمہ کو بعینہٖ خدائے بزرگ و برتر کی تسخیر و نفاذ کلمہ کی مانند سمجھنے لگتے ہیں۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ بعض اوقات قوائے مادیہ یا روحانیہ میں کسی نہ کسی طرح یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنا مظہر یا آلہ تصرف بنالیتا ہے۔ ان کی مثال فقط آلات و جوارح کی ہوتی ہے۔ یہ اوصاف کسی دوسری ہستی میں اسی وقت ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں جبکہ وہ ہستی الوہیت کا مظہر ہو، اور الوہیت کے خصائص اس میں پائے جائیں، اس صورت میں یہ اوصاف ان کے ذاتی نہیں ہوتے، بلکہ اللہ کے عطا کئے ہوئے ہوتے ہیں اور عطائی کہلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ صفات ابلیس و آدم دونوں کو عطا کئے تھے۔ ان ہی صفات کے بل پر دونوں سے اللہ کی نافرمانی سرزد ہوئی۔ سجدہ نہ کرنے کے متعلق ابلیس نے توجیہہ کی۔ لہذا حجت کرنے کی وجہ سے مردود ٹھہرا، اور شجرہ ممنوعہ کھا لینے پر آدم علیہ السلام نے عجز و ندامت سے معافی کی درخواست کی۔ لہذا نہ صرف معاف کئے گئے بلکہ مقبول و برگزیدہ بنا لئے گئے۔ انبیاء و اولیاء افضال الٰہی کا احساس رکھنے کی وجہ سے اپنے آپ کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج سمجھا کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو محتاج سمجھنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان حضرات کو صاحب ارشاد ہونے سے پہلے فنا و بقاء کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے، جس سے وہ اپنی حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ اب شرک اس وقت ہو گا جب کسی کو کسی کمال میں مستقل بالذات تصور کیا جائے۔ اس امتیاز و فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے نہ شرک کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں اور نہ توحید تک رسائی ہو سکتی ہے۔ جن کو امتیاز کا احساس نہیں ان کا دعویٰ صحیح نہیں مانا جا سکتا۔ اللہ کو بے شک اختیار ہے کہ اپنے کسی بندے کو جس حد تک بھی چاہے بعض صفات کا سزاوار اور اہل بنا دے، مگر بندے کے یہ اوصاف عطیۂ الٰہی ہوا کرتے ہیں۔ (ملخص از حجۃ البالغہ)

کلمہ طیب: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسلام میں ایمان کی بنیاد ہے۔ اقرار توحید ورسالت ہی تمام نیکیوں کی جز ہے۔ اس کے دو جز ہیں۔ اور پہلے جز کے دو حصے ہیں۔ لا نفی کا ہے، گویا شرک سے انکار کردیا پھر الا اللہ سے اثبات کیا اور توحید حاصل ہوگئی۔ جس طرح بلندی روشنی سے پستی وتاریکی فنا ہو جاتی ہے اسی طرح توحید سے شرک دور ہو جاتا ہے۔ شرک یقیناً ہیچ ہے اور دونوں نہ ہونے ہی کی شے ہے۔ کلمہ طیب کا دوسرا جز ''محمد رسول اللہ'' ہے۔ جس میں صفت وموصوف دونوں ہیں۔ یہ ایسے معظم رسول ہیں جنہیں علم وحکمت سے نوازا گیا ہے۔ وہ عقائد باطلہ کو دور کر کے اخلاق حمیدہ کی تعلیم سکھاتے ہیں اور لوگوں کو پاک و مزکی بنا دیتے ہیں۔ یہ دوسرا جز پہلے جز کا صحیح ترجمہ و نقل ہے یعنی جس نے ''محمد رسول اللہ'' کو نہیں سمجھا اس نے ''الا اللہ'' کو نہیں سمجھا اور محض ''لا'' میں مبتلا ہو کر رہ گیا۔ جس طرح تشبیہ کفر ہے اسی طرح تنزیہہ بھی کفر ہے، حقیقت واقعی دونوں کے وسط میں ہے۔ اس دوسرے جز کی ذرا بھی تنقیص کی تو ایمان غائب اور عاقبت خراب۔ رسول کریم ﷺ کی ہدایت ہے کہ قرآن سیکھو، اور دوسروں کو سکھاؤ۔ کسی نے لطف واحترام کے ساتھ نصیحت کی ہے:۔

با خدا دیوانہ باشد با محمد ﷺ ہوشیار

یہ تمہید اس لئے اٹھائی گئی ہے کہ سید احمد صاحب کی تعلیمات کو سمجھا جائے اور کوئی مفید نتیجہ نکالا جائے، اصل یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی یا تیرھویں صدی ہجری میں سلطنت مغلیہ کے زوال کی وجہ سے ہندوستان میں مرکز متزلزل ہوگیا تھا۔ زمین وآسمان کی گردشیں بدل گئی تھیں اور زندگی کا کوئی شعبہ تباہی سے نہیں بچ سکا تھا۔ سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی خرابیاں اپنی صحت ودرستی کے لئے کسی مصلح کی متقاضی تھیں، چنانچہ اصلاح کا بیڑا سید احمد صاحب نے اٹھایا۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور مولانا فخر الدین نے اس خرابی کو دور

کرنے کی کوشش کی، ان کے بعد سید احمد صاحب کو مصلح خیال کیا جاتا ہے، انہوں نے اصلاح معاشرت کے وہی اصول اختیار کئے جو شاہ ولی اللہ نے تجویز کئے تھے۔ اب سید صاحب کی مذہبی تعلیمات کے معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس صرف تین ذریعے ہیں، ان کے مقلدین تقویۃ الایمان کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، یہ کتاب شاہ اسماعیل نے اس وقت لکھی تھی جب کہ سید صاحب پنڈاریوں میں بمقام مالوہ تشریف فرما تھے، اس وقت نہ انہیں خلافت ملی تھی اور نہ شاہ اسماعیل ان سے واقف تھے، صراط مستقیم کے متعلق بتایا گیا ہے کہ دوآبہ کے دورے کے بعد اپنے وطن کے قیام میں سید صاحب نے لکھوائی تھی صراط مستقیم کو اگر صحیح مانا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس تقویۃ الایمان کو منسوخ کر دیا اور اگر نظر ثانی شدہ تقویۃ الایمان ہے تو مشترک مضامین کے علاوہ جو اصلاح شدہ مضامین اس میں ہیں وہ سید صاحب کے بتائے ہوئے ہونا چاہئیں۔ اگر صراط مستقیم سے سید صاحب کا کوئی تعلق ہے تو حیرت ہے کہ اصلاح شدہ مضامین کو باوجود مرید ہونے کے شاہ اسماعیل نے کیوں نہیں تسلیم کیا۔ اور مشترک مضامین کو سید صاحب نے کیوں نہیں گوارا کیا اور کیوں وہ اپنے موروثی مذہب پر قائم رہے۔ سید صاحب کا ایک خط سوانح احمدی کے ضمیمہ میں موجود محفوظ ہے جو انہوں نے علمائے سرحد کے اعتراضوں کے جواب میں شاہ اسماعیل سے لکھوایا ہے۔ اس میں صاف طور پر لکھا ہے کہ:

”یہ فقیر اور اس فقیر کا خاندان ہندوستان میں گمنام نہیں ہے۔ اس فقیر کو اور اس کے بزرگوں کو سب جانتے ہیں کہ اس کا آبائی مذہب حنفی ہے اور اس زمانہ میں بھی اس فقیر کے تمام اقوال و افعال حنفیہ اصول و قوانین اور ان کے ہی آئین و قواعد پر منطبق ہیں۔ ایک بھی اصول مذکورہ سے خارج نہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ جوان اصحاب سے غفلت اور بھول چوک میں صادر ہو جاتا ہے وہ اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہیں اور مطلع ہو جانے پر راہ راست پر آجاتے ہیں۔“

اس تحریر پر دو امور ہیں:۔ ایک یہ کہ اپنے متعلق حنفی ہونے کا یقین دلایا ہے، دوسرے یہ کہ الا ماشاء اللہ لکھ کر اپنے اصحاب کی غلطی کا اعتراف کر کے معذرت کی ہے۔ یہ معذرت اس غلط وعظ کے متعلق ہے جو انکار تقلید کے جواز میں شاہ اسماعیل نے پنجتار کے جلسہ علماء میں دیا تھا۔ جس کو سن کر علمائے سرحد برگشتہ ہو گئے تھے اور خادی خان بھی اپنے مرشد (حضرت اخوند عبدالغفور صاحب سوات) کے اتباع میں سید صاحب سے منحرف ہو گیا تھا اور خود سید صاحب نے اسی وقت سب کے سامنے شاہ اسماعیل کو ڈانٹ بتائی تھی کہ تمہیں ایسی لغویات نہیں کہنا چاہیے تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ اسماعیل ہر مرتبہ اپنے عقائد کے اظہار پر معافی طلب کیا کرتے تھے، مگر اپنی توبہ پر قائم نہیں رہتے تھے۔

"امداد المشتاق" کے صفحہ ۹۷ کے مقالہ نمبر ۱۳۴ میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی روایت درج ہے کہ:

"مولوی اسماعیل شہید موحد تھے، چونکہ محقق تھے، چند مسائل میں اختلاف کیا، اور مسلک پیران خود مثل شاہ ولی اللہ وغیرہ سے انکار فرمایا۔ وحدت الوجود کے قائل تھے، اور ان کے مرشد حضرت سید صاحب مسلک وحدت الشہود کا رکھتے تھے۔ باہم گفتگو ہوئی۔ سید صاحب کچھ کبیدہ ہوئے۔ عرض کیا، یہ بات اور ہے کہ دن کو رات کہیے۔ یہ حکایت مقام مخا میں واقع ہوئی تھی۔ ایک شخص نے اس کو مجھ سے بیان کیا جو اس مجلس میں حاضر تھے۔"

مولوی کرامت علی جونپوری سید صاحب کے اعاظم خلفاء میں سے تھے، انہوں نے اپنی کتاب "نور علی نور" میں لکھا ہے کہ:

"مرشد برحق آپ مقلد تھے اور تقلید کے خلاف جو کوئی شخص کرتا تو اپنی محفل سے نکلوا دیتے تھے اور جو تعلیم پذیر ہوتا تو مرشد برحق اس کو نصیحت کر کے راہ راست پر لاتے اور یہ بات تمام ہندوستان اور بنگالہ میں

مشہور ہے۔۔۔فروع میں آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل کے قائل نہیں تھے اور نہ اس کو اچھا سمجھتے تھے۔"

اس بیان سے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ شاہ اسماعیل کا شمار تعلیم پذیر ہونے والوں میں تھا مگر نصیحت کو اور راہ راست پر آنے کو انہوں نے قبول نہیں کیا، بہر حال ان وجوہات کی وجہ سے سید صاحب کا تعلق صراط مستقیم سے قطعی طور پر منقطع ہو جاتا ہے۔ اور ان کے متعلق ایسی بدگمانی وہم میں بھی نہیں کی جاسکتی:۔

معشوق ما بہ شیوہ ہر کس برابر است
باما شراب خورد بہ زاہد نماز کرد

جب یہ ثابت ہو گیا کہ سید صاحب کا کوئی تعلق ان دونوں کتابوں سے نہیں ہے تو یہ تعلیم جو سید صاحب سے منسوب ہے وہ تعلیم در اصل شاہ اسماعیل کی ہے، یعنی شاہ اسماعیل کی تعلیم کچھ اور ہے اور سید صاحب کی تعلیم کچھ اور ہے۔ دونوں کو مخلوط کر دینا فتنہ سے کم نہیں، اور اس مخلوط تعلیم کے متعلق شاہ عبدالعزیز کی جو تصدیق وشہادت پیش کی جاتی ہے وہ سراسر غلط اور بہتان ہے۔ شاہ اسماعیل کے متعلق جو رائے شاہ عبد العزیز علیہ الرحمۃ نے ظاہر کی ہے وہ ان کی طالب علمی کے زمانہ کی ہے، اس لئے وہ ان کے نئے خیالات کے اظہار کے بعد صحیح نہیں سمجھی جاسکتی چونکہ سید صاحب شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی تقلید کرتے تھے۔ اس وجہ سے انہیں عروج ہوا اور اسی وجہ سے مشہور ہوئے۔ ان دونوں کتابوں میں جو مضامین مختلف ہیں ان کی دو ایک مثالیں امتثال امر کے لئے پیش کی جاتی ہیں:

تقویۃ الایمان مطبوعہ مرکنٹائل پریس دہلی میں ہے کہ:

ا۔ سوائے اللہ کے چاہے ہوئے کوئی کچھ نہیں کر سکتا، اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رسول کو بھی کسی قسم کا اختیار نہیں ہے اور وہ بھی ایسے ایسے ہیں (نقل کفر کفر نباشد) مگر صراط مستقیم مطبوعہ ضیائی پریس دہلی میں تحریر ہے کہ رسول کی ہستی تو بہت بڑی ہے اولیاء، قطب اور ابدال تک باذن الٰہی سب کچھ اختیار رکھتے ہیں۔"

حکیم مومن خان مومن جس طرح شاہ اسماعیل کے معتقد تھے اسی طرح مرزا غالب مولانا فضل حق خیرآبادی سے مستفیض تھے، غالب نے اپنے شعر میں یہی مضمون لکھا ہے۔

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق است
لیکن کشاد آن بہ کمان محمد ﷺ است

۲۔ تقویۃ الایمان کے مطابق "نذر و نیاز و فاتحہ شرک ہے اور اس کا کرنے والا ابوجہل کے برابر مشرک ہے"۔ لیکن صراط مستقیم کے صفحہ ۲ پر درج ہے کہ:۔

"نہ پندارند کہ نفع رسانیدن باموات باطعام و فاتحہ خوانی خوب نیست، چہ ایں معنی بہتر و افضل است"

اور صفحہ ۹۳ پر تحریر ہے:۔

"پس در خوبی این قدر امراز امور مرسومہ فاتحہا و اعراس و نذر و نیاز موات شک و شبہہ نیست"

اور صفحہ ۲۲ پر خواجگان چشت کی نذر و نیاز کرنے کا بالتفصیل طریقہ بتایا ہے جو کشود کار کے لئے مجرب ہے۔

۳۔ تقویت الایمان میں متعدد مرتبہ یہ مفہوم درج کیا ہے:۔

"خواہ یوں سمجھے کہ ان کاموں کی طاقت ان کے خود بخود ہے خواہ یوں سمجھے کہ اللہ نے ان کو ایسی قدرت بخشی ہے۔ ہر طرح شرک ہے، برخلاف اس کے صراط مستقیم کے صفحہ ۲۸ پر "علم و طاقت حاصل کرنے کے لئے شغل دورہ کی ترکیب بتائی ہے۔" صراط مستقیم کی تدوین میں شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحی کو دخل ہے، اب جو فرق تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم میں ہے وہ مولوی عبدالحی کی ترجمانی کی وجہ سے ہے۔

ان اختلافات کے علاوہ ایسی بھی متعدد مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ اسماعیل کو قرآن وحدیث کے معنی بدل دینے اور تحریف کرنے میں تکلف نہیں ہوتا

تھا۔نمونہ کے طور پر ایک مثال کافی ہے:۔

ا۔شاہ اسماعیل نے سورہ فاتحہ کا ترجمہ کیا ہے۔سب سے پہلے ایاک نعبد و ایاک نستعین کے معنی بتا کر حیرت وغصہ کا اظہار کیا ہے کہ جب یہ اقرار وعہد ہر روز ہر نماز کی ہر رکعت میں کیا جاتا ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔پھر غیر اللہ یعنی انبیاء، اولیاء، ائمہ وشہداء فرشتوں اور پریوں سے کیوں مدد مانگی جاتی ہے۔اس کا جواب علماء نے جو دیا ہے وہ اپنی جگہ ہے،مگر شاہ صاحب کے ہمعصر مرزا غالب جب یہ اتہام سنتے سنتے اکتا گئے تو انہوں نے ایک شعر نذر کر دیا:

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

اس کے بعد اھدنا الصراط المستقیم، صراط الذین أنعمت علیھم کے معنی یہ لکھے ہیں کہ "تو ہمیں وہ راستہ دکھا جس پر تیری برکت نازل ہوئی ہے اور اس راستہ سے بچا جس پر تیرا غصہ ہے"الذین کا لفظ اس ترجمہ میں ہارج ومانع ہے۔وہ اپنے ترجمہ میں بجائے راستہ کے، راستہ چلنے والوں کے الفاظ لکھتے تو ان کا ترجمہ صحیح ہو جاتا،انہوں نے بجائے راستہ چلنے والوں کے راستہ کا لفظ اس لئے لکھا ہے کہ کسی کو انکار تقلید کی تردید کا موقع نہ مل سکے۔لہذا اس تحریف کو برائے مصلحت جائز خیال کیا۔شاہ اسماعیل کو غالباً صراط مستقیم کے متعلق بھی مغالطہ ہے وہ اسے ٹھنڈی سڑک سمجھتے ہیں جس پر تفریح کے لئے چہل قدمی کی جاتی ہے اور نہیں سمجھتے کہ اس راہ راست میں بے حد اتار چڑھاؤ ہیں اور اس پر چلنے والوں کی بے طرح آزمائش کی جاتی ہے، اتنی کہ دشمنوں کی بھی نہیں کی جاتی۔بیشک در جنت سے ناک کی سیدھ پر آنکھوں کے سامنے ہے مگر یہ سیدھا راستہ نہایت نازک اور بے حد شفاف اور چکنا ہے۔اس پر چلنے سے سانس پھول جاتی ہے، دم اکھڑ جاتا ہے، پاؤں لڑکھڑا جاتے ہیں اور ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔جب ہی تو نفس پرست اور خود نماؤں کا اس پر گزر نہیں ہوتا۔

۲۔حدیث کا ترجمہ کیا ہے:۔"بھلا خیال تو کر جو گزرے میری قبر پر، کیا

سجدہ کرے تو اس پر۔" پھر اس کی تشریح میں رقمطراز ہیں کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ "میں بھی ایک دن مٹی میں ملنے والا ہوں (۱)" ناطقہ سر بہ گریبان ہے اسے کیا کہیے، رہا طریقہ محمدیہ "صراط مستقیم" میں اس کی ایجاد کا مقصد سید صاحب نے خود یہ بتایا ہے کہ جملہ سلسلوں میں اتحاد پیدا کیا جائے۔ چاروں طریقوں میں رسول خدا ﷺ سے نسبت بطور باطن کے ہے اور نسبت ہمارے طریقہ محمدیہ کی رسول اللہ ﷺ سے بطور ظاہر کے ہے یعنی اس طرح شریعت کو طریقت پر ترجیح دی ہے اور آخر کار طریقت سے فرار کی صورت نکالی ہے اور بقول ان کے اپنے ایک فرضی خلیفہ عبد الرحیم فاطمی سے شہادت دلوائی ہے کہ:

"مجھے باطنی اشغال سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اب سید صاحب کے طریقہ کے ظاہری اعمال سے مثلاً گھاس کاٹنے اور دیوار بنانے سے سب کچھ مل گیا۔ اس سے پہلے اگر مر جاتا تو عاقبت خراب ہو جاتی۔"

ہر شخص جانتا ہے کہ شریعت سیکھ لینے کے بعد طریقت کی منزل آتی ہے، مگر طریقہ محمدیہ میں معاملہ دگرگوں ہے۔ یعنی حب ایمانی اور حب عشق کی ترتیب بدل کر مؤخر کو مقدم کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا خود ارشاد ہے جس سے ترتیب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "شریعت میرے اقوال، طریقت میرے افعال اور حقیقت میرے احوال ہیں"۔

شریعت و طریقت میں بظاہر دوئی معلوم ہوتی ہے مگر باطن ہمہ دونوں میں اتحاد ہے، ایک ہی زنجیر کی دونوں کڑیاں ہیں۔ اب چاروں سلسلوں کی نسبت باطنی میں نسبت ظاہری کو داخل کر کے عقل حیران ہے کہ اتحاد پیدا کیا یا تفرقہ کی بناڈالی۔ یہ چاروں سلسلے خود ہی پہلے سے آپس میں متحد ہیں، پھر نئی ایجاد کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی۔

۱۔ الکوکبۃ الشہابیہ میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ نے ایسے اختلافوں اور تحریفوں کی ستر مثالیں درج کی ہیں۔

طریقہ محمدیہ کا جو اصول سید صاحب کی زبان سے کہلوایا ہے وہ سید صاحب
کے مسلک کے قطعی خلاف ہے۔ لہذا یہ بھی شاہ اسماعیل کی ایجاد کا ایک ادنیٰ ثبوت
ہے۔ سید صاحب سے اس کا بھی کوئی تعلق نہیں اور شاہ عبد الرحیم فاطمی کو سید صاحب کا
خلیفہ ظاہر کر کے یہ بتایا ہے کہ شاہ عبد الرحیم فاطمی کو شاہ عبد الباری امروہوی سے نہ فیض
حاصل ہوا تھا، اور نہ خلافت ملی تھی۔ اس دعویٰ کو سن کر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی شاخ
صابری نہیں رہتی، بلکہ نقشبندی بن جاتی ہے۔ اس کا فیصلہ حاجی صاحب کے مرید اور
شاہ اسماعیل کی جماعت خود طے کرے تو بہتر ہو، ویسے حقیقت کا علم اللہ ہی کو ہے۔

شاہ اسماعیل کی تعلیم جدت سے بھری ہوئی ہے۔ ان کے معیار و نظریہ کو
بڑے غور وخوض سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تقویۃ الایمان کے شرک و توحید والے
باب میں صفحہ پانچ پر لکھتے ہیں:

"اول سننا چاہیے کہ شرک لوگوں میں پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب
ہے لیکن اکثر لوگ توحید کے معنی نہیں سمجھتے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں،
حالانکہ شرک میں گرفتار ہیں۔"

یہاں لوگوں سے ان کی مراد مسلمانوں سے ہے، وہ شرک میں گرفتار ہو گئے
ہیں۔ ان کو شرک سے نجات دلانے کے لئے توحید کے بجائے شرک کی تفصیلات سے
واقف کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک توحید مرکز ہے اور اس کا دائرہ شرک ہے۔
جس نے مرکز کو محدود و مقید کر رکھا ہے، وہ وسط کے قائل نہیں ہیں اور صرف ایک حد پر
قائم رہنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں کل دائرہ شرک سے بھرا ہوا ہے۔ توحید لفظ کن
سے اپنا کام بنالیتی ہے، اسے نبیوں ولیوں اور اماموں جیسے محرم و خدمتگار کی ضرورت
نہیں، برخلاف اس کے شرک کے پاس ہر قسم کے اسباب ہیں۔ اس کی فوج عظیم و کثیر
ہے۔ اسی واسطے وہ توحید کے معاون و مددگار بن کر شرک کی مخالفت میں مشغول ہو
جاتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ توحید کو ان کی مدد درکار نہیں ہے۔ اسی لئے ظہور اسلام سے

پہلے اہل کتاب اور بت پرست وغیرہ کے جتنے بھی شرک تھے وہ سب ہم عاصی مسلمانوں پر منطبق کر دیئے اور شرک کے متعلق جتنی بھی آیات قرآنی تھیں وہ ہم پر عائد کر دیں۔ اب جبکہ مسلمانوں کو قطعی مشرک بنا دیا تو ان کا قتل کر دینا بھی جائز ہو گیا۔ اس طرح توحید کی طرف آنے کے تمام راستے بند کر دیئے، حالانکہ توحید خود وسیع النظر ہے اور وسعت چاہتی ہے۔ اندریں حالات وہ اپنے آپ کو اپنی مٹھی بھر جماعت کو ہی توحید پرست سمجھتے ہیں اور خدا کا منشائے تبلیغ پورا کر دیتے ہیں۔ عام اور حقیقی مشرکین کو وہ قابل توجہ نہیں سمجھتے۔ صرف مسلمانوں اور کلمہ گویوں پر خاص نظر رکھتے ہیں۔ ان کے اصول و احکام کی فہرست کچھ ایسی بنتی ہے:۔

۱۔ تقلید شرک عظیم ہے۔ باپ دادا اور علماء و ائمہ کی کبھی نہ سنو۔

۲۔ قرآن سمجھنے کے لئے زیادہ علم کی ضرورت نہیں، اس کو اپنے مبلغ علم کے مطابق سمجھا جا سکتا ہے۔

۳۔ وسیلہ، شفاعت اور اجماع بے معنی الفاظ ہیں۔

۴۔ انبیاء و اولیاء کو قدرت نہیں لہٰذا ان سے مدد مانگنا فضول ہے۔

۵۔ اولیاء کا فیض اور ان کی کرامت نا قابل توجہ ہے۔

۶۔ اولیاء وغیرہ کو ندا کرنا شرک ہے، محفل میلاد بدعت ہے۔

۷۔ نذر و فاتحہ کی ضرورت نہیں۔

۸۔ نماز میں رسول کا خیال آجانا حرام ہے۔

۹۔ کسی کے نام پر جانور ذبح کرنا کفر ہے۔

۱۰۔ چونکہ اختیار نہیں رکھتے اس لئے انبیاء و اولیاء وغیرہ سب بھوت پریت کی برابر اور ان کی مثل ہیں۔

۱۱۔ آمین بالجہر اور رفع یدین کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

۱۲۔ قبروں پر روشنی کرنا شرک ہے۔

۱۳۔ تصوف بدعت ہے۔
۱۴۔ تصور شیخ مشرکوں کا طریقہ ہے۔
۱۵۔ کثرت ذکر جائز نہیں۔
۱۶۔ رسول کو غیب کا علم نہیں ہے۔
۱۷۔ خاتم النبیین کا نظیر ممکن ہے۔
۱۸۔ رحلت کے بعد رسول مثل عام مردوں کے ہے، اور ان کی حیات ختم ہو گئی۔ قیامت میں اٹھیں گے۔
۱۹۔ بزرگوں کے مزارات پر جانے کے لئے سواری کا انتظام کرنا شرک ہے۔
۲۰۔ وغیرہ وغیرہ۔

اسماعیلی جماعت ان اختراع و اصلاح کو شاہ اسماعیل کا شاہکار سمجھتی ہے لیکن ان کی ذاتی جدت نہیں ہے بلکہ ابن تیمیہ اور ابن عبد الوہاب کی عطا کردہ ہے۔ سب سے پہلے اپنے زمانہ میں ابن تیمیہ کی تقلید میں ابن عبد الوہاب نے دعویٰ کیا کہ میں نیا دین لے کر آیا ہوں اور یہ دعویٰ اس وقت کیا تھا جبکہ امیران عرب اقتدار کے لئے آپس میں برسر پیکار تھے، ابن عبد الوہاب نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اول اول امیر عینیہ سے ساز کیا، لیکن جب وہ ان سے منحرف ہو گیا تو امیر درعیہ عثمان کی تائید و حمایت حاصل کی، مسلمانوں کو مشرک قرار دے کر جہاد کا اعلان کیا اور مصر و عرب میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا، اس طرح دونوں کو فائدہ ہوا۔ ابن سعود کی ریاست میں اضافہ ہوا اور ابن عبد الوہاب کی تعلیم کی اشاعت ہوئی۔ اس جوڑ توڑ کی وجہ سے ابن عبد الوہاب کو ابن تیمیہ پر فوقیت حاصل ہے، جب ابن تیمیہ نے اپنی جدتوں کا اعلان کیا تو حکومت نے نہ صرف باز پرس کی بلکہ متعدد قید و بند کی سزائیں بھی دیں۔ لہذا ان کی تعلیم بار آور نہ ہو سکی، مگر ان کی شکست خوردہ ذہنیت کے جوہر اس وقت کھلے جبکہ نو مسلم چنگیزی مغل غازان خان نے مصر پر حملہ کر دیا۔ اس حملہ سے پہلے

وہ غازن خان کے دربار میں حاضری دے آئے تھے۔ اس نے کاان استقبال احترام کے ساتھ کیا تھا اور ان سے دعائے برکت حاصل کی تھی۔ پھر اس نے قدر دانی و عقیدتمندی کی بنا پر ان کے کہنے سے جنگ حمص میں جو مسلمان عیسائی اور یہودی گرفتار کئے تھے ان سب کو رہائی بھی عطا کر دی تھی۔ مگر اب حملہ مصر کے وقت ابن تیمیہ نے غازن خان کے خلاف نہ صرف فتوے دیئے بلکہ کمزور مصریوں کی ہمت بھی بڑھائی اور خود جہاد میں شریک ہوئے۔ اس جہاد کی کامیابی نے ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔ یعنی یہ کہ ان کی تجدید سے زیادہ ان کا جہاد کامیاب رہا۔

اب یہاں ہندوستان میں ان دونوں کی تقلید میں شاہ اسماعیل نے نام اچھالا اور ایک نیک انسان سید احمد بریلوی کے پردے میں تبلیغ و جہاد کی کوشش کی۔ مگر مشہور ہے۔ نقل را چہ عقل۔ لہذا کامیابی نہ ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔ جس وقت شاہ اسماعیل نے اعلان کیا ہے انگریز تسلط جمانے کے لئے مسلمانوں کو تباہ کر رہے تھے، پادری ہندوستان کے مذاہب کی تردید کرنے کے لئے کوچہ و بازار میں سرگرداں تھے۔ دیہاتی مکتبوں میں عیسوی تعلیم کی ترویج ہو رہی تھی۔ اور سلطنت مغلیہ پر نزع کا عالم طاری تھا۔ سید صاحب کی ولایت اور شاہ اسماعیل کی علمی فضیلت ان تمام مصائب سے بے نیاز رہی اور اپنی تعلیم کا ان صاحبان نے جھنڈا بلند کیا۔ اشاعت تعلیم کے سلسلہ میں ان کے فرائض میں تھا کہ کالے پادریوں کی تکذیب کرتے اور اسلام کی فوقیت ثابت کرتے مگر انہوں نے اس طرف نگاہ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھا، صرف اس لئے کہ پادری انگریز حکام کے ہم مذہب تھے اور انگریز حکام کی انہیں خاطر منظور تھی۔ اصل یہ ہے کہ انگریز نے ان کی حسب ضرورت مدد بھی کی۔ غالباً ان ہی کے اشارے سے یہاں کے مسلمانوں کو خاک بہ سر چھوڑ کر اور اپنے معتقدین کو ساتھ لے کر حج و جہاد کے حیلے سے ہندوستان سے باہر گئے تھے لیکن جب انہوں نے اس دار فانی سے سفر کیا تو اس کے چند سال بعد کچھ معمولی اسباب اور بھی ہوں مگر در اصل انگریزوں کی زیادتوں

اور کالے پادریوں کی اشاعت مسیحیت کی وجہ سے ۱۸۵۷ء میں فتنہ و فساد ہوا جس کو انگریز "غدر" سے اور وطن پرست "تحریک آزادی" سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ تحریک آزادی بھی سید صاحب کے جہاد کی طرح بے نتیجہ نکلی۔
"خیر خاک برسر کن غم ایام را" مگر یہ واقعہ ہے کہ ابتداء میں انگریزوں نے جماعت اسماعیلیہ کو شہ دی پھر مطلب نکل جانے کے بعد آخر میں بری طرح آنکھیں پھیر لیں۔

بہر حال ان موحدوں کا دعویٰ اتحاد راہ دراز اختیار کر کے مسلمانوں کے اختلاف و انتشار کا باعث بنا، انہوں نے اپنی حسن قابلیت سے جزیات پر طبع آزمائی کی۔ اپنی دماغی کاوشوں سے فروعات کو چمکایا، اور کلیات کی شکل وصورت بگاڑ دی۔ شرک کا خوف ان کے دل و دماغ پر اس قدر چھا گیا کہ خواب میں بھی شرک ہی شرک نظر آنے لگا۔ اسی وجہ سے ان کے نظریات میں بدرجۂ اتم تذبذب موجود ہے اور اس کی تصدیق وشہادت تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم کے اختلافات اور مضامین سے ہو جاتی ہے۔ بالفرض انہیں اپنے معتقدات پر وثوق تھا تو در پردہ شاہ عبد العزیز سے استفسار کیوں کئے جاتے تھے۔ فتاویٰ عزیزیہ میں ان کا سوال ایک بت پرست اور ایک عالم کے مکالمہ کی صورت میں محفوظ وموجود ہے اور وہ سوال یقیناً شاہ اسماعیل کی تعلیم کا لب لباب اور خلاصہ ہے۔ ان کی یہ پریشانی محض تقلید سے انحراف کرنے اور صفات الٰہی، صفات انبیاء واولیاء اور صفات انسانی میں امتیاز نہ کر سکنے کی وجہ سے ہے، ان کے جملہ اختراعات ان ہی مغالطوں پر مبنی ہیں۔ شاہ عبد العزیز کا اطمینان بخش جواب لاجواب ہے مگر ان کی سمجھ میں کب آنے والا تھا۔ اہل نظر اگر ذرا تفکر و تدبر سے کام لیں تو شاہ اسماعیل کی اصلاح و تعلیم میں سوائے تخریبی پہلو کے کوئی خاص تعمیری پہلو نہیں دکھائی دے گا۔

اب حضرت شاہ عبد العزیز کا جواب ملاحظہ ہو:

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ

سے ''موحد'' کا سوال اور ان کا جواب لاجواب سوال

ایک بت پرست، بت سے مدد مانگ رہا تھا، ایک عالم نے منع کیا کہ شرک مت کرو۔ بت پرست نے کہا کہ خدا کا شریک سمجھ کر اگر اس کی پرستش کروں تو کیسے شرک ہوگا۔ عالم نے کہا: قرآن شریف میں متواتر آیا ہے کہ ''غیر خدا سے مدد مت مانگو'' بت پرست نے کہا کہ انسان ایک دوسرے سے کیوں سوال کرتے ہیں۔ عالم نے کہا کہ انسان زندہ ہیں اور یہ بت مثل کنہیا و کا لکا وغیرہ کے مردہ ہیں۔ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے۔ بت پرست نے کہا کہ قبروالوں سے مدد اور شفاعت طلب کرتے ہو، چاہیے کہ تم پر بھی شرک عائد ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ اہل قبور سے جو تمہارا مقصود و مراد ہے ویسا ہی کالکا کی تصویروں سے ہمارا ہے۔ ظاہری طور پر نہ قبر والے طاقت رکھتے ہیں اور نہ بت۔ اگر کہو کہ قبر والے قوت باطن سے کشائش حالات کرتے ہیں تو بہت جگہ بتوں سے بھی حاجت روائی ہوتی ہے اور اگر تم کہو کہ ہم اہل قبور سے کہتے ہیں کہ خدا سے ہمارے لئے شفاعت کیجئے تو ہم بھی بتوں سے ایسی ہی استدعا کرتے ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ اگر اہل قبور سے استمداد کا جواز ثابت ہوتا ہے تو بعض ضعیف الاعتقاد مسلمان سیتلا اور مسانی کے پوجنے سے کیسے باز آجائیں گے؟

جواب

اس سوال میں چند جگہ اشتباہ واقع ہوا ہے۔ اس سے خبردار رہنا چاہیے تاکہ اللہ کے فضل سے سوال کا جواب اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ مدد چاہنا اور چیز ہے اور پرستش دوسری چیز ہے۔ عام مسلمان اہل قبور سے مدد چاہتے ہیں، پرستش نہیں کرتے۔

بت پرست مدد بھی چاہتے ہیں اور پرستش بھی کرتے ہیں۔ پرستش یہ ہے کہ سجدہ کرے یا طواف کرے یا اس کے نام کو بطریق تقرب ورد کرے یا اس کے نام پر جانور ذبح کرے یا اپنے آپ کو اس کا پجاری کہے۔ اگر کوئی جاہل مسلمان اہل قبور کے ساتھ ایسا کرتو وہ فوراً کافر ہو جائے گا۔۔۔ دوسرے مدد چاہنا دو طور پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ایک مخلوق کا دوسرے مخلوق سے مدد چاہنا۔ جیسے امراء و بادشاہ سے نوکر اور فقیر مدد چاہتے ہیں اور عوام الناس اولیاء سے چاہتے ہیں کہ جناب الٰہی میں ہماری حاجت عرض کیجئے اس قسم کی مدد شرع میں زندہ و مردہ دونوں سے جائز ہے۔ دوسرا طریقہ مدد چاہنے کا یہ ہے کہ جو چیزیں بالاستقلال جناب الٰہی کے ساتھ خاص ہیں جیسے بیٹا دینا، مینہ برسانا، بیماری دور کرنا، عمر دراز کرنا وغیرہ کسی مخلوق سے چاہے اور اللہ سے دعا و سوال کرنا نیت میں نہ ہو۔ (یعنی یہ سمجھے کہ یہ چیزیں یہ بزرگ خود دیں گے) اس طرح کی مدد مانگنا حرام مطلق بلکہ کفر ہے۔ اور اگر کوئی مسلمان کسی زندہ یا مردے سے اس قسم کی مدد چاہے تو اسلام سے خارج ہو جائے، برخلاف بت پرستوں کے کہ وہ اس قسم کی مدد اپنے معبودان باطل سے چاہتے ہیں اور اس کو جائز سمجھتے ہیں۔

یہ بات جو بت پرست نے کہی کہ میں اپنے بتوں سے شفاعت چاہتا ہوں، یہ بڑے دھوکے اور فریب کی بات ہے، اس لئے کہ بت پرست ہرگز شفاعت نہیں چاہتے بلکہ شفاعت کے معنی تک نہیں جانتے۔ ان کے دلوں میں شفاعت کا تصور تک نہیں ہوتا۔ شفاعت کے معنی سفارش ہیں اور سفارش یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے مطلب کو کسی اور کی خدمت میں عرض کرے۔ بت پرست اپنے مطالب کی درخواست کے وقت نہ یہ سمجھتے ہیں کہ تم پروردگار کے حضور میں ہماری سفارش کردو اور ہماری مراد اس سے پوری کروادو۔ بلکہ وہ خاص اپنے بتوں سے ہی درخواست مطلب کرتے ہیں اور بت پرست کا یہ کہنا کہ اہل قبور سے جو تمہارا مقصد ہے وہی ہمارا لکا اور کنہیا کی تصویروں سے ہے۔ یہ بات بھی غلط در غلط ہے، اس لئے کہ جو جسم قبروں میں دفن ہیں ان کی ارواح کو ان کے ساتھ تعلق ضرور رہتا ہے کیونکہ وہ روحیں مدت دراز تک ان

جسموں میں رہی ہیں اور بت پرست اپنے معبودوں کی قبروں کی تعظیم نہیں کرتے بلکہ اپنی طرف سے تصویریں، پتھر، درخت اور دریا قرار دیتے ہیں کہ فلاں کی یہ صورت ہے، بغیر اس کے کہ ان چیزوں کو ان کی روحوں کے ساتھ کچھ بھی تعلق ہو یا ان کے بدن وہاں چلے ہوں، اس اختراعی قرارداد میں کچھ اثر نہیں۔ ہاں بندوں کا حاجت روا خالق اکبر ہے جو اپنی رحمانیت سے ان کی مرادیں پوری کرتا ہے اور ناداں بت پرست سمجھتے ہیں کہ یہ تمام فائدے بتوں نے پہنچائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ اپنے بندوں کے حالات جانتا ہے۔ اس کو ان کی اس زندگی میں حاجت روائی منظور ہے، چاہے یہ اپنا مطلب کسی سے بھی مانگیں مگر دیتا وہی ہے جیسے شفیق باپ اپنے چھوٹے بچے کی حاجت کو جانتا ہے اور جب وہ بچہ خدمت گار یا دایہ سے کچھ مانگتا ہے تو وہ چیز باپ دے دیتا ہے۔ ایسا ہی بتوں کا حال ہے بلکہ اہل اسلام کے قاعدے کے مطابق اہل قبور سے مانگنے والے کو اللہ ہی دیتا ہے۔۔۔۔ اور سائل نے یہ جو لکھا ہے کہ جب اہل قبور سے مدد چاہنی جائز ثابت ہوتی ہے تو ضعیف الاعتقاد مسلمان سیتلا و مسانی کے پوجنے سے کیسے باز آجائیں گے۔ تو جب جواب یہ ہے کہ اہل قبور سے مدد چاہنے اور سیتلا و مسانی کے پوجنے میں کئی وجہ سے فرق ہے۔

"اول: یہ کہ اہل قبور صالحین اور بزرگ لوگ ہیں جن کے حالات خوب معلوم ہیں اور سیتلا و مسانی وہمی ہیں جن کی نسبت یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کیسے تھے بلکہ ظاہراً معلوم ہے کہ یہ سب ان کی خیال بندی ہے۔

دوسری یہ بات ہے کہ اگر سیتلا و مسانی کو فرض بھی کر لیا جائے کہ وہ بھی تھے تو وہ خبیث ارواح اور شیطانی وجود ہوں گے جنہوں نے خلق کی ایذا رسانی پر کمر باندھ رکھی ہے (جیسا کہ ہنددؤں کے اعتقاد سے ظاہر ہے) ان کو انبیاء و اولیاء کی پاک روحوں سے کیا مناسبت۔

تیسری بات یہ ہے کہ اہل قبور سے مدد مانگنا بطریق دعا کے ہے کہ جناب الٰہی میں عرض کر کے ہماری حاجت روائی کر دیا کیجئے اور بتوں وغیرہ کی پرستش اس

اعتقاد کی بناء پر ہے کہ وہ قادر مستقل ہیں اور یہ اعتقاد کفر خالص ہے"۔(۱)

اس جواب سے ظاہر ہو گیا کہ نذروں اور نیازوں کا ثواب بزرگان دین کی ارواح کو پہنچانا اور بارگاہ حق میں انہیں شفیع جاننا بالکل حق اور موافق شرع ہے۔ مسلمان اہل قبور اور اولیاء کی پرستش نہیں کرتے جیسے کہ بتوں کی ہندو کیا کرتے ہیں۔ مسلمان تو صرف شفاعت چاہا کرتے ہیں مگر شاہ اسماعیل نے اپنے عقیدہ کی بناء پر شاہ عبدالعزیز کے جواب کی پرواہ نہیں کی اور اپنے عقیدہ پر نہ صرف قائم رہے بلکہ اپنے اختراعات پر اصرار بھی کیا ان کی جدتیں تحریف پر مبنی ہیں، اور تحریف وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اصل مضمون یا علم پر پورا عبور ہو ورنہ تحریف مہمل ٹھہرے گی۔ بتایا گیا ہے کہ تحریف کیوں کی جاتی ہے۔ اس کے اسباب یہ ہیں۔ تہاون وتساہل، تعمق، تشدد فی الدین اور استحسان۔(۲)

استحسان کو فقہاء نے قیاس خفی سے موسوم کیا ہے لیکن اس کے معنی "تشریع بالرائے" کے ہیں۔ ابلیس نے حکم الٰہی کی نافرمانی کر کے اپنی رائے سے کام لیا تھا لہذا سب سے پہلے اسی نے قول بالرائے کو وضع کیا۔ تعلیم سے انکار کرنے کے بعد قرآن کو بالرائے سمجھنا فرعونیت کے دروازے کھولنے کے برابر ہے۔ تحریف تنگ نظر اور متعصب بنا دیا کرتی ہے، چنانچہ شرک کی مخالفت کرنے کے سلسلہ میں ان کو نفی کرنے کی اس قدر عادت پڑ گئی کہ نبی کریم ﷺ کے متعلق "شد رحال" اور "امکان نظیر" جیسی لاطائل و بے سود بحثیں ایجاد کر لیں یعنی رسول اللہ ﷺ کے روضہ کی زیارت کے لئے سواری کا انتظام کرنا جائز نہیں۔ اور یہ کہ خاتم النبیین جیسا رسول پیدا کرنے کی اللہ کو قدرت ہے۔ امکان نظیر کی بحث کا فیصلہ مرزا غالب مرحوم نے بڑے لطیف انداز میں کیا ہے، جناب مہر صاحب کا ارشاد ہے کہ مولانا فضل حق صاحب کا بتایا ہوا نکتہ ہے، صحیح مگر حقیقت تو واضح کر دی:۔

۱۔ فتاویٰ عزیزیہ ۲۔ تفصیل وشرح حجۃ البالغۃ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است — قدرت حق را نہ یک عالم بس است

خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے — ہم بود ہر عالمے را خاتمے

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃ للعالمینے ہم بود

کثرت ابداعِ عالم خوب تر — یا بہ یک عالم دو خاتم خوب تر

در یکے عالم دو خاتم را مجوئی — صد ہزاراں عالم و خاتم بگوئی

غالب ایں اندیشہ پذیرم ہے — خردہ ہم بر خویش می گیرم ہے

اے کہ ختم المرسلینش خواندہ — دانم از روئے یقینش خواندہ

ایں الف لامے کہ استغراق راست — حکم ناطق معنی اطلاق راست

شاہ ایجاد ہر عالم یکے است — گر دو صد عالم بود خاتم یکے است

منفرد اندر کمال ذاتی است — لا جرم مثلش محال ذاتی است

زیں عقیدت بر نگردم و السلام

نامہ را در می نوردم و السلام

شاہ اسماعیل کی دماغی قلابازیاں ذات نبوت ہی تک رہیں اور شکر ہے کہ کمزوری اور کم ہمتی کی وجہ سے وہ ایک قدم آگے نہ بڑھا سکے ورنہ یہ کہہ سکتے تھے کہ خدا میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اپنی نفی کر سکے۔ چونکہ وہ اپنے وجود سے انکار نہیں کر سکتا اس لئے مجبور ہے۔ یہ واقعی ان کا کرم ہے کہ خدا کی نعوذ باللہ اس مجبوری کو معاف کر دیا۔

ا۔ شاہ اسمعیل کی تعلیم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تقلید نا جائز ہے مگر انہوں نے اپنے اس حکم کی سند نہیں پیش کی ہے۔ خدا جانے یہ کسی پیش رو کی نقالی ہے یا شاہ صاحب کی اپنی ذاتی رائے اور اختراع ہے۔۔۔۔ لیکن اسلام میں مطلقاً تقلید اور تقلید مجتہدین کے ثبوت موجود ہیں۔ تقلید کا واجب و ضروری ہونا آیات قرآنی، احادیث نبوی، عمل امت اور اقوال مفسرین و محدثین سے روز روشن کی طرح واضح و ثابت ہے۔ اس کا خلاف کرنے والا جاہل محض ہے۔ اس موضوع پر علماء کرام نے جامع و مانع کتب لکھی ہیں جن کا جواب مقلدین شاہ اسماعیل کے پاس نہیں ہے۔

۲۔ طریقت میں بیعت جو لی جاتی ہے اس میں عہد لیا جاتا ہے کہ مرید مرشد کی تقلید کرے گا اور انحراف کرنے سے مردود بیعت ہو جائے گا۔ شاہ اسماعیل نے سید صاحب سے بیعت ضرور کی مگر عہد کو نبھانا نہیں، اس لئے کہ وہ تقلید کے منکر تھے۔

۳۔ تجربہ شاہد ہے کہ ہر علم وفن کی بقا وترقی تقلید ہی پر منحصر ہے بغیر اپنے بنیادی اصول کے اور بغیر استاد کی رہنمائی کے کوئی علم وفن پروان نہیں چڑھ سکتا۔ ہر علم وفن کے اصول اسلاف سے ہی منتقل ومنقول ہوتے ہیں اور قول بالرائے سے کبھی فائدہ نہیں پہنچتا۔

۴۔ تقلید شخصی کا خواہ کس قدر بھی انکار کیا جائے مگر تقلید کے بغیر چارہ نہیں۔ غیر مقلد کہلانے والا اگر ائمہ مجتہدین کی تقلید نہیں کرے گا تو ان کی تقلید کرے گا جنھوں نے اسے تقلید کرنے سے منع کیا ہے۔ چنانچہ یہی چلا آتا ہے کہ یہ لوگ ائمہ اربعہ کا انکار کر کے نہ صرف ان سے کم تر درجہ کے لوگوں کے مقلد ہو جاتے ہیں بلکہ گمراہوں کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ اس کی مثال جناب ابوالکلام آزاد کے حالات سے ملتی ہے۔ وہ زیر عنوان ''سرسید کی تقلید کا دور'' لکھتے ہیں:۔

''اچانک ایک نئی راہ سامنے آئی۔ میرا اشارہ سرسید کے مصنفات کی طرف ہے، چونکہ اس واقعہ نے میرے عقائد وافکار کی زندگی پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔۔۔۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ گمراہی کی موجودہ ترتیب یوں ہے کہ پہلے وہابیت، پھر نیچریت، نیچریت کے بعد اس کی قدرتی منزل، جو الحاد قطعی کی ہے۔ اس کا وہ ذکر نہیں کرتے تھے اس لئے کہ وہ نیچریت کو ہی الحاد قطعی سمجھتے تھے لیکن میں تسلیم کرتے ہوئے اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ تیسری منزل الحاد ہے اور ٹھیک ٹھیک مجھے یہی پیش آیا۔ سرسید مرحوم کو بھی پہلی منزل وہابیت ہی کی پیش آئی تھی۔ اصل یہ ہے کہ عقائد وفکر کے توسیع وتطور کے لئے پہلی چیز یہ ہے کہ تقلید کی بندشوں سے پاؤں آزاد ہوں۔ وہابیت اس زنجیر کو توڑتی ہے۔ اب اگر اس کے بعد آزادیٔ فکر، بے قیدی ومطلق العنانی کی صورت اختیار کرلے تو بلاشبہہ یہ نہایت

معرصورتیں بھی اختیار کرسکتی ہے"۔(۱)

پھر لکھتے ہیں:۔

"میں بت کی طرح سرسید کی پوجا کرتا تھا۔۔۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان تقلید سے کبھی باز نہیں آتا۔ ترک تقلید ہی کے نام پر وہ جن شخصوں کی عزت کرتا ہے۔ ان ہی کی تقلید شروع کردیتا ہے۔ میں نے سرسید سے سب سے بڑی چیز جو اس وقت پائی تھی وہ یہی ترک تقلید تھی۔ مفسرین کی۔ فقہاء کی، محدثین کی، تمام علماء کی، تیرہ سو برس کے تمام اعتقادات وعقائد ومسلمات کی، اور ان کروڑوں اور ان گنت مسلمانوں کی جو تیرہ صدیوں میں گزرے ہیں۔ تاہم میں خود سرسید کا نہ صرف مقلد اعمیٰ تھا بلکہ تقلید کے نام سے پرستش کرتا تھا"(۲)

پھر اس کا نتیجہ برآمد ہوا۔ وہ بھی جناب ابوالکلام کی زبانی سنئے:

"چند دنوں کے بعد شک واضطراب نے انکار تک رسائی پیدا کرلی۔۔۔ چند دنوں کی فکر وکش مکش کے بعد ایک دن شب کو آخری فیصلہ کرلیا اور صبح سے نماز ترک کردی۔"(ص ۴۰۰) اناللہ وانا الیہ راجعون۔

غیر مقلدوں کی تقلید اور اس کے برے نتائج خود ایسے شخص نے بیان فرمائے ہیں جو آخر تک غیر مقلد ہی رہے۔

اس واقعہ کو سامنے رکھ کر اسماعیلیوں کو سوچنا چاہیے کہ وہ شاہ اسماعیل کے مقلد اعمیٰ ہیں یا نہیں۔۔۔ بہر حال ہمیں تو یہ دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ:

﴿اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم﴾

اور فرمایا گیا ہے کہ:

﴿فاتبعوا ملة ابراهيم حنيفا﴾(۳)

۱۔ ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی: ۳۶۸ ۲۔ ایضا: ۱۔۳۷۰

۳۔ مسئلہ تقلید واجتہاد کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ نے "عقد الجید" میں جو کچھ لکھا ہے وہ لائق مطالعہ ہے۔

۵۔ شرک وتوحید کی حقیقت حضرت امام فخر الدین رازی کے ایک واقعہ سے بھی واضح ہوسکتی ہے۔ امام صاحب علم وفضل میں بلند درجہ رکھتے تھے۔ مختلف بیش بہا تصانیف کے مالک ہیں جن میں تفسیر قرآن اور دیگر کتب بہت مشہور ہیں اور پھر بادشاہ کے محکمۂ قضا کے افسر اعلیٰ بھی وہی تھے۔ شیطان کو رد کرنے کی تین سو پینسٹھ تدبیریں انہوں نے اپنی کتاب میں لکھی ہیں۔ حضرت نجم الدین کبریٰ کی فقیری پر ان کی مقبولیت دیکھ کر امام صاحب کی پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے اور انہیں حضرت نجم الدین کبریٰ سے کوئی شغف نہیں تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ شاہزادہ بیمار ہوا اور قریب مرگ ہوگیا تو بادشاہ سے کہا گیا کہ حضرت نجم الدین کبریٰ سے دعا کے لئے رجوع کیا جائے۔ بادشاہ نے شاہ نجم الدین کو بلا بھیجا اور اپنے برابر تخت پر انہیں جگہ دی جو امام صاحب کو شاق ہوا۔ اس لئے کہ ان کو یقین تھا کہ ان کو ان سے نیچے جگہ دی جائے گی، بہر حال حضرت شیخ سے علاج اور دعا کی استدعا کی گئی تو شاہ صاحب نے امام صاحب سے دریافت کیا کہ یہ حدیث کہ مومن کا جھوٹا شفا ہے صحیح ہے یا ضعیف ہے؟ امام صاحب نے جواب دیا کہ صحیح ہے، مگر پسینہ آگیا اور طوطے ہرن ہوگئے۔ برجستہ حضرت نجم الدین نے گزارش کی کہ امام صاحب آپ سے بڑھ کر مومن کون ہوسکتا ہے، پانی منگایئے اور بسم اللہ کہہ کر شہزادے کو اپنا جھوٹا پانی پلا دیجئے۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ حشر و نتیجہ سمجھ کر امام صاحب کی بری حالت ہوگئی، اور حضرت نجم الدین نے اصرار کیا کہ آپ اپنا جھوٹا پانی پلا دیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اللہ کے فضل سے شاہزادے کو شفا ہوگئی۔ اس کے بعد امام صاحب کی کشمکش اور خلش اتنی بڑھی کہ اس کو دور کرنے کے لئے حضرت نجم الدین کبریٰ کے مرید ہوگئے۔ بیعت کے بعد بھی فضیلت علم کی وجہ سے چون وچرا کی عادت باقی رہی۔ آخر کار جب آخری وقت آیا اور امام صاحب پر عالم نزع طاری ہوا تو شیطان نے حملہ کیا اور امام صاحب کی لکھی ہوئی دلیلوں اور تدبیروں کا اس نے کاٹ کر دیا، ایک دلیل باقی رہی تھی کہ نجم الدین کبریٰ گھبرائے ہوئے تشریف لائے اور بے تابی سے تکرار کرنا شروع کردی۔ ''کہدے کہ اللہ کو بلا دلیل پہچانا'' اس طرح امام صاحب کا ایمان بچا اور بفضلہٖ خاتمہ بالخیر ہوا۔ دلیلوں پر اعتبار کرنا ایمان کی نشانی نہیں

یہی منطقی دلیلیں اعتبار و ناز کی وجہ سے شرک نہیں بلکہ شرک اکبر بن جاتی ہیں۔ اسی لئے حضرت نجم الدین نے انہیں سبق پڑھایا کہ منطق سے توبہ کروتا کہ ایمان کامل ہو، اور خاتمہ بہ خیر ہو۔ اسلام کا لفظ خود اپنے معنی بیان کر رہا ہے۔ تسلیم کامل ہی کا نام توحید ہے۔ جملہ انبیاء و اولیاء کی زندگی بتا رہی ہے کہ اپنی رائے اور مرضی کو خدا کی رائے اور مرضی پر قربان کر دینا توحید ہے۔ اور یہ توحید بغیر تقلید کے کبھی حاصل نہیں ہوا کرتی۔

اب اگر کفار و مشرکین اپنے باپ دادا کی تقلید کرتے ہیں تو ان کی باتیں اساطیر الاولین ہیں اور ان کے اصول جن پر مشرکین کا اجماع ہے۔ انسانی خامیوں سے خالی نہیں ہوتے۔ ایک مسلمان جب اپنے سلف کا اتباع کرتا ہے تو اس کے سلف کا اصول قرآن و رسول کے وسیلے سے خدا تک پہنچتا ہے۔ اب کوئی صاحب عقل سلف صالحین کی تقلید کو مشرکین والی تقلید سے تشبیہ دے سکتا ہے اور نہ برابر سمجھ سکتا ہے۔ انکار تقلید کا بدرقہ شاہ اسماعیل کے مطابق یہ ہے کہ قرآن ہدایت کے لئے کافی ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے کسی زیادہ علم کی ضرورت نہیں۔ اس طرح تشریح بالرائے کو انہوں نے تقلید پر ترجیح و فضیلت دی ہے، مگر خدا جانے وہ "راسخون فی العلم" اور "اولوا العلم" کے معنی کیا بتائیں گے جو محکمات متشابہات کو سمجھا کر قرآن تک رسائی کراتے ہیں۔ اور شک و شبہ و زیغ کو دور کیا کرتے ہیں، اگر قرآن کے معنی ہر شخص سمجھ سکتا تو رسول اللہ ﷺ کبھی ہدایت نہ فرماتے کہ قرآن سیکھو اور دوسروں کو سکھاؤ۔ اب اگر قرآن سے تقلید کے متعلق سمجھنا ہے تو انہوں نے سورۃ النساء کی چھبیسویں آیت پر غور کیوں نہیں کیا۔ صاف ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ اپنے احکام تمہارے لئے بیان کرے اور تمہیں اگلوں کی رسمیں بتائے یعنی انبیاء و صالحین کی، اور تم پر اپنی رحمت سے رجوع فرمائے اور اللہ حکمت و علم والا ہے۔

اب بھی اگر تقلید سے انکار ہے تو بتایا جائے کہ جماعت اسماعیلیہ کا وجود کس وجہ سے ہے، اور شاہ اسماعیل نے اپنی تقلید کرنے کو کیوں مجبور کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ معصوم نہ تھے۔ ان پر امامت کا بھی شبہ نہ کسی نے کیا اور نہ انہوں نے خود اعلان کیا۔

شاہ اسماعیل کی تعلیمات کے متعلق سیر حاصل مباحثے اور مناظرے ہو چکے
ہیں مگر افہام و تفہیم کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ ہمارے علماء اپنے عقائد کو پیش کر کے ان
کے عقائد کی تردید کرتے ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ ہمارے عقائد بھی قرآن و حدیث پر مبنی
ہیں۔ لہذا "اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا" ضرورت ہے کہ پہلے ان کا نظریہ سمجھا
جائے پھر اس کے مطابق ان سے گفتگو کی جائے، اور سمجھایا جائے کہ انہوں نے قرآن
و حدیث کو کس طرح استعمال کیا ہے اور اپنے عقائد کی فوقیت ثابت کرنے کی کوشش کی
جائے، جو مضامین ان کے صحیح نکلیں، ان کو تسلیم کر لیا جائے ورنہ سلسلہ نامتناہی کبھی نتیجہ
خیز نہیں ہوگا۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔

ا۔ وہ غیر خدا سے مدد مانگنے کو برا سمجھتے ہیں۔ اور ہم بھی برا سمجھتے ہیں (جبکہ کسی
کو مستقل بالذات مددگار سمجھا جائے) لہذا سب سے پہلے طے کیا جائے کہ غیر خدا سے
ان کا مفہوم کیا ہے۔ غیر خدا میں آپ اور میں سب ہی آ جاتے ہیں۔ لہذا وہ ہر آفرینش
اور اظہار قدرت خداوندی کو غیر سمجھتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا کوئی مقرب
نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان کا خدا لفظ کن سے ہر شے اور اسباب مہیا کر لیتا
ہے، مگر کسی کو اپنا بنانے کی اسے ضرورت نہیں ہے۔ یا یہ اس کی عادت نہیں ہے کہ کسی
کو اپنی معرفت عطا کرے یا مقرب بنا کر کمالات و اختیارات سے نوازے یا کسی کو
ذریعہ اور وسیلہ بنائے۔ لہذا فرشتے انبیاء وغیرہ اس کے دوست نہیں ہیں بلکہ (معاذ
اللہ) مثل بت اور بھوتوں کے ہیں۔ وہ قرآن کو القاء کر سکتا تھا یا الواح کی صورت میں
عطا کر سکتا تھا۔ اب جو اس نے جبریل علیہ السلام کے ذریعہ رسول کریم ﷺ پر قرآن
اتارا اور رسول خدا ﷺ نے قرآن ہمیں سمجھایا، یہ سب نعوذ باللہ تسلیم کئے جانے کے
قابل نہیں رہے۔ جبریل علیہ السلام اور رسول کریم نہ اس کی معرفت رکھتے ہیں نہ اللہ
کے دوست ہیں اور نہ خادم ہیں۔ اگر وہ ایسے ہوتے تو بھوت پریت سے تشبیہ نہ دی
جاتی برخلاف ان کے ہم خاصان خدا کے معترف ہیں۔ ان کی فیض رسانی کے قائل

ہیں اور ان کو بارگاہ الٰہی میں اپنا وسیلہ اور شفیع گردانتے ہیں، کھلی ہوئی بات ہے کہ اس طرح انہوں نے توحید کا میدان تنگ اور محدود کر دیا ہے اور اندیشہ ہے کہ کم ہوتے ہوتے ان میں توحید غائب نہ ہو جائے اور ہم اللہ کی غیر محدود قدرت کی وسعت کو چار دانگ عالم سے بھی فزوں اور لامحدود سمجھتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنے کارکن مقرر فرمائے ہیں اور مختلف کام مختلف ملائکہ اور بندوں کے سپرد کئے ہیں اور ہم اللہ کی اور اس کے انتظام کی تبلیغ واشاعت اس قدر کرنا چاہتے ہیں کہ وہی وہ ہو جائے اور اس کے غیر کا نام نہ رہے۔ غیر کو فنا کرنے میں ان کی اور ہماری کوشش یکساں مان لی جائے تو فرق مقدم و مؤخر کا رہ جاتا ہے۔ ہم توحید کے ذریعہ شرک کو مٹاتے ہیں اور وہ شرک کی معرفت توحید حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگوں کو اسلام سے خارج کرتے ہیں اور ہم داخل وشامل کرتے ہیں۔

۲۔ وہ کہتے ہیں کہ طعام و فاتحہ کا ثواب مردوں کو نہیں پہنچتا کیونکہ ان کے نزدیک مردے مثل مٹی کے بے حس اور بے روح ہیں، اور ہم اس کے برعکس عقیدہ رکھتے ہیں۔ ثواب کا پہنچنا، عالم ارواح کی بات ہے جس کا علم انہیں نہیں ہے اور ہمیں احادیث صحیحہ، اقوال فقہاء اور تعامل اولیاء اللہ کے ذریعے ہے لہذا یہ نزاع محض ان کی ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ البتہ اتنی بات ان کی سمجھ میں آتی ہے کہ اس حیلے سے محتاجوں اور مساکین کو طعام پہنچ جاتا ہے اور یہ کار خیر ہے، جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اب اگر اس مادی وظاہری ثواب کو تسلیم کر لیں تو یہ بحث ختم ہو سکتی ہے۔

۳۔ آمین بالجہر اور رفع یدین اور قبر پر روشنی کرنے (۱) کا اختلاف ایسا نہیں

ا۔ اب تو سید صاحب کی مصنوعی قبر پر روشنی کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ زائرین کی سہولتوں کا بندوبست کیا جا رہا ہے، اور نقلی قبر کی زیارت کے لئے شد رحال کیا جاتا ہے اور بقول شیخ اکرام صاحب شاہ اسماعیل کی قبر پر نسوار چڑھا کر منتیں مانی جاتی ہیں۔ پھر اختلاف کیا رہا؟ ہاں یہ قسمت کی بات ہے کہ خادی خان کے مرشد حضرت اخوند صاحب کے مزار پر پاک وطاہر چیزیں لے جائی جاتی ہیں اور خادی خان کو قتل کرانے والوں کے لئے تمباکو کی نسوار رہ گئی ہے۔ وہابیہ جس کے حرام ہونے کے قائل ہیں۔ (ناشر)

کر دل بڑے کرلئے جائیں۔ اس پر بحث عبث ہے۔ ان امور میں ان کے اختیار کو تسلیم کرلیا جائے وہ ہمارے اختیار کو تسلیم کرلیں، اس میں کسی کا بھی کچھ نہیں بگڑتا۔ اپنی اپنی پسند ہے، لہذا قصہ ختم۔ رہا قبروں کو سجدہ کرنا تو اسے ہم بھی حرام سمجھتے ہیں۔

۴۔ تصوف کے وہ منکر ہیں اور تصور شیخ کو شرک سمجھتے ہیں، بہت اچھا وہ اسے بدعت ہی سمجھیں مگر ہم اس کے قائل ہیں اور تصوف و تصور کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شریعت کے بعد طریقت کا نمبر آتا ہے، جو طریقت کے درجہ میں نہیں پہنچا ہے، وہ اگر تصوف و تصور کو نہیں مانتا تو بجا ہے، یہ اس کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اب یا تو انہیں اپنی ناواقفیت تسلیم کرلینا چاہیے یا طریقت کے اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے، لیکن ان کو حق نہیں ہے کہ شریعت کی اصطلاحوں سے طریقت کو جانچیں۔ شریعت خود طریقت کا راستہ بتاتی ہے، نماز فرض ہے مگر بغیر حضور قلب کے نماز، نماز نہیں ہوتی۔ یہ شریعت کا مسئلہ ہے اور حضور قلب بغیر طریقت کے حاصل نہیں ہوتا۔ حضور قلب حاصل کرنے کا ایک طریقہ تصور ہے، اور یہ مادی و ظاہری نہیں، اس لئے شریعت اس پر حکم نہیں لگا سکتی۔ وہ بغیر طریقت کے اگر یہ حضور قلب حاصل کر سکتے ہوں تو براہ کرم اس کی تدبیر بتا دیں، محض زبانی تکرار سے حضور قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ مختصر یہ کہ یہ چوں وچرا بھی عبث ہی ٹھہری۔

۵۔ ذکر کے وہ مخالف ہیں مگر قرآن پاک اٹھتے بیٹھتے وضو بے وضو یاد الٰہی اور ذکر کی تاکید کرتا ہے اور کثرت ذکر کی ترغیب دیتا ہے۔ لہذا ان کی مخالفت تعجب خیز ہے، اور اگر وہ ذکر کے معنوں میں تحریف کرتے ہیں تو آفرین ہے ان کی سمجھ پر۔

۶۔ وہ قرآن کو بالرائے سمجھنا چاہتے ہیں اور مفسرین کا اتباع نہیں کرنا چاہتے۔ ظاہر ہے کہ شخصی رائے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ یہ مغالطہ اجماع کے ذریعہ دور کیا جاتا ہے مگر وہ اجماع کو غلط سمجھتے ہیں تو یہ مسئلہ الہام سے طے ہو سکتا ہے۔ الہام کی تدبیر انہیں معلوم ہوگی مگر ہم الہام کو اپنے اختیار سے باہر سمجھتے ہیں۔

۷۔ وہ وسیلہ کے مخالف ہیں۔ اس کے معنوں میں تحریف کرتے ہیں اور دور

از کار دلائل پیش کرتے ہیں، تقلید والا نکتہ جو اوپر بیان کیا گیا ہے وہ وسیلہ کی تصدیق کرتا ہے اور اسی سے اس کی اہمیت واضح وثابت ہو جاتی ہے۔

۸۔ وہ انبیاء و اولیاء کو بھوت پریت کے زمرہ میں شمار کرتے ہیں، ان کی بشریت کی وجہ سے وہ ایسا خیال رکھتے ہیں مگر عبدہ اور فرائض نبوت ادا کرتے کی وجہ سے انہیں یقیناً شرف حاصل ہے۔ لہذا ہم کہتے ہیں: ''گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی''

اور یہ تو عقل وتہذیب کی بات ہے کہ نیک کی تشبیہ نیک ہی سے ہونا چاہیے۔

۹۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو اپنے بعض صفات سے مزین کردیتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ سراسر غلط ہے۔ خدارا! انصاف۔ یہ تو کھلی ہوئی کم نظری اور کوتاہ اندیشی ہے۔ اللہ نے اپنے بندوں کو رحیم وکریم بنایا ہے اور تَخَلَّقُوْا بِأَخْلَاقِ اللهِ کی ہدایت کی ہے۔

۱۰۔ وہ کہتے ہیں کہ مرجانے کے بعد ہر امتیاز مٹ جاتا ہے اور خاصان خدا بھی مثل عام مردوں کے ہیں، نہ سن سکتے ہیں نہ جواب دے سکتے ہیں۔ ہم انبیاء و اولیاء کی حیات بعد الموت ان حالات و واقعات سے بھی پیش کر سکتے ہیں جو انہوں نے خود سید صاحب کے متعلق ارقام فرمائے ہیں۔ غرض ہم برزخی حیات کے قائل ہیں اور اس کا علانیہ اظہار کرتے ہیں۔ منکرین ومخالفین روحانیت کے ذریعہ اس حقیقت کو خود بھی سمجھ سکتے ہیں اور اسماعیلیہ تو سید صاحب کے دوبارہ آنے کے قائل اور منتظر ہیں۔ اس لئے یہ قیل قال فضول ہے۔

۱۱۔ وہ ایک خاطی وعاصی مسلمان کو مشرک خیال کر کے واجب القتل قرار دیتے ہیں، ہم ایک موحد کو جو خلوص کے ساتھ اقرار رسالت نہ کرے دائرہ اسلام میں شامل نہیں کرتے اور منافق کو خارج از اسلام خیال کرتے ہیں۔ ایک کافر جب توبہ کر کے پاک وصاف بن جانے کا حق رکھتا ہے ایک خاطی مسلمان تو بدرجۂ اولیٰ پاکی و صفائی کا مستحق ہے۔ ایک گنہگار کلمہ گو کی مثال مرغابی کی سی ہے جس کے پر وبال آب

نجات سے نکل کر خشک اور ستھرے ہو جاتے ہیں۔ خاطی کلمہ گو کو شرک کا لیکچر دے کر کافر بنانے کے بجائے شفقت سے اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔

۱۲۔ ہر کسی کلمہ گو مسلمان پر وہ تمام آیات قرآنی جو مشرکین کے متعلق ہیں چشم زدن میں منطبق کر دیتے ہیں اور ہم آیات رحمت سنا کر عقیدہ و عمل کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا

۱۳۔ چونکہ وہ خاصان خدا کو مردہ سمجھتے ہیں اور مردہ کو ندا کرنا صحیح نہیں اسی لئے ندا کرنے کو شرک بتاتے ہیں۔ ہمارے علماء قرآن و حدیث سے بزرگان دین کو ندا کرنے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں مگر انہیں قائل کرنے کے لئے یہ ثبوت مفید نہیں ہو سکتا۔ ہمیں ان کے جواب میں صرف یہ ثابت کرنا چاہیے کہ خاصان خدا مثل عام مردوں کے نہیں ہیں۔ بلکہ زندہ ہیں ان صاحبان نے یا تو سورہ آل عمران کی آیات نمبر ۲۱۔۲۳ پر غور نہیں کیا۔ یا خدا جانے کوئی اور مطلب نکال لیا ہے۔ بہر حال ان آیات کا صحیح مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے، پھر تیر نشانہ پر بیٹھے گا اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ قائل نہ ہوں۔ اور ایسا ثبوت قرآن و حدیث میں علانیہ موجود ہے۔

۱۴۔ سورہ بقر کی آیت میں صاف حکم ہے کہ رسول کے متعلق ذو معنی الفاظ نہیں کہنا چاہیے، بلکہ ان کی عظمت کا احترام کرنا چاہیے، مگر وہ رسول کے متعلق ناشائستہ الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ اور رکیک تشبیہوں سے کام لیتے ہیں۔ خصوصاً چمار کا لفظ ان کی زبان پر چڑھا ہوا ہے (۱) اس سے زیادہ نافرمانی، گستاخی اور سوئے ادبی اور کیا ہو سکتی ہے۔ قرآن کی بعض باتیں تسلیم کرنا اور بعض باتوں سے انکار

۱۔ میں ایک مرتبہ لیبر انکواری کمیٹی کا صدر بنا دیا گیا تھا۔ مزدوروں اور ملازمین کے بیان لے رہا تھا۔ کمیٹی کے ایک ممبر نے جو مزدوروں کا پڑھا لکھا اور مہذب نمائندہ تھا، سیکرٹری کی شان میں ناشائستہ الفاظ کہے۔ میں نے اسے تنبیہ کی، تو اس نے معذرت کی اور سمجھایا کہ ان الفاظ سے گستاخی منظور و متصور نہیں، بلکہ یہ ہمارا تکیہ کلام ہے۔ اس سے معلوم ہوا جیسی روح ویسے ہی فرشتے۔

کر دینا بندۂ مومن کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کی انسانیت، ان کی فصاحت و بلاغت اور ان کے اخلاق کو ان کی طلاقت نے کہاں اور کیسے میٹ دیا ہے۔ کاش وہ اتنا ہی سمجھیں کہ اسلام محبت آشتی کا مدعی ہے۔ بزرگوں سے ہم نے سنا ہے کہ بے ادب بے نصیب ہوتا ہے مگر شاید وہ انکار تقلید کی وجہ سے اس بدنصیبی کو خوش قسمتی خیال کرتے ہیں۔ مبارک ہو۔

۱۵۔ ان کی سوئے ادبی کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نماز میں رسول اللہ ﷺ کا تصور اور خیال آجانا گاؤ خر کے خیال و تصور سے زیادہ بدتر ہے۔ یہ عقیدہ کسی توحید پرست کا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ قطعی جہالت کی علامت ہے۔ انہوں نے اس کی دلیل و وجہ جو بتائی وہ عجیب و غریب یعنی وہ کہتے ہیں کہ رسول کا تصور و خیال دل میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اور گدھے اور بیل کا تصور جلد دفع ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ نعت کا اقرار کر کے خود کو نعمت سے محروم کر لیں۔ تو یہ ان کی جہالت و بدنصیبی کی بین علامت ہے مگر ہم رسول کے تصور کو نعمت و رحمت سمجھ کر سینہ سے لگائے رہتے ہیں۔

اللھم زد فزد۔

۱۶۔ توحید و رسالت کی تصدیق ہی ایمان کی جڑ ہے۔ ہمیں اور انہیں دونوں کو تسلیم ہے، مگر وہ ایمان میں عمل کو بھی شامل کرتے ہیں۔ ہم اس اصول کو نہیں مانتے۔ ہمارے نزدیک محض تصدیق اور اقرار توحید و رسالت پر ہی ایمان مبنی ہے۔ ہم عمل کو اس اقرار و تصدیق کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ عمل کی خرابی و کوتاہی کی وجہ سے تصدیق زائل نہیں ہوتی۔ ہماری خطاؤں کی دربار الٰہی میں نبی شفاعت کریں گے۔ ہمارے لئے در توبہ کھلا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ازراہ فضل و کرم مومنوں کی خطائیں معاف کر دینے کی خود بھی امید دلائی ہے۔ اس کا وعدہ حق ہے۔

ہم اور وہ دونوں موحد ہیں۔ ہم دونوں کو توحید پرستی کا دعویٰ ہے۔ ہم دونوں وہم و خیال میں بھی اللہ تعالیٰ کا ہمسر و شریک کسی کو نہیں مانتے۔ نہ انبیاء کو نہ اولیاء کو اور

نہ ائمہ وعلماء کو۔ الوہیت صرف وحدہ لاشریک کی تنہا خصوصیت ہے۔ مگر ہمارا خدا ہر عیب ونقص سے پاک ہے۔ اور ان کا خدا جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ ظلم بھی کر سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور وہ سمجھتے ہیں کہ ''ان افعال کی وجہ سے ذات باری میں کوئی قبیح لازم نہیں آسکتا۔''(۱) اب کوئی بتائے کہ عقیدہ توحید کس کا خالص ہے۔ ہمارا یا ان کا؟

وہ توحید کے قائل ہیں۔ نظام توحید کو بھی تسلیم کرتے ہیں، لیکن نظام توحید کے متعینہ منتظمین ومبلغین اور کارکنان قضا وقدر کی قدر نہیں کرتے، بلکہ اپنا سا قیاس کرکے ان کو محض ذاکیہ اور گماشتہ قرار دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خاصان خدا کی تعظیم ومحبت ان کے نزدیک بدعت وشرک ہے، اور چونکہ ہم ان برگزیدہ ہستیوں کی تعظیم وتکریم کرتے ہیں لہذا ہم پر شرک کا گمان کیا جاتا ہے۔

وہ رسالت میں بھی بندی کی چندی نکالتے ہیں۔ ان کا مستقبل یقین نہیں بلکہ ایمان ہے کہ رسول کو علم غیب نہیں۔ رسول کو کوئی اختیار نہیں اور رسول کو حیات بعد الموت حاصل نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ رسول عبد وبشر ہے، مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسولوں کو عام بندوں سے اپنی بعض خصوصیات عطا کرکے ممتاز فرمایا ہے اور پھر سید المرسلین ﷺ کی خصوصیات وامتیازات تو جملہ رسولوں سے افضل واعلیٰ ہیں۔ یہ لوگ اپنے قیاس اور حسن ظن سے رسولوں کے متعلق جو چاہیں رائے قائم کریں مگر براہ کرم یہ بتادیں کہ رسول عربی ﷺ کے جسد اطہر کا سایہ تھا یا نہیں (۱) اور یہ بھی بتادیں کہ روحی فداہ بنی الامی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم آگے پیچھے یکساں دیکھتے تھے کہ نہیں؟ اگر یہ ان معجزات کے قائل ہیں تو رسالت کے متعلق ان کی تمام چہ میگوئیاں پادر ہوا ہوئی جاتی ہیں، اور اگر ان معجزات سے انہیں انکار ہے تو اس کا فیصلہ اللہ اور رسول ﷺ ہی کر سکتے ہیں۔

ا۔ ملاحظہ ہو''جہد المقل''صفحہ ۷۷ مصنفہ مولوی محمود الحسن صاحب دیوبندی۔

۲۔ فاضل مصنف کا اس طرف خیال نہیں گیا کہ ان میں سے اکثر نے حضور ﷺ کے جسد اطہر کے سایہ ہونے کا اعلان کیا ہے مگر علمائے اہل سنت نے ان کے خیالات باطلہ کا مدلل رد کیا ہے۔ (ناشر)

جب حضور نبوی کی عبدیت نورانیت سے اس درجہ معمور تھی کہ سایہ نہیں پڑتا تو قبر مقدس میں یہی نورانیت ان کی حیات کی شہادت دے سکتی ہے۔ اس لئے کہ نور کو فنا نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو محمد ﷺ کے غلام ان کی ذات نبوت سے اکتساب نور کر لینے کی وجہ سے اپنی برزخی زندگی میں مردہ تصور نہیں کئے جا سکتے۔ یہی نورانیت تھی جس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ بغیر گردن موڑے آگے پیچھے کی ہر شے ملاحظہ فرما لیا کرتے تھے اگر یہ واقعہ ہے تو کوئی وجہ نہیں علم اولین و آخرین عطا کرنے والے قادر مطلق جل شانہ نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو علم غیب سے سرفراز فرمایا ہو اور اختیارات مرحمت نہ کئے ہوں۔ ہم سے پوچھئے تو ان معجزات کو ہم آنکھیں بند کر کے صدق دل سے مانتے ہیں۔ ہر نوعیت سے مانتے ہیں معنا بھی حرفا بھی اور بغیر چون و چرا کے اپنے اپنے رجحان کے مطابق معجزات کی موافق یا مخالف تاویل کوئی کر بھی لے تو یہ اپنی اپنی خوشی کی بات ہے، لیکن معجزات تک عقل کی رسائی کہاں ہے۔ معجزات عقل شکن اور بصیرت افروز ہوا کرتے ہیں، جسمانی و روحانی بحث تو بعد کی پیداوار ہے مگر جب صاحب معراج ﷺ نے معراج کا حال سنایا تو کفار نے مذاق اڑایا اور حضرت صدیق اکبر سے جا کر کہا کہ تمہارے نبی معراج کا حال کہہ رہے ہیں۔ ان کے فرمانے پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ اس جواب سے کفار شرمندہ ہو کر رہ گئے اور حضرت ابوبکر لقب صدیق سے سرفراز ہو کر صاحب ایمان لوگوں کے سردار ہو گئے۔

ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا

اسماعیلی جماعت کے بنیادی اصولوں سے جو خود منجملہ فروعات ہیں، عجیب و غریب متضاد فروعات نمودار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عقیدے اور عمل میں یکسانیت نہیں ہے، اور لطف یہ ہے کہ جوش عقیدت میں اپنے عمل و عقیدہ کی برہمی کا ان لوگوں کو ذرا بھی احساس نہیں ہے، اور اگر ہے تو تو اقرار نہیں کرتے، وہ اپنے فروعات کو اپنے اصل اصول سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ جب اُن سے کہا جاتا

ہے کہ فتنہ وفساد مت پھیلاؤ تو جواب دیتے ہیں کہ ہم ایمان وامن کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

جن کے ایمان میں تیقن نہ ہو، جن کا عقیدہ توحید مشکوک ہو، جو رسول کریم صلوٰۃ اللہ علیہ کی مسلسل اہانت کرنے کے عادی ہوں اور کلمہ گویوں کو مشرک قرار دیتے ہوں۔ ایسے لوگوں سے بحث کرنا اور تصفیہ کی امید رکھنا نہ صرف غلط ہے بلکہ تضیع اوقات ہے۔ برسولاں بلاغ باشد وبس۔

لہذا ہمارے لئے تین ہی صورتیں ہیں کہ۔

ا۔ حضور نبوی ﷺ میں التجا کریں۔

کچھ ایسی بگڑی ہے کہ بنائے نہیں بنتی
بگڑی کو بنا دیجے سلطان مدینہ

۲۔ اللہ کے سپرد کردیں وہی بہترین تصفیہ کرنے والا ہے۔

۳۔ یا ارشاد قرآن کے مطابق ان لوگوں کو سلام کرلیں۔ فقط والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حِلیہ

جناب سید احمد صاحب رائے بریلوی کی شخصیت ہندو پاک کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ معتقدین ومخالفین نے ان کے متعلق سب کچھ لکھا ہے۔ مگر ان کی تصویر شائع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ شبیہ اگر سامنے ہوتی تو علم قیافہ کے ذریعے اس شخصیت کے قول و فعل کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی۔ ان کی تصویر شاید اس لئے شائع نہیں کی گئی کہ شرعاً ممنوع ہے، یا اس لئے منظر عام پر نہیں آسکی کہ محفوظ نہیں رہ سکی۔ ان کی تصویر بنائے جانے کے ثبوت موجود ہیں۔ ظفر نامہ رنجیت سنگھ کے حوالہ سے مہر صاحب لکھتے ہیں:

”شیر سنگھ سید صاحب کی نعش کی طرف متوجہ ہوا، اور ایک سحر کار مصور کو مقرر کیا تا کہ ان کی تصویر ہو بہو کھینچے۔ جب اس علاقے کے نظم ونسق سے فارغ ہو کر دربار میں پہنچا رنجیت سنگھ بہت خوش ہوا۔ شیر سنگھ کو کلغی اور خلعت کے علاوہ بہت انعام دیئے۔ اور زیادہ سے زیادہ مہربانیاں کیں۔ خلیفہ صاحب (سید صاحب) کی تصویر جوانمردی کی دیکھ کر کہا ”آفرین“ اور منصفانہ تعریف کی۔ میں (۱) نے بھی وہ تصویر دیکھی لیکن اس بات پر حیران ہوا کہ صورت درویش ہونے کے باوجود سلطانی وحکمرانی کی خواہش نفسانیت نے پیدا کی اور اگر مذہبی اختلاف کی بناء پر یہ سب کچھ عمل میں آیا تو سمجھنا چاہیے کہ خلیفہ صاحب صفوت وصفا سے بے خبر تھے۔“ (۲)

ظفر نامہ کا یہ بیان نقل کرنے کے بعد مہر صاحب فرماتے ہیں:۔

۱۔ یعنی دیوان امرناتھ مصنف ظفر نامہ ۲۔ سید احمد شہید: جلد ۲ ص ۲۳۴

"اگر یہ بیان درست ہے تو کچھ معلوم نہیں وہ تصویر کیا ہوئی اور کہاں گئی؟ ممکن ہے پرانے رکارڈوں میں اس کا کچھ سراغ مل جائے"۔

مہر صاحب کی اس تحریر سے عیاں ہے کہ انہیں بھی سید صاحب کی تصویر کے محفوظ نہ رہنے کا صدمہ ہے، مگر "تحفہ محمدیہ" نے بتایا ہے کہ سید صاحب کی شبیہہ اسماعیلیوں کے پاس بھی تھی۔ لکھا ہے کہ:

"چندہ جمع کرنے کی خاطر ۱۲۶۳ھ میں فرخ آباد میں حضرت سید احمد صاحب کی تصویر لائے تھے۔" (تحفہ محمدیہ مطبوعہ ۱۲۶۵ھ ص ۲۰)

اندریں حالات چند سوانح نگاروں نے سید صاحب کا حلیہ لکھ کر احسان عظیم کیا ہے مگر وہ اس قدر ناکافی ہے کہ صحیح نقشہ نہیں جمایا جا سکتا۔ اور آنکھوں کے سامنے پوری تصویر نہیں آتی، بہر حال وہ ناکافی ہی سہی مگر خاکہ ہے:۔

بقول جعفر تھانیسری:۔

"رنگ سرخ، ریش سفید، بروت سیاہ، قوی ہیکل، خندہ رو، دراز بینی، پیوستہ ابرو، کشادہ پیشانی اور بلند قامت۔"

بروایت مرزا حیرت دہلوی:۔

"رنگ سفید و سرخ، سینہ چوڑا، ہاتھ پاؤں سڈول، کلائیاں چوڑی، آنکھیں نکیلی اور چھوٹی، کندھے ذرا اٹھے ہوئے، قد نہ لمبا نہ چھوٹا بلکہ اوسط۔"

مہر صاحب نے حلیہ تو بیان نہیں کیا مگر ان کو شہ زور ثابت کرنے میں زور مارا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان میں جن یادیو کے برابر طاقت تھی۔ (سید احمد شہید جلد اول ص ۱۰)

بہ حکایت ہنٹر:۔

"قد درمیانہ، سینہ تک لمبی ڈاڑھی، کم گو، خوش اخلاق، وجدانی کیفیت میں اکثر مبتلا و سرشار۔"

یہ واقعی کرامت ہے کہ سید صاحب کے حالات، عقائد اور اعمال کی طرح ان کی شکل و شباہت میں بھی اختلاف ہے اور کوئی بھی ان کا صحیح طور پر اندازہ و احاطہ نہ کر سکا۔ تصویر و حلیہ برطرف مگر ہنٹر نے ایک ناقابل فہم بات لکھی ہے جس کو دیکھ کر

ہوش اڑ جاتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ بے حقیقت ہو کر رہ جاتی ہے اور عقائد متزلزل ہو جاتے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ اس کے صحیح ہونے کا امکان ہو۔ مگر کیا کیا جائے کہ اس کے بیان کی تائید "تحفۂ محمدیہ" والے نے اور مولانا ابوالکلام نے بھی کی ہے۔ بہر حال ہنٹر نے لکھا ہے کہ:۔

"جناب سید صاحب کی شہادت کے بعد سلسلہ کو بڑھانے کے لئے سید صاحب کا بت تیار کیا گیا اور اس کی تفصیل یہ ہے:۔

"ایک عرصہ تک امام صاحب کے غائب ہو جانے کی کرامت کے متعلق تحقیقات کرنا کرامت سے خالی نہیں تھا۔۔۔۔ ایک جان نثار مبلغ۔۔۔۔ ایک ہزار آدمیوں کو ساتھ لے کر سرحد کی طرف چلا گیا۔۔۔ اس نے عزم مصمم کر لیا کہ وہ کوہستانی علاقہ میں اس غار تک ضرور پہنچے گا جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے امام کو چھپا رکھا ہے، جب وہ اس خانقاہ کے دروازے کے اندر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ تین انسانی مجسمے گھاس سے بھرے ہوئے موجود ہیں، یہ مبلغ وہاں سے بھاگا اور مریدوں کو خط لکھا۔

"ملا قادر نے امام صاحب کا بت بنایا ہے مگر لوگ اندر جانے سے پہلے یہ وعدہ کر لیتا ہے کہ نہ وہ امام صاحب سے ہاتھ ملائے گا اور نہ ان سے بولنے کی کوشش کرے گا، کیونکہ ایسا کرنے سے امام صاحب چودہ برس کے لئے گم ہو جائیں گے۔۔۔ جب بہت عرصہ تک تسلی بخش جواب نہ ملا تو لوگوں میں امام صاحب سے ہاتھ ملانے کی خواہش ہوئی مگر ملا قادر نے یقین دلایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو امام صاحب کے خادم (جو ان کے پاس کھڑے ہیں۔) پستول مار دیں گے۔ (آخر کار اندر جا کر دیکھا تو) معلوم ہوا کہ بکرے کی کھال کو گھاس سے بھر رکھا ہے اور کچھ لکڑی کے ٹکڑوں اور بالوں کی مدد سے انسانی شکل دے دی ہے۔۔۔ دریافت کرنے پر ملا قادر صاحب نے جواب دیا کہ سب کچھ صحیح ہے۔ امام صاحب نے خود بطور معجزہ اپنے آپ کو ایک گھاس کے بھرے ہوئے مجسمے

کی شکل میں لوگوں کے سامنے ظاہر کیا ہے۔"

(ہمارے ہندوستانی مسلمان، مترجم ڈاکٹر صادق حسین ۲۰۷)

معتقدین سید صاحب کے نزدیک ہنٹر معتبر شخص ہے، اس لئے اس کے مندرجہ بالا بیان کو صحیح ہی سمجھا جائے گا۔ اس پر بھی دو ثقہ حضرات کی شہادتیں پیش کرنا ضروری ہیں۔ مولوی سید اشرف علی گلشن آبادی جناب سید صاحب کے ارادت مند تھے، انہوں نے اپنی تالیف "تحفۂ محمدیہ" میں لکھا ہے "سید احمد کا پتلا بنایا"۔

(تحفۂ محمدیہ ص ۴۲ سطر ۵)

"ایک بکری کے چمڑے کی پتلے کی شکل بنا لوگوں کو فریب دینے لگے۔"

(ص ۷۰ سطر ۱)

علاوہ ازیں پتلا بنائے جانے اور دیگر کئی واقعات پر بڑی عالمانہ بحث کرنے کے بعد مولانا آزاد نے یوں اقرار کیا ہے:۔

"یہ بھی مشہور ہے کہ چند چالاک اور دنیا پرست آدمیوں نے اپنی ذاتی اغراض سے واقعی ایک پتلا بنایا تھا اور کچھ دنوں تک یہ بات مشہور رہی تھی کہ سید صاحب شہید نہیں ہوئے اور بدستور زندہ سلامت موجود ہیں لیکن یہ بھی چالاک آدمیوں کی کارروائی تھی اور بہت جلد کھل گئی۔ ایسے واقعات ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں، ان کو وہابیت یا مولوی اسماعیل مرحوم کی جماعت سے کیا تعلق؟" (ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی ص ۳۵۷)

جناب مولانا آزاد ہنٹر کے بیان کو تسلیم کر لینے کے بعد کتنی بھی صفائی پیش کریں بات نہیں بن سکتی۔ کیونکہ بت گر سید صاحب کے مرید اور شاہ اسماعیل سے تربیت یافتہ تھے کیونکہ خاوی خان کی اولاد یا حضرت اخوند صاحب کے مریدین کو کیا ضرورت تھی کہ ان کا بت بناتے۔ بہر حال یہ حرکت کسی کی بھی ہو اس دعوت و تبلیغ کا نتیجہ نہایت گھناؤنا نکلا اور یہی کہا جا سکتا ہے:۔

از مدرسہ بہ کعبہ روم یا بہ بت کدہ
اے پیر رہ، بگو کہ طریق صواب چیست

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تعارف

جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم ایم اے پی ایچ ڈی کراچی

حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں شیخ سلیم چشتی (فتح پور سیکری) عہد اکبری کے وہ بزرگ ہیں جن کے آستانہ پر اکبری جاہ و جلال بھی سجدہ ریز رہتا تھا۔ اکبر اعظم کا ولی عہد شہزادہ سلیم، ان کی دعاؤں کا ثمرہ تھا اور اس کی ابتدائی پرورش بھی ان ہی روحانی شیخ کے گھر میں ان کے زیر عاطفت ہوئی۔ شیخ سلیم چشتی کے داماد شیخ اعظم فریدی فاروقی بدایونی تھے جو اُرلا اور منونہ (متصل آنولہ) کے ٹھاکروں سے کسی مقابلہ میں ۹۹۱ھ میں شہید ہوئے۔

مغلیہ دور میں اس خاندان کے کئی ارکان اعلیٰ عہدوں اور مناصب پر فائز رہے اور ان سے وفاداریاں اور جاں نثاریاں ظہور میں آئیں۔ قطب الدین کوکلتاش، نواب فرید، شیخ ابراہیم کشور خاں اور شیخ الہ دیا اخلاص خاں اسی زمرے میں آتے ہیں۔

انگریزی دور میں بھی اس خاندان کا اعزاز و احترام باقی رہا۔ شیخ شرف الدین اس خاندان کے وہ بزرگ تھے جنہوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بدایوں کے کلکٹر ایڈورڈ کی مدد کی اور اس کو چھپائے رکھا جس کے صلہ میں اعزاز و اکرام اور انعام و خطاب سے سرفراز ہوئے۔ سرسید احمد خاں نے شیخ صاحب کے حالات و خدمات کا مفصل "ذکر لائل محمڈنس آف انڈیا" میں کیا ہے۔ شیخ شرف الدین کے ایک صاحبزادے شیخ امیر احمد تھے جن کے صاحبزادے (۱) خان بہادر شیخ سید محمد (۲) شیخ وحید احمد اور (۳) خانصاحب شیخ محب احمد تھے۔

شیخ وحید احمد کا اصلی نام وحید محمد تھا لیکن وحید احمد عرف وحید میاں کے نام سے مشہور ہوئے آخر میں اپنے نام کے ساتھ مسعود کا اضافہ کرلیا تھا۔ وہ ۱۸؍ مارچ ۱۸۹۳ء کو شیخوپور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ حسب رواج ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ عربی و فارسی سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ مولوی حامد علی اور مولوی احمد الدین صاحب (مدرس مدرسہ شمس العلوم بدایوں) کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ وحید میاں کی طبیعت کا رجحان درس نظامی کی طرف تھا اور وہ عربی زبان و علوم کی باقاعدہ تحصیل کرنی چاہتے تھے مگر ان کے بھائی سید محمد عرف میکو میاں نے انگریزی تعلیم کی طرف زور دیا اور وحید میاں ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں میں داخل ہو گئے پھر وہ علی گڑھ چلے گئے اور وہاں آٹھویں درجہ میں داخلہ لیا لیکن اتفاق سے کسی ساتھی کے چیچک نکل آنے کی وجہ سے عارضی قواعد و قیود سے پریشان ہو کر گھر آ گئے اور پھر مراد آباد کے اسکول میں داخل ہوئے مگر علالت کی وجہ سے شریک امتحان نہ ہو سکے بالآخر علی گڑھ سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد میجر سید حسن بلگرامی (ف ۱۹۴۰ء) کے کیمبرج اسکول (علی گڑھ) میں داخل ہوئے جو جعفر منزل میں کھولا گیا تھا۔

وحید میاں کی دلچسپی ٹیکنیکل مضامین میں بدرجہ غایت تھی لہذا ان کے اساتذہ نے مشورہ دیا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ جائیں چنانچہ ۱۹۱۴ء میں وہ لندن پہنچ گئے لیکن کیمبرج اسکول (علی گڑھ) کے زمانہ کا ایک واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے جس سے ان کے مزاج اور آئندہ کے عزائم کا اظہار ہوتا ہے ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے ایک حصہ کے انہدام کا مشہور حادثہ فاجعہ ظہور پذیر ہوا بہت سے مسلمان شہید ہوئے اور ملک میں ہنگامہ برپا ہو گیا اس وقت صوبہ یو۔پی کا گورنر مسٹن تھا وحید میاں نے ایک مضمون بعنوان "مستان کے نام کھلا خط" لکھا "مسٹن کو مستان" لکھ کر خوب کردار نگاری کی۔

وحید میاں کے لندن پہنچتے ہی جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء — ۱۹۱۸ء) کا آغاز ہو گیا لہذا ان کے گھر سے واپسی کے تقاضے شروع ہو گئے۔ انہوں نے لندن کی بجائے مانچسٹر کے ایک ٹیکنیکل اسکول میں الیکٹریکل ڈپلومہ کے حصول کے لئے داخلہ لے لیا مگر وہاں کچھ ایسے حالات اور پیچیدگیاں رونما ہوئیں

کہ انہوں نے مانچسٹر کے اسکول کو چھوڑ کر گلاسگو کی راہ لی اور ایک ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ میں داخل ہو گئے ۱۹۱۶ء میں چھٹیاں گزارنے کے لیے وہ گھر (شیخوپور) آئے لیکن گھر والوں نے جنگ عظیم کی ہولناک فضا کی وجہ سے انہیں پھر واپس نہیں جانے دیا اور وہ اپنے نصاب کی تکمیل نہ کر سکے۔ انگلینڈ میں ان کا قیام تقریباً دو سال رہا۔

انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد انہوں نے الیکٹریکل لائن میں بمبئی اور کانپور میں مزید تجربات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں ان کے بھائیوں میں جائیداد کی تقسیم ہو گئی اور وہ الگ سے اپنے معاملات کے ذمہ دار ہو گئے۔

وحید میاں کی مشغولیات کے مندرجہ ذیل تین زاویئے رہے

(۱) سیاست (۲) ادب (۳) تصوف

انہوں نے ایک قدیم زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ریاست و امارت میں پلے بڑھے ان کا خاندان انگریزی حکومت کا خاص وفادار اور ممد و معاون رہا۔ خان بہادر کے خطابات اور آنریری مجسٹریٹی وغیرہ شیخوپور کے فریدی شیوخ کے لیے وقعت تھی۔

خود وحید میاں کے بڑے بھائی میکو میاں خان بہادر اور چھوٹے بھائی محب احمد خاں صاحب کے خطابات اور آنریری مجسٹریٹی وغیرہ سے مفتخر تھے۔ وحید میاں کی آزاد طبیعت نے تحریک آزادی کے اکابر سے رشتہ جوڑا اور مولانا محمد علی و شوکت علی سے وابستگی رکھی۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں وحید میاں یو پی کونسل کے ممبر رہے اور ۱۹۲۷ء میں بھی کانگریس کے ٹکٹ پر ایم۔ ایل۔ سی منتخب ہوئے اور کونسل کے وھپ کی حیثیت سے کام کیا۔

وحید میاں کبھی موڈ میں ہوتے تھے تو ان انتخابات کی کوششوں ہنگاموں اور معرکہ آرائیوں کی دلچسپ داستان سنایا کرتے تھے سنہ ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں سیاسی حیثیت سے خاص معرکہ رہا اور نوک جھونک کے واقعات ظہور پذیر ہوئے مگر کامیابی وحید کو ہوئی ۱۹۳۶ء میں بھی وہ کانگریس کی طرف سے ممبر لیجسلیٹو کونسل منتخب ہوئے جب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہوا تو تبدیلیوں کی تقریبات میں وہ جہاں

خصوصی تھے انہوں نے پولیس گراؤنڈ میں پولیس کی سلامی لینے کے بعد وزیر اعلیٰ کا پیغام سنایا۔ وہ یو۔پی کے وزیر اعلیٰ گوبند بلبھ پنت کی وزارت میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھے۔

وحید میاں اپنی فائلیں خود دیکھتے تھے ان پر نوٹنگ کرتے تھے بڑی حد تک فیصلے بھی کرتے تھے اور روز کا کام روز نمٹالیا کرتے تھے دوسرے لوگ اس پر تعجب کرتے تھے۔ وحید میاں کے ایک دوسرے پارلیمنٹری سیکرٹری مولوی محفوظ الرحمٰن نامی (بہرائچ) کے حسن اخلاق اور کارکردگی کے بھی معترف تھے۔ نامی صاحب کے علم و فضل، دیانت داری اور تفقہ فی الدین کا ان کے دل پر گہرا اثر تھا۔ مولانا نامی نے ایک کامیاب عربی درس گاہ (بہرائچ) کے قیام کے ساتھ ساتھ قرآن اور عربی کی تعلیم و تدریس کے لیے ایک مکمل نصاب کئی جلدوں میں تالیف کیا تھا جس کا ایک ایڈیشن کراچی میں بھی شائع ہوا تھا۔ نامی صاحب کے ایک شاگرد مولانا خالد فاخری الہ آبادی ہمارے دوست ہیں۔ وحید میاں رفیع احمد قدوائی کی پارٹی کے آدمی تھے

بدایوں اور اس کے نواح میں ۱۹۴۶ء سے فسادات کا سلسلہ شروع ہوا اور اس میں روز بروز تیزی اور وسعت ہوتی رہی۔ کوئی پرسان حال نہ تھا مسلمان ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ شیخ محمد سلیمان مرحوم (ف ۱۹۶۳ء) نے فسادات بدایوں کی مکمل روداد بدایوں ۱۹۴۷ء میں لکھی ہے جس سے اس دور کی غارت گری اور ہولناکی کا اندازہ ہوتا ہے وحید میاں اس زمانہ میں پبلک کی کوئی مدد نہ کرسکے غالباً وہ بھی مجبور تھے البتہ شیخ محمد سلیمان کے لیے وہ ضرور ڈھال ثابت ہوئے۔ بدایوں کے کلکٹر بے دی کلا نے شیخ صاحب کو بند کرنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر وحید میاں نے آڑے آکر کلکٹر کی غلط فہمیاں دور کیں اور محمد سلیمان کو بچا لیا۔ اس صورت حال سے وہ دل گرفتہ بھی تھے شاید اسی لیے ۱۹۵۳ء کے انتخاب میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔

وحید میاں جس زمانہ میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھے اس زمانہ میں انہوں نے علمی و ادبی اور وقتی مسائل پر خوب لکھا اور ریڈیو سے تقاریر بھی کیں۔ ان کی تین کتابیں (۱) تصوف کی اصلیت (۲) گرد راہ اور

(۳) اسلام مشرق میں اسی دور کی یادگار ہیں۔

وحید میاں نے ادبی میدان میں نمایاں کام کیا وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ تاریخ و تحقیق کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں پر یکساں عبور تھا۔ انہوں نے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے خالص علمی و ادبی ماہوار رسالہ "نقیب" فروری ۱۹۱۹ء سے جاری کیا۔ اس کے صرف ۴۰ شمارے شائع ہوئے اور جنوری ۱۹۲۴ء کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔ اس کی عمر گو کم ہوئی مگر ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی اور آج بھی ادبی و تحقیقی تحریروں میں کہیں نہ کہیں "نقیب" مرحوم کا ذکر آجاتا ہے۔ اس رسالہ پر محفوظ علی محمد عظمت اللہ خاں اور سلطان حیدر جوش جیسے صاحب طرز ادیبوں کے ادب و انشا کی چھاپ تھی اور اسے حسن قبول حاصل تھا۔ علامہ سلیمان ندوی مرحوم اس طرح رقم طراز ہیں[1]

"نقیب" کو ہر مہینے دل چسپی سے پڑھتا ہوں۔ نصیحت کا تلخ گھونٹ بآسانی انسان کے حلق کے نیچے نہیں اترتا۔ جب شوخی و ظرافت کی شکر میں اس کو ملفوف نہ کر لیجئے مگر اس میں بعض لوگ اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ متانت اور سنجیدگی کا ذائقہ اس میں باقی نہیں رہتا لیکن نقیب نے جس اسلوب ادب کا تتبع کیا ہے وہ اعلیٰ سنجیدہ شوخی اور بہترین مہذب و متین ظرافت کی مثال ہے۔ اس کی ہنسی زیر لب مسکراہٹ سے آگے نہیں بڑھتی اور بے باک لاابالیوں کے قہقہہ کی آواز نہیں بن جاتی۔ اہل دل اس کو سمجھ کر متبسم ہو جاتے ہیں اور ناشناس اس کو نہ سمجھ کر مکدر نہیں ہونے پاتے۔ ہماری زبان میں یہ صنف کلام ابھی ناپید ہے نظم میں لیجئے تو سودا و فغاں اور مصحفی و جرأت کے ہزلیات ہیں اور نثر جدید میں پنچ کی جلدیں مگر یہ زمین اصلاح و مرمت طلب ہے۔ سعدی سے بڑھ کر ہمارے بوڑھے ادیبوں میں کون ہوگا لیکن پند نامہ سعدی کے ساتھ ساتھ مطائبات

[1] مکتوب علامہ سلیمان ندوی بنام وحید احمد مدیر نقیب بدایوں (اپریل ۱۹۲۲ء)

سعدی کو فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ اُردو میں جدید طرز پر لکھنؤ اور پٹنہ کے بعض انشاپردازوں نے داغ بیل ڈالی مگر وقت کی محفل نے ان کو داد دیدے کر تہذیب و متانت کی حد سے آگے بڑھا دیا۔ گو میں اپنے انداز عبارت میں بہ زعم خشک ہوں کہ میرے اسلوب بیان کے لب پر کبھی مسکراہٹ ہی طاری نہیں ہوتی لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی اہم سے اہم اور سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع نہیں جس پر نقیب کے طرز انشا کا قلم آسانی اور کامیابی کے ساتھ رواں نہیں ہو سکتا۔ اس کے سیف الملوک کے مصنف[1] تجاہل عامیانہ کو دار المصنفین کی طرح ایک دار المتجاہلین قائم کرنا چاہیئے ورنہ ڈر ہے کہ ان کے بعد یہ طرز ناپید نہ ہو جائے"

مصور فطرت خواجہ حسن نظامی یوں اظہار خیال فرماتے ہیں[2]

"نقیب ایسے وقت بولا جبکہ ہماری شاہانہ سواری کا جلوس خاک بسر ہو چکا تھا قافلہ کے نشان، خاک پر، اوراق تاریخ بنے ہوئے پامال نظر آتے تھے منزل ہمارے کارواں کی چشم، پرآب تھی۔ نقیب رسالہ میں سات سو چھپایا کا مضمون پہلی بسم اللہ صحیح ہے بہت خوب انداز ہے اور بہت ہی خوب عنوان ہے۔ اظہار مقصد کا نفشہ اس سے زیادہ صاف سلیس اور پُر لطف عبارت میں ممکن نہ تھا"

"نقیب" کو ہندوستان کے مشہور اور نامور ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل تھا، ذرا فہرست ملاحظہ فرمایئے۔ علامہ اقبالؔ، اکبر الٰہ آبادی، فصاحت جنگ جلیلؔ مانک پوری، مولانا محمد علی جوہرؔ، حسرتؔ موہانی، مہاراجا سر کرشن پرشاد شادؔ، خواجہ حسن نظامی، مولانا آزادؔ سبحانی، پروفیسر نواب علی، قاضی عبد الغفار، آصف علی دہلوی، سید ہاشمی فرید آبادی، نیازؔ فتح پوری، عظمت اللہ خاں، چودھری محمد علی ردولوی، محفوظ الحق عظیم آبادی، کیفیؔ چریاکوٹی، عزیزؔ لکھنوی، شاہ علی احسن مارہروی، سید ابو محمد ثاقبؔ کانپوری، حامد اللہ افسرؔ میرٹھی، ثاقبؔ لکھنوی، خان بہادر

---

[1] پیر محفوظ علی بدایونی [2] نقیب ارچ ۱۹۱۹ء

مرزا سلطان احمد مجوری لکھنوی، محشر لکھنوی، احسن بھمی، چودھری رحم علی ہاشمی وغیرہ وغیرہ۔

بدایوں کے اصحاب شعر و ادب بھی "نقیب" سے پورا پورا تعاون کرتے تھے اور ان کی تخلیقات بالالتزام شائع ہوتی تھیں مندرجہ ذیل نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

میر محفوظ علی، فانی بدایونی، سلطان حیدر جوش، مولوی ابوالحسن، مولانا یعقوب بخش راغب سید عنایت احمد، [illegible] الدین احمد، محمد معین نازش، ابرار حسین قادری، سبطین احمد، امیر احمد امیر (ٹونک والے) قاضی غلام امیر، [illegible] بدایونی، سید ابن علی، وامق بدایونی، چودھری محمد ابراہیم خلیل، چودھری محمد اسماعیل سید محمد مکو میاں ——— وغیرہ

نقیب کی مقبولیت اور کامیابی کے بارے میں فاضل مدیر لکھتے ہیں[1]

"پیچ میرز کا خیر مقدم جس محبت اور ہمت افزا تعریف کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے شکریہ کے لیے خاکسار کو الفاظ تلاش کرنا گوہر مراد کی تلاش سے کم نہیں، سچ یہ ہے کہ اس تعریف کے مستحق دراصل نقیب کے فاضل مضمون نگار صاحبان ہیں جن کی بدولت محبت کے ہار اور ہمت افزائی کے طرے نصیب ہوئے"

اپنی کامیابی اور "نقیب" کی مقبولیت پر وحید میاں اس طرح رقمطراز ہیں[2]

"میرا ششماہی تجربہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ اگر کسی کام کو ہمت و استقلال سے شروع کیا جائے تو کوئی مشکل نہیں جو سنگِ راہ ہو اور کوئی مدد نہیں جو غیر متوقع اور غیر مترقب طریقہ سے نہ ملے اس کا ثبوت "نقیب" کے ہر صفحہ سے مل سکتا ہے"

شروع میں "نقیب" نظامی پریس بدایوں میں چھپتا تھا مگر ستمبر ۱۹۱۹ء سے "نقیب پریس" قائم ہوگیا تھا اس پریس سے فانی کا سب سے پہلا دیوان شائع ہوا جس پر وحید میاں نے مقدمہ لکھا تھا۔ نقیب

---

[1] نقیب مارچ ۱۹۱۹ء، [2] نقیب اگست ۱۹۱۹ء

پریس کا ایک چھوٹا سا ایک ڈپو بھی تھا۔

نقیب پریس بدایوں سے اکبر الہ آبادی کا کلیات بھی شائع ہوا تھا۔ رسالۂ نقیب کی بدولت اکبر الہ آبادی سے وحید میاں کے تعلقات قائم ہوگئے اور وہ ان کی خدمت میں حاضر بھی ہوئے چنانچہ لکھتے ہیں[1]

"نقیب جب سے وجود میں آیا ہے میں نے کوشش کی ہے کہ احباب کے لیے [illegible] تحفہ لا کر پیش کیا کروں چنانچہ اس وقت بھی ایک تحفۂ سفر پیش کیا جا رہا ہے۔ میں الہ آباد گیا تھا اور [illegible] کر گیا تھا کہ سنگم ضرور دیکھوں گا، امرود ضرور کھاؤں گا اور خان بہادر سید اکبر حسین صاحب کی قدم بوسی حاصل کر کے تمنائے دیرینہ ضرور پوری کروں گا دریائے گنگ و جمن کا سنگم نہ دیکھ سکا، جناب پنڈت موتی لال نہرو کے "آنند بھون" میں مہاتما گاندھی اور مولانا شوکت علی کے سنگم کے درشن کئے اس روز مہاتما گاندھی "تلک میموریل اسکول" کا سنگ بنیاد رکھنے والے تھے۔ امرود ضرور کھائے مگر اب تک حیرت ہے کہ شہرت کا باعث بدمزگی ہے یا گرانی، ممکن ہے کہ میرے عزیز دوست [illegible] احمد صاحب بی اے نے جن کے یہاں میں مہمان تھا عمدہ امرود کھلا کر بدایوں کے [illegible] کی وقعت میرے دل سے کم کرنی چاہی ہو۔ سید صاحب قبلہ کی زیارت حاصل ہوئی، وقت بے وقت بھی تھا اور کم بھی تاہم میری آرزو پوری ہوگئی۔ مگر یوں کہوں گا کہ معلوم ہی نہیں ہوا کیسے ختم ہوگیا۔

وحید میاں نے اپنی اس ملاقات کا ایک دلچسپ واقعہ ایک مضمون میں اس طرح نقل کیا ہے[2]

"اللہ مغفرت کرے حضرت سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی کی شخصیت بھی کتنی عجیب و عظیم تھی، کل کی سی بات ہے کہ میں ایک شام کو بعد مغرب اپنے کرم فرما مولوی

---

[1] نقیب نومبر ۱۹۲۰ء [2] وحید میاں کے ایک مضمون مرتبہ مارچ ۱۹۳۳ء سے مقتبس۔

قمرالدین صاحب بی۔ اے۔ ایل ٹی کی معیت میں ان کے سلام کو حاضر ہوا۔ نہایت تپاک سے پیش آئے، شمع منگوائی اور اپنی بیاض میں سے مسکرا مسکرا کر اپنا کلام سنایا۔ میں نے پنسل سے اشعار نوٹ کرنا چاہے تو قمر صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا! "تمہارے پاس تو ہمارا یہ پورا دیوان موجود ہے۔" جب شعر پڑھا۔

تہذیب مغربی میں ہے بوسہ تلک معاف
آگے اگر جو اس سے بڑھے، شرارت کی بات ہے

بے ساختہ میری زبان سے نکلا "یہ آپ نے کیسے لکھا"، فوراً دریافت کیا "کیا بات" اب مجھے اپنی حماقت آمیز جسارت کا احساس ہوا۔ اور ہکا بکا رہ گیا۔ نہایت اصرار سے کہنے لگے "کہئے کہئے! کیا بات ہے"۔ طالب علمانہ گستاخی کی تو عادت تھی ہی، مجبور ہو کر کہہ بھی ڈالا (اور اب حماقت پر افسوس ہے کہ کیوں کہہ ڈالا) کہ کیڈلی سرکس کی لڑکیاں زیادہ دست درازی پہ تلی رہتی ہیں۔

سن کر بہت ہنسے اور فرمایا شاعر پر جو وہ طبق روشن ہوتے ہیں وہ اپنے ہی واقعات نہیں لکھتا بلکہ دوسروں کے بھی واردات لکھا کرتا ہے۔

اکبر الہ آبادی مرحوم نے مدیر نقیب کے نام مندرجہ ذیل خط میں[1] نقیب کو ایک شعر میں یوں موضوع کیا ہے۔

"عزیز من سلمہ!

---

[1] نقیب اپریل ۱۹۱۹ء

کیا عرض کروں۔ دل و دماغ پر قابو نہیں، جن صاحبوں سے مراسم دیرینہ ہیں ان کی خدمت سے ہی قاصر ہوں۔ اللہ آپ کو کامیاب کرے۔

خطرہ ہوا جو قوم کو فوج رقیب کا
نکلا مقابلہ کو رسالہ نقیب کا

اکبر
۱۸ اپریل ۱۹۱۹ء [1]

نقیب میں اکبر الہ آبادی کا کلام مسلسل شائع ہوا اور مولوی قمر الدین احمد بدایونی نے ایک طویل مضمون بعنوان "کلام اکبر پر ایک نظر" لکھا جو نقیب میں برابر شائع ہوتا رہا، اور ممکن ہے کہ ان کا یہی مضمون ان کی کتاب "بزم اکبر" کی تالیف کا محرک ہوا ہو۔

علامہ اقبال سے وحید میاں کے تعارف کا ذریعہ بھی نقیب ہوا۔ طرفین سے خط و کتابت رہی اور کبھی کبھی علامہ اقبال کا کلام "نقیب" میں اشاعت پذیر ہوتا۔ علامہ کے تین خط وحید میاں کے نام محفوظ رہ سکے جو اقبال نامہ حصہ اول (صفحہ ۲۴۵ تا صفحہ نمبر ۲۴۷) میں شامل ہیں۔ نقیب ستمبر ۱۹۱۹ء میں علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل تین شعر بخط اقبال شائع ہوئے۔ [2]

از من اے باد صبا گوئے بدانائے فرنگ — عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را این بجگر می زند آں رام کند — عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است
چشم جز رنگ گل و لالہ نہ بیند ورنہ — آنچہ در پردہ رنگ است پدیدار تر است

وحید میاں نے علامہ اقبال کے کسی شعر کو موضوع بنا کر مضمون لکھنا چاہا تو انہوں نے مندرجہ ذیل رباعی لکھ کر بھیجی کہ اس پر مضمون لکھے۔ [3]

---

[1] انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار (اقبال اکیڈمی کراچی ۱۹۶۷ء) صفحہ ۱۶۵

[2] ایضاً صفحہ ۱۰، ملاحظہ ہو پیام مشرق صفحہ ۲۲۵ - ۲۲۶ -

[3] ایضاً صفحہ ۱۰۶ ۔

تو اے کودک منش خود را ادب کن	مسلماں زادۂ، ترک نسب کن
برنگ احمر و خون و رگ و پوست	عرب نازد اگر، ترک عرب کن

مزید تشریح کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں [1]

"اس زمانے میں سب سے بڑا دشمن اسلام اور اسلامیوں کا نسلی امتیاز و ملکی قومیت کا خیال ہے۔ پندرہ برس ہوئے جب میں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا۔ اس وقت میں یورپ میں تھا اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا"

علامہ اقبال پر وحید میاں کے دو مضمون (۱) انسان اقبال کی نظر میں اور (۲) اقبال اور نظریہ سعی و عمل ان کے مجموعہ مضامین "گرد راہ" میں شامل ہیں۔

خواجہ حسن نظامی سے بڑی بے تکلفی تھی۔ بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے خواجہ صاحب انہیں ماموں کہا کرتے تھے اور ان کے مضامین منادی میں شائع ہوتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی سے خاکسار کا تعارف وحید میاں ہی کے ذریعہ ہوا تھا۔

مولانا محمد علی جوہر کے تو وہ سپاہیوں میں تھے اور ان سے نہایت عقیدت رکھتے تھے۔

قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں۔

"سیاسی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ علی برادران کے ہاتھ میں جھنڈا تھا اور پرجوش اور سرفروش نوجوانوں کا ایک جتھا ان کے گرد و پیش تھا اس جتھے میں وحید احمد صاحب تھے۔ علاوہ محمد علی کے میرے اور ان کے درمیان ایک بڑا رابطہ ان کا ادبی ذوق تھا اور میرے اور ان دونوں کے ادبی ذوق کے پیر مغاں

---

[1] مزار اقبال (ایضاً صفحہ ۱۷۶)

مرحوم ومغفور سید محفوظ علی تھے ۔ ۔ ۔ سید محفوظ علی کی صحبت میں اس زمانہ کے نوجوان اور نازک نقشہ سے درست وحید احمد صاحب سے ملاقات ہوئی پھر جب انہوں نے مرحوم (سید محفوظ علی) کے اشارے سے رسالہ **نقیب** نکالا تو اس کے صفحات پر کچھ مضامین میں نے بھی لکھے۔ (دیباچہ گرد راہ)

پانچ سال کی اسارت کے بعد جب ۱۹۱۹ء میں علی برادران کی رہائی ہوئی تو وحید میاں نے **نقیب** کا ایک خاص نمبر (جنوری ۱۹۲۰ء) نکالا جو نہایت اہم ہے اس میں وحید میاں کے علاوہ قاضی عبدالغفار، میر محفوظ علی بدایونی، سلطان حیدر جوش وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔ اسی خاص نمبر کے لیے علامہ اقبال نے "شہباز و شاہین" کے عنوان سے مندرجہ ذیل شعر لکھے تھے۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند — قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے — مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر — کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپر زاغ و زغن از بند قید صید نیست

ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

مولانا محمد علی جوہر نے عازم یورپ ہوتے ہوئے "بحالت سفر ریل" مندرجہ ذیل خط لکھا ہے اور غالباً پیغام خاص سے نوازا ہے [۱]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نبی کے گھر کا غلام ہو کر قدم بڑھانے میں کیا تامل

یہ راہ وہ راہ حق ہے غافل حسین نے جس پہ سر دیا ہے

محمد علی جوہر عازم یورپ
بحالت سفر ریل ۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء

---

[۱] نقیب جنوری ۱۹۲۰ء

نقیب کے اس خاص نمبر کے سلسلہ میں وحید میاں لکھتے ہیں[1]

"شوکت علی محمد علی کی رہائی کی تقریب مسرت میں نقیب نے یہ اہتمام کیا کہ اس کے آخری نمبر کے تمام صفحات انہیں دو بھائیوں کے لیے وقف ہوں۔ اس بات کا اعتراف ہے کہ جس قدر دلچسپ اس نمبر کو بنانا چاہیئے تھا اس قدر دلچسپ نہ بن سکا۔ عذر کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ گزارش شاید کسی قدر قابل پذیرائی ہو کہ ایڈیٹر ۲۸ جنوری تک تقریباً ان حضرات کے ہمراہ رہا۔ باوجودیکہ اس نمبر کو شوکت علی محمد علی کے لیے وقف کرنا پیش نظر تھا پھر بھی اس عرصہ میں نقیب کے لیے کچھ سامان نہ کر سکا۔ ۲۸ جنوری کے بعد سے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا گیا۔"

وحید میاں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء تا ۲۸ جنوری ۱۹۲۰ء کا "روزنامچہ علی برادران" مرتب کر کے شائع کیا ہے جو خاصہ کی چیز ہے۔

غرض نقیب کے ذریعہ وحید میاں نے خاصا کام کیا اور نام پایا۔ ان کے ہمعصر رسائل و جرائد نے صرف "نقیب" کو سراہا بلکہ وقتاً فوقتاً اس پر گرانقدر رائے کا اظہار کیا ہے چنانچہ صبح امید لکھنؤ جنوری ۱۹۲۱ء کے شمارہ میں "نقیب" بدایوں پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے[2]

"نقیب" (اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۲۰ء) نقیب کے اکتوبر نومبر ایک ساتھ اور دسمبر نمبر علیحدہ تینوں ایک ہی ماہ کے اندر شائع ہوئے ہیں۔ ان تینوں پرچوں میں کئی مضامین قابل قدر ہیں "پیرو مغاں" از محمد عظمت اللہ خاں صاحب اور "عالم ارواح" از سلطان حیدر جوش

---

[1] نقیب جنوری ۱۹۲۰ء [2] جرنل خدا بخش لائبریری پٹنہ نمبر ۱۰-۱۱ (۱۹۷۹ء)

دونوں مضامین دل چسپ ہیں اور اپنے رنگ میں اچھے ہیں... "ہندوؤں کے مختلف مذاہب" عزیز آسیونی نے ایک مفصل اور دل چسپ مضمون لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مضمون نے ہنود کے مذاہب و فلسفہ سے واقف ہونے کی کوشش کی ہے جو اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اہل اسلام بالعموم اس طرف سے لاپروا ہوتے ہیں، قابل تحسین ہے۔ محمد مبین صاحب نازش بدایونی نے حکیم مرزا آغا حسن ازل لکھنوی کا کلام اور بالخصوص ان کی مثنوی سحر عشق پر تبصرہ کیا ہے جو خوب ہے... انہی نمبروں میں حضرت اکبر الہ آبادی کا کچھ تازہ کلام بھی شائع ہُوا ہے۔ مُلک کی موجودہ صُورت حال کو حضرت اکبر نے اپنے مخصوص رنگ میں چند اشعار میں خوب بیان کیا ہے نقیب کے دسمبر نمبر میں صرف ایک مضمون اچھا ہے حامد اللہ صاحب افسر نے "عہد مغلیہ میں ہندوستان میں ترویج تعلیم" کے عنوان سے ایک بسیط مضمون لکھا ہے اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ صاحب مضمون صرف ایف اے کلاس کا طالب علم ہیں، مضمون قابل داد ہے۔"

وحید میاں، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کی اولاد امجاد سے تھے، شیخ چشتی رحمۃ اللہ علیہ ان کے بزرگوں میں تھے وہ تصوف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے خاصا ریاض کیا مختلف مشائخ، صوفیہ اور فقراء سے ملے ان سے گفتگو اور صحبتیں رہیں بعض مجاہدے اور ریاضتیں بھی کیں۔ بدایوں میں شاہ ولایت صاحب کی درگاہ شہر سے دور جنگل میں ہے۔ رات میں وہاں کسی کا گزر نہیں ہوتا۔ وحید میاں راتوں میں شاہ ولایت صاحب کی درگاہ میں بھی رہے۔ مولانا یعقوب بخش راغب بدایونی (ف ۱۹۴۶ء) اس ذوق و جستجو میں ان کے شریک سفر رہے۔ بعض اوقات وحید میاں نے ان واقعات کی تفصیل بھی بیان کی جو اب ذہن میں نہیں رہی۔

وحید میاں کا اخلاق اعلیٰ، طرزِ گفتگو ملائم اور مزاج میں سادگی تھی۔ چھوٹوں بڑوں سب سے محبت سے پیش آتے۔ عجز و انکسار طبیعت میں بدرجہ اتم تھا۔ برصغیر کے نامور اصحاب رشد و ہدایت سے عقیدت رکھتے تھے مولوی محمد امیر گیلانی (رکن توت، پشاور) حکیم اہل سنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری (لاہور) اور شاہ عزیز میاں نیازی (بریلی) وغیرہ سے ان کے روابط تھے۔ تصوف اور تاریخ تصوف کا اعلیٰ ذوق رکھنے کی بنا پر انہوں نے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اور مخدوم صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ، اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور تصوف پر مختلف کتابیں اور مضامین لکھے۔

وحید میاں عمر آباد کے دور آخر کے قلندریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ شاہ مقبول انور قلندر (ف ۲ ذی الحجہ ۱۳۷۹ھ) سے بیعت تھے۔ صابری سلسلے سے وہ نہایت عقیدت و محبت رکھتے تھے اور آخر میں اپنے نام کے ساتھ "صابری" بھی لکھنے لگے تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے ایک نہایت دلچسپ خط حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کو لکھا تھا۔ ۱۹۲۸ء سے خاص طور سے ان کی توجہ تصوف اور روحانیت کی طرف مائل ہوئی۔ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۸ء میں حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے عرس میں شریک ہوئے اور دیوان سید محمد سجادہ نشین پاک پٹن (ف ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء) نے ان سے خاص تعلق اور محبت و شفقت کا اظہار کیا[1]۔

پیلی بھیت سے بدایوں آتے ہوئے ٹرین کے حادثہ میں ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے اور اسی حالت میں ۱۱ جنوری ۱۹۷۷ء کو وحید میاں کا انتقال ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب نے آخری دور کی علالت اور انتقال کی کیفیت اپنے نام ان کی صاحبزادی قریشہ بیگم کے ایک خط کی روشنی میں اس طرح لکھی ہے[2]

---

[1] سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر از وحید احمد مسعود (رضا پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۱ء) صـ ۶۴ و صـ ۲۶ (حواشی اگلے صفحہ پر دیکھیں)

"۵ جنوری کو طبیعت خراب ہوئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ اس نے کہا کہ سردی کا اثر ہے۔ ۶ تاریخ کو آیت الکرسی کا ورد رہا کہ ایک منٹ کو زبان نہ رکی۔ ۷ کو آیت کریمہ اس طرح پڑھی کہ ایک منٹ کو زبان نہ رکی۔ ۸ کو یا اللہ، یا رحمن، یا رحیم مسلسل پڑھتے رہے۔ ۹ کو سکوت کا عالم رہا۔ ۱۰ کو سیدھی جانب دیکھ کر کہتے یا خواجہ! الٹی جانب دیکھ کر کہتے بابا بابا! اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہتے یا اللہ۔ شام کو کہا کہ اگر میرے بعد کوئی میری اولاد میں سے روئے گا تو میری روح کو تکلیف ہوگی۔ رات کو سات بجے کہا کہ آج ہمیں کسی کی ضرورت نہیں ہے کھاؤ، پیو، خوش رہو اور خود شوربا پیا اور پانی خوب پیا۔ وضو کیا اور نماز پڑھی اور سو گئے۔ میرا بھائی وہیں رہا۔ ۱۲ بجے رات اٹھے اور تین مرتبہ پے در پے وضو کیا اور لیٹ گئے اور میرے بھائی سے کہا کہ کمرے کا دروازہ کھول دو، اس نے کھول دیا۔ پانچ آدمی کمرے کے اندر آگئے دو کو نہایت احترام سے اپنی سیدھی طرف بیٹھنے کو کہا اور تین کو اپنی الٹی جانب بیٹھنے کو کہا۔ پھر سامنے دیکھ کر اپنے چہرے کو بالکل سامنے ہاتھ ملا کر کہا ابھی آتے ہیں ابھی آتے ہیں اور با آواز بلند تین بار یا اللہ، یا رحمن، یا رحیم پڑھا۔ پھر خوب آواز سے کلمہ پڑھا اور تین سانسیں لیں اور خالق حقیقی سے جا ملے۔" رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

وحید میاں تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے تاریخ اور تصوف سے ان کو خاص لگاؤ تھا تحقیق کی طرف طبیعت کا خاص رجحان تھا۔ مگر انداز تحریر نہایت پختہ اور ادیبانہ ہے بعض مضامین تو بلا شبہ "انشائیہ" کا نمونہ ہیں۔ کبھی شعر بھی کہتے تھے غالباً یہ جرأت کی بات ہوگی نمونہ ملاحظہ ہو۔

خلاق عالم مختار و توانا ہے   تو آپ ہی سب کچھ ہے اور شل سے بالا ہے

ا؎ گذشتہ سے پیوستہ ؎ سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر (تعارف مصنف) از وحید احمد مسعود ناشر رضا پبلی کیشنز۔ لاہور۔

اضداد میں ممکن ہے اثبات میں کامل ہے — ہرشے کی حقیقت ہے ہرشے سے برا ہے
مشہود تو ہوتا ہے محسوس نہیں ہوتا — مستور ہے جلوت میں خلوت میں ہویدا ہے
میں بندۂ عاجز ہوں اور عجز پہ نازاں ہوں — گر تو جو تری مرضی ہو، مرضی تری اولیٰ ہے
یہ بدر وحید میری تسکین ہی تسکیں ہے — ہوتا ہے وہی آخر جو کچھ ترا منشا ہے

اس نام کی خاطر سے احمد پہ کرم کرنا
ناکارہ و بے بس ہے لیکن ترا بندہ ہے

اب ہم وحید میاں کے تصنیفی و تالیفی کام کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

تصوّف — تصوف کے موضوع پر ایک مختصر رسالہ ہے۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی مرحوم نے رسالہ "الناظر" لکھنؤ میں تصوف پر ایک مضمون لکھا تھا۔ اس سے متاثر ہو کر وحید میاں نے یہ رسالہ لکھا۔ اس کی اساس و بنیاد امام شعرانی کے رشحات قلم ہیں۔

تصوّف کی اصلیت — ۴۸-۱۹۴۷ء میں مسلمانانِ ہند ایک عجیب دورِ ابتلا سے گزر رہے تھے اسی زمانہ میں انہوں نے یہ رسالہ لکھا اور بتایا کہ انتشار و ابتلا کے دور میں صوفیہ نے کیسی شاندار خدمات انجام دی ہیں اور انہوں نے ہر حال میں شرع کا ادب کیا اور تصوف، کتاب و سُنّت سے مستحکم اور اخلاق انبیاء و اصفیا کے سلوک پر مبنی ہے اور احکام شریعت پر عمل کرنے کی ہر حال میں پابندی ہے۔ تصوف کے بعض دوسرے نکات و مسائل پر بھی نہایت سلجھے ہوئے انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ رسالہ مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے اپریل ۱۹۳۹ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔

سوانح بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ — انہوں نے اس کتاب میں عقیدت و روایت سے ہٹ کر تاریخ و تحقیق کی روشنی میں بابا صاحب

رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا مسودہ بھی اشاعت کی غرض سے خاکسار کو ارسال فرمایا میرے چھوٹے بھائی مرحوم محمد نعمت اللہ قادری (ف اپریل ۱۹۸۱ء) نے اہتمام کے ساتھ پاک اکیڈیمی کراچی کی طرف سے شائع کیا اور علمی حلقوں میں کتاب مقبول ہوئی اس کا دوسرا ایڈیشن راقم الحروف کی تحریک پر رضا پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے محترمی حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب نے تعارف لکھا ہے۔

جمالِ صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ

مخدوم صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کے احوال و آثار کے بارے میں ہم عصر مآخذ تقریباً خاموش ہیں۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے ان کی شخصیت کو متعین و مقبول بنایا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ خود ان کے ملفوظات و مکتوبات میں مخدوم صابر رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی حال یا ذکر تک نہیں ہے۔ وحید میاں کو اس سلسلے سے خاص دلچسپی اور وابستگی تھی انہوں نے اس رسالہ میں ان کے حالات کی ترتیب و تدوین کی کوشش کی ہے۔ یہ مختصر سا رسالہ نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا ہے۔

صابری سلسلہ

اس موضوع پر یہ رسالہ مفید اور معلوماتی ہے ۱۹۶۱ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا ہے۔ وحید میاں نے ایک تحقیقی مضمون بعنوان "پیر کلیر کے تذکرے" بھی لکھا تھا جو ہم نے رسالہ "بصائر" کراچی (جلد ۶ شمارہ ۱-۲) میں شائع کیا تھا۔

صابری تعلیمات

اپنے موضوع پر مکمل و مدلل کتاب ہے مگر طبع نہ ہو سکی۔

پٹاری

نواب فرید (ف ۱۶۶۶ء) نے ۱۶۲۵ء تا ۱۶۲۸ء میں شیخوپور کی تعمیر کی بہت سی عمارتیں اور محل سرائیں بنوائیں اور خود پاک پٹن جا کر بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب تبرکات لائے اور انہیں اپنی خواب گاہ کے بالائی تل نے پر محفوظ کیا۔ چونکہ وہ تبرکات پٹاری میں رکھے جاتے تھے لہٰذا اسی نام سے موسوم ہو گئے اور حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے یوم وفات ۵ محرم کو ہر سال

شیخوپور میں ان تبرکات کی زیارت کرائی جاتی ہے شاید یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو کہ نواب مراد کے بیٹے رحیم الدین نے نواب علی محمد خاں (ف ۱۱۶۲ھ) کے پسر چہارم نواب محمد یار خاں امیر (ف ۱۱۸۸ھ) سے جو شعر و تصوف کا ذوق رکھتے تھے، راہ و رسم پیدا کی اور شیخوپور کی پٹاری کے کچھ تبرکات نواب محمد یار خاں کو پیش کر دیئے جب اہل خاندان کو اس کارروائی کا علم ہوا تو نوبت کشت و خون تک پہنچی۔

وحید میاں نے "پٹاری" کے عنوان سے ان تبرکات کی تفصیل قلم بند کی ہے یہ رسالہ ۱۹۵۶ء میں نظامی پریس بدایوں میں چھپا ہے۔

سواء السبیل

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے نظریۂ وحدت الوجود کے مقابل میں نظریۂ وحدت الشہود پیش کیا۔ وحید میاں نے اس رسالہ میں ہر دو نظریات کو بیان کرتے ہوئے اول الذکر کی تائید کی ہے اس موضوع پر شاہ ولی اللہ دہلوی اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی وغیرہ نے بھی رسائل لکھے ہیں۔ یہ تمام مواد ان کے سامنے رہا ہے یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔

اسلام مشرق میں

اس کتاب میں وسط ایشیا کے علاقوں اور قوموں میں اسلام کی تبلیغ پس منظر، تاریخ اور اسلام پھیلانے والوں کی کاوشوں اور کوششوں کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں اپنے طور پر پھیلنے کی پوری صلاحیت موجود ہے اور اہل مشرق کی روحانیت پسند طبیعتوں کا بھی اسلام کو قبول کرنے میں خاصا دخل رہا ہے اس کتاب میں مغلوں کے اسلام لانے کا مختصر مگر جامع ذکر ملتا ہے۔ اس کتاب کے مآخذ زیادہ تر انگریزی اور کم تر فارسی ہیں اس موضوع پر اردو زبان میں یہ اولین کتاب ہے۔ فاضل مؤلف نے اس کتاب کے لیے مواد اس وقت مہیا فرمایا تھا جب وہ یو۔پی گورنمنٹ میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں[1]

"میں یو۔پی گورنمنٹ میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھا۔ اسی زمانہ میں میں نے مغلوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا اور متفرق نوٹ جمع کئے تھے۔ چنانچہ فہرست

میں ان سب کتابوں پر نمبر ڈال دیئے ہیں اور اس کتاب کے متن میں ہر اقتباس پر ماخذ کے نمبر کا حوالہ دے دیا گیا ہے تاکہ واقعات کی سند کا پتہ چل سکے ۱۹۵۲ء میں جب میں اس عہدے سے سبکدوش ہوا تو جمع شدہ نوٹوں کو مرتب و منسلک کرنے کا خیال آیا" (ص ۲)

منصُوری کوہ منصوری کی سیر کے حالات دل چسپ اور ظریفانہ انداز میں لکھے گئے ہیں پہلے مضمون رسالہ نقیب میں شائع ہوا اور بعد ازاں کتابچہ کی صورت میں ستمبر ۱۹۲۰ء میں نقیب پریس بدایوں میں چھپا اور اشاعت پذیر ہوا۔

محبت کی بلندیاں اسلامی تاریخ کے ایک واقعہ کو ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا ہے یہ ڈرامہ ۱۹۵۹ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا ہے۔

نشہ کا اتارنا ہمارا خیال ہے کہ جب ۳۹-۱۹۳۷ء میں یو۔پی میں کانگریس وزارت وجود میں آئی۔ اس زمانہ میں یہ ڈرامہ لکھا گیا تھا پہلے ہاشمی پریس بدایوں میں طبع ہوا پھر یو۔پی گورنمنٹ نے شائع کیا۔

آنریری مجسٹریٹ ان کے خاندان اور شہر بدایوں میں متعدد آنریری مجسٹریٹ تھے۔ خیال ہے کہ ان کو سامنے رکھتے ہوئے ظرافت کے پیرایہ میں اظہار خیال کیا ہے

عقل و عقیدہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی تشریح و تنقید پر مشتمل ہے۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔

دھوپ چھاؤں سیاسی ادبی اور ظریفانہ مضامین کا غیر مطبوعہ مجموعہ ہے۔

انتخاب رسالہ نقیب میر محفوظ علی بدایونی کے مضامین کا انتخاب جسے الناظر بک ایجنسی لکھنؤ نے شائع کیا۔

گرد راہ

ادبی اور سیاسی مضامین کا مجموعہ ہے جس زمانہ میں وہ پارلیمنٹری سیکرٹری تھے اس وقت یہ کتاب مرتب و شائع ہوئی چنانچہ ان کے صاحبزادے فرید احمد مرحوم لکھتے ہیں۔

"یہ فیصلہ کیا گیا کہ جناب والد صاحب قبلہ کے صرف وہ مضامین ایک جگہ جمع ہو جائیں جو حالیہ ہیں اور قریب قریب لکھنؤ میں لکھے گئے ہیں۔ یہ سب مضامین فائلوں کے انبار سے آنکھیں چرا کر اور ملاقات کرنے والے اصحاب سے دامن بچا کر جو ہفتہ کے ان میں قلم بند کئے گئے ہیں اور سب کے سب گویا گرد دن دبا کر لکھوائے گئے یعنی احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں ممکن ہے کہ ان سے موجودہ زمانے کی روش اور تخیل کا ڈھنگ معلوم ہو سکے اور کچھ نہیں تو ان مضامین سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ فرائض منصبی کی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود ادب کے حسین اور پرکشش چشمے پر اس کے تشنہ لب پہنچ ہی جاتے ہیں۔" (پیش لفظ)

گرد راہ میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

(۱) انسان اقبال کی نظر میں (۲) غزل (۳) اقبال اور نظریۂ سعی و عمل (۴) میل ملاپ (۵) ممبروں کے حقوق (۶) بندر کا ناچ (۷) طلوع آزادی۔ (۸) بدایوں میں آزادی کے دن (۹) اکبر کے لطیفے (۱۰) فتح مبین (۱۱) عید کے موقع پر گائے کی قربانی ضروری نہیں (۱۲) مسلمان کیا کریں؟ (۱۳) دیوالی کا پیغام (۱۴) گرونانک صاحب کا فلسفہ (۱۵) ایک صلاح۔

اس کتاب پر تعارف قاضی عبدالغفار نے لکھا ہے اور یہ کتاب رفیع احمد قدوائی کے نام معنون کی گئی ہے اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۴۸ء میں نامی پریس لکھنؤ سے چھپا اور جلد ہی دوسرا اڈیشن

بھی شائع ہوا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ مسلمانوں کی ذہنی جلا اور آزاد ہندوستان کے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

عروج شیخوپور

شیخوپور کے فریدی شیوخ کے اخبار و حالات میں اس خاندان کے مختلف بزرگوں نے لکھا ہے۔ بانی شیخوپور نواب فرید کے حالات مشہور ادیب سلطان حیدر جوش (ف ۱۹۵۲ء) نے "نواب فرید" کے نام سے لکھے ہیں یہ کتاب ۱۹۱۶ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوئی ہے۔

وحید میاں کے پردادا شیخ فتح الدین ولد شیخ شمس الدین نے خاندانی حالات پر مشتمل فارسی زبان میں ایک رسالہ ۱۲۶۹ھ میں لکھا جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔

"فقیر حقیر فتح الدین بن شمس الدین فریدی فاروقی شیخوپوری کہ ایں چند ورقیست دربیان حال حسب و نسب خود از شیخ شمس الدین تا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ و تا حضرت آدم علیہ السلام و چند حالات و بیان دیگر متعلق آں از کتاب جواہر فریدی تصنیف شیخ علی اصغر و کتاب انوار الثقلین تصنیف نواب کشور خاں و دیگر بزبانی بزرگان خود و دیگر ثقات شیخوپور و بدایوں وغیرہ آنچہ کہ در سمع رسیدہ بود در سنہ ۱۲۶۹ ہجری النبوی صلی اللہ علیہ وسلم مطابق سنہ ۱۲۶۰ فصلی و ۱۸۵۳ عیسوی برائے یادگار خود و دریافت برخورداران اقبال نشاناں شیخ شرف الدین و ذوالفقار الدین و مستجاب الدین بقید قلم آوردم"۔

اس رسالہ میں بقول وحید میاں، ستھرے میاں نے اضافہ کیا لیکن یہ حالات مختصر و مبہم لکھے گئے ہیں پھر اس میں مزید اضافے حکیم احمد جان مرحوم نے کئے جس کی ایک بوسیدہ نقل قادری میاں کے پاس بتائی جاتی ہے۔

وحید میاں نے شیخ فتح التمین کے رسالہ کی اساس و بنیاد پر اردو میں ایک کتاب مرتب کردی ان کی نظر سے ستھرے میاں اور حکیم احمد جان مرحوم کے بھی مخطوطے گزرے ہیں۔ وحید میاں نے اس کتاب میں شجرے اپنے زمانہ تک مکمل کردیئے۔ اس میں کہیں کہیں تنقید و تبصرہ بھی کیا ہے۔

راقم الحروف محمد ایوب قادری جب اگست ۱۹۷۰ء میں بدایوں گیا تو وحید میاں نے شیخ فتح التمین کا مؤلفہ رسالہ (تذکرہ خاندان شیوخ شیخوپور) مع اپنے مسودہ کے مجھے مرحمت فرمایا۔ خاکسار نے ۱۹۸۲ء میں اس مسودہ کو صاف اور مرتب کیا اور جب غور کیا تو "عروج شیخوپور" سے ۱۴۰۳ھ برآمد ہوئے چونکہ اس مسودہ کا کوئی نام نہیں تھا لہٰذا میں نے اس کا نام "عروج شیخوپور" رکھ دیا ہے۔ وحید میاں کے ہاتھ کا تحریر کردہ مسودہ میں نے اپنے دوست جمال الدین مونس نظامی (ایڈیٹر ذوالقرنین، نظامی پریس بدایوں) کو دے دیا جنہیں بزرگوں کے آثار جمع کرنے کا شوق ہے۔ "عروج شیخوپور" کی عکسی نقول سید شہید حسین بدایونی، مونس نظامی اور کفیل الدین فریدی نے مجھے بھیجی ہیں۔

سیّد احمد شہیدؒ کی صحیح تصویر

سید احمد شہید بریلوی کی تحریک پر جعفر تھانیسری، ابوالحسن علی ندوی اور غلام رسول مہر نے کام کیا ہے۔ سب سے زیادہ ضخیم کام مہر مرحوم کا ہے انہوں نے سید صاحب کے خطوط اور ہم عصر مفصل کتاب منظور السعداء سے خوب کام لیا ہے۔ ان بزرگوں نے عقیدت و ارادت کے قلم سے حسین تصویر کشی کی ہے، ضرورت تھی کہ سیاسی و تاریخی پس منظر میں اس تحریک کا مطالعہ و تجزیہ کیا جاتا وحید میاں نے اسی نقطہ نظر سے یہ کتاب لکھنے کی کوشش کی ہے اور بعض اہم سوالات و نکات اٹھائے ہیں اور دعوت غور و فکر دی ہے اگرچہ ان کے اخذ کردہ ہر نتیجہ سے اتفاق رائے ضروری نہیں۔

یہ کتاب سب سے پہلے "منادی" دہلی کے ایک خاص نمبر (ستمبر ۱۹۶۵ء) میں شائع ہوئی اور اس رسالہ کے مدیر خواجہ حسن ثانی صاحب نے دعوت دی کہ اس مبحث پر جو صاحب بھی اور خاص طور سے غلام رسول مہر صاحب لکھیں گے تو "منادی" میں ضرور شائع کیا جائے گا چنانچہ لوگوں نے مہر صاحب سے تقاضا کیا کہ وہ جواب لکھیں انہوں نے عذر کیا کہ "منادی" کا مذکورہ شمارہ ان کے سامنے نہیں ہے۔ راقم الحروف نے "منادی" کے اس خاص شمارہ کا ذاتی نسخہ مہر صاحب کو پیش کیا بعد ازاں یہ خاص شمارہ اگست ۱۹۶۶ء میں لاہور سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا۔ راقم الحروف چاہتا تھا کہ مہر صاحب اس کتاب پر اظہار خیال فرمائیں مگر وہ طرح دے گئے اور اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۷۰ء میں ارقام فرمایا۔

"باقی رہا سید احمد شہید کا معاملہ تو جناب من صاحب اس عاجز نے اپنی زندگی کے بیشتر سال اس تحریک کی چھان بین میں گزارے، بے خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ سید احمد شہیدؒ کے متعلق اتنی کتابیں شاید کسی نے دیکھی ہوں جتنی میں نے دیکھیں۔ سید شہید کے مقامات جہاد اس تفصیل سے غالباً آج تک کوئی نہ دیکھ سکا لیکن .... والوں کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ وقت گزر جاتا ہے تو چند الٹی سیدھی باتیں لکھ کر ایک رسالہ چھاپ دیتے ہیں۔ اس نوع کی لغویات میں کون وقت صرف کرے .... میں پچھلے دنوں بیمار ہو گیا نزلی بخار نے خاص تنگ کیا ابھی تک صحت کاملہ نصیب نہیں ہوئی۔ بلغم کی تولید اور ایک حد تک انجماد کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ذرا طبیعت صاف ہو جائے تو ان شاء اللہ اس پر بھی لکھنا ہے جس میں از سر نو مسئلہ کے بنیادی حقائق واضح ہو جائیں گے۔ بالفعل انتخابات کے جھگڑوں میں سب لوگ مصروف ہیں۔ ان ہنگاموں میں نہ ملے مضامین چھاپنے کا کسی کو ہوش ہے اور نہ پڑھنے کا۔"

اس کے بعد جب مہر صاحب کی مندرجہ ذیل تحریر نظر سے گزری تو اطمینان ہوگیا کہ اس باب میں وہ کچھ نہ لکھیں گے۔[1]

> "سرسید مرحوم نے مصلحۃً غلط باتیں کہی تھیں اور آپ جانتے ہیں کہ وہ "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" کے قائل تھے۔ میں مجاہدین کی شان و آبرو بحال رکھنے کا قائل ہوں اگرچہ وہ سابقہ بیانات یا توجیہات سے عین مطابق نہ ہو"

ڈاکٹر امروت کی درخواست پر وحید میاں نے اپنے حالات بھی لکھے تھے مگر کچھ دنوں کے بعد انہوں نے اطلاع دی کہ "میں نے وہ کتاب ضائع کر دی" خدا کرے اس کا کوئی مسودہ وغیرہ کہیں محفوظ ہو تو وہ ایک علمی ادبی اور تاریخی شاہکار ہوگا۔ وحید میاں کی مراسلت سیاسی، علمی اور ادبی حضرات سے ہوتی تھی۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ ان کے خطوط جمع کیے جائیں۔

آخر میں ہم ان کی کتاب "سوانح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ" پر اظہار خیال کرتے ہیں۔

سوانح خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ

برصغیر میں سب سے پہلے مسلمانوں کے قدم سندھ مکران میں پہنچے اور محمد بن قاسم نے اس علاقہ میں اسلام روشناس کرایا۔ دوسرا دور غزنویوں کے عہد اقتدار سے شروع ہوا۔ دولت غزنویہ میں موجودہ پاکستان کا کم و بیش تمام علاقہ شامل تھا۔ سیاسی اقتدار اور علماء و مشائخ کے قیام اور کوششوں کی بدولت جلد ہی یہاں اسلامی معاشرہ کو تقویت حاصل ہوئی۔ جگہ جگہ صدہا مساجد اور مدارس قائم ہوئے۔ عربی فارسی کی نشر و اشاعت ہوئی اور لاہور ایک اسلامی شہر بن گیا۔ عوفی نے اپنے تذکرہ لباب الالباب میں ایک باب "فضلائے غزنین و لاہور" پر لکھا ہے۔ ان شعراء میں ابوالفرج رونی (ف تقریباً ۵۰۰ھ) مسعود سعد سلمان (ف ۵۱۵ھ) مشہور شاعر ہیں ان دونوں کے دیوان زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

اس زمانہ میں لاہور میں شیخ حسین زنجانی، حضرت داتا گنج بخش اور شیخ اسماعیل محدث

---

[1] افادات مہر مرتبہ ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی (لاہور ۱۹۷۴ء) ص ۲۳۱ - ۲۳۲

جیسے صوفیہ وعلما مقیم ہیں اور وہ تبلیغ و تذکیر کے فرائض انجام دے کر ان علاقوں میں اسلام کو سربلند کر رہے تھے
ان ہی بزرگوں کی کوششوں سے برصغیر کی مختلف قومیں اور قبیلے مشرف باسلام ہوتے اور بہت سے
خاندان اور صاحب حیثیت افراد مختلف دیار و امصار سے لاہور میں سکونت پذیر ہوئے اور انہوں نے
اسلامی معاشرہ کو تقویت دی۔

جیسا کہ یمین خاں لاہوری لکھتے ہیں:[1]

ایں سلسلہ ورود دانشمنداں از افغانستان و ترکستان و ایران بہ پایہ تخت لاہور
غزنویاں از عصر مسعود اول) ابن محمود غزنوی تا آخر عصر ابراہیم غزنوی یعنی از سال
۴۲۱ھ تا سنہ ۴۹۲ تقریباً ہفتاد سال ادامہ داشت تا آنکہ یک جمع غفیر از
دانشمنداں و سخنوران فارسی گویاں در لاہور مستقلاً سکنی گزیدند۔"

سید ہاشمی فرید آبادی پورے غزنوی دور پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:[2]

" نئے پایۂ تخت لاہور میں ہم کئی اول درجہ کے صاحبان علم و فضل اور معیاری
شعرا کے نام سنتے ہیں جو دربار خسرو ملک کے متوسل تھے۔ ۔ ۔ بہر حال لاہور ہی سے
امام صغانی جیسے بزرگ استاد حدیث اور آداب الحرب والشجاعہ کا مشہور مصنف
فخر مدبر مبارک شاہ منسوب کئے جائیں گے۔

علماء اور صدور میں چند نام ان کی شعر گوئی کی بدولت سلامت رہ گئے ہیں جیسے
(۱) افصح العجم اعجوبۃ الزمان سراج الدین منہاج (۲) ثقۃ الدین جمال الفلاسفہ
یوسف ابن محمد دربندی (۳) شہاب الدین محمد ابن رشید محتاج (۴) یوسف ابن

---

[1] تاریخ شعر و سخن دران فارسی در لاہور از یمین خاں لاہوری (نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی ۱۹۷۱ء)

[2] مآثر لاہور از سید ہاشمی فرید آبادی (ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۵۶ء) صفحہ ۱۳۵

فخر کاتب اور (۵) ضیاالدین عبدالرافع طبیب، ایک باکمال انشاپرداز اور شاعر جسے خسرو ملک نے قید اور آخر میں قتل کرا دیا (۶) نصراللہ فرقدی تھا۔ خاص دربار کے شعرا میں علی ابن عمر اور ابوبکر خسروی کا تذکرہ ملتا ہے۔"

غوری حکومت کے قیام کے ساتھ ساتھ برصغیر میں چشتیوں کا داخلہ ہوا اور ان کے قائد و رہنما اور اس سلسلے کے بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہیں۔ انہوں نے دیار ہند میں شجر اسلام کو بار آور کیا۔ ان کی قربانیاں ہر اعتبار سے بے مثال ہیں کہ وہ رائے پتھورا کی راجدھانی کفرزار اجمیر میں بیٹھ کر اصلاح معاشرہ میں مشغول ہو گئے۔ لوگوں کو اللہ کے پیام سے روشناس کرانے لگے اور گویا یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا○ کا منظر پیش کر دیا۔ انہوں نے اپنے خلفا کو گجرات، دکن اور شمالی ہند میں پھیلا دیا اور اصلاح و تبلیغ کی تحریک برپا کر دی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے احوال و آثار ہم عصر مآخذ اور تاریخی نوشتوں میں محفوظ نہ رہ سکے لیکن تعلیم اور اثر و نفوذ کا سلسلہ جاری و ساری رہا۔ سیر الاولیا پہلی کتاب ہے جس میں حضرت خواجہ کا ذکر ملتا ہے۔ فوائد الفواد اور خیر المجالس کے ذریعہ بات آگے بڑھتی ہے۔ سیر العارفین پہلا تذکرہ ہے کہ جس میں حضرت خواجہ کے حالات قدرے تفصیل سے پیش کئے ہیں اور بعد کے تذکرہ نویسوں نے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔ شاید یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو کہ سیر العارفین کے مؤلف نے سیر الاولیا، فوائد الفواد اور خیر المجالس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے اور مشائخ چشت سے منسوب دیگر ملفوظات انیس الارواح دلیل العارفین، فوائد السالکین، اسرار الاولیا، راحت القلوب، افضل الفوائد، اور مفتاح العاشقین وغیرہ کا کوئی حوالہ یا ذکر نہیں کرتا۔ ہمارا خیال ہے کہ یا تو یہ ملفوظات اس وقت تک وجود ہی میں نہیں آئے تھے یا جمالی نے ان کو خود ہی مسترد کر دیا۔

ظن غالب ہے کہ یہ مواد دورِ مغلیہ میں وجود میں آیا کیونکہ اکبر اعظم نے پیادہ پا اجمیر جا کر گزر

اجمیر کی اہمیت میں اضافہ کر دیا۔ رؤسا، امراء اور شاہزادگان کی توجہ ہوئی اکبری اور شاہجہانی تعمیرات اس کا بین ثبوت ہیں بہر حال عہد سلطنت میں یہ صورت حال نہ تھی۔ تاریخ فرشتہ اور آئین اکبری وغیرہ میں بھی حضرت خواجہ کا ذکر ملتا ہے۔

اردو زبان میں حضرت خواجہ کے حالات بعض غیر معروف مصنفین نے عقیدت و ارادت کے انداز میں لکھے اور غالباً عبدالباری معینی اجمیری پہلے شخص ہیں جنہوں نے تاریخ السلف (۱۹۲۵ء) لکھ کر تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر عبدالباسط ایم۔ اے لکھتے ہیں [1]

"تاریخ السلف ایک ایسی کتاب ہے جو اردو لٹریچر میں ایک نرالی حیثیت رکھتی ہے جناب مولوی عبدالباری صاحب معینی اجمیری نے حضرت خواجہ صاحب کے حالات پر تنقید کی ہے اور انہیں تاریخ کی روشنی میں لانے کی کوشش کی۔۔۔۔ مصنف موصوف نے حضرت خواجہ صاحب کے حالات پر تاریخی اصول سے روشنی ڈالی ہے۔"

اس طرح کی دوسری کوشش ندوم حسن زبیری نے معین الارواح (۱۹۵۲ء) لکھ کر کی وہ بھی تاریخ و تحقیق کی روشنی میں آگے بڑھتے ہیں اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہوئے ایک مفصل اور ایک مختصر۔ برصغیر کی تہذیبی و ثقافتی تاریخوں میں بھی حضرت خواجہ کے حالات اور تعلیمات کا ذکر ملتا ہے اس سلسلہ میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی بزم صوفیہ، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تاریخ دعوت و عزیمت اور شیخ محمد اکرام کی آب کوثر قابل ذکر ہیں مگر تعجب ہے کہ مؤلف آب کوثر نے ایک شخص "معین الدین ترکی" کو حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ قرار دے دیا۔ طبقات ناصری کی واضح عبارت ملاحظہ ہو [2]

---

[1] علی گڑھ میگزین ۱۹۲۶ء ص ۱۱۲

[2] طبقات ناصری از منہاج سراج (مرتبہ عبدالحی حبیبی) (کابل ۱۳۴۲ ش) ص ۳۰

این داعی از ثقہ شنید کہ از معارف بلاد — اس مؤلف نے ایک معتبر آدمی سے سنا کہ جو
تولک وجبال بود لقب او معین الدین — تولک اور پہاڑی علاقوں کے شہروں کا سربرآوردہ
او می گفت کہ من درآں لشکر با سلطان — شخص تھا اس کا لقب معین الدین تھا وہ کہتا تھا
غازی بودم، عدد سوار لشکر اسلام — کہ میں اس لشکر میں سلطان غازی کے ہمراہ تھا
درآں وقت صد و بیست ہزار برگستواں بود — اور اسلام کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سوار تھی

شیخ اکرام نے ثقہ از معارف بلاد تولک وجبال" کو معلوم نہیں کس بنیاد پر حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ تصور کر لیا۔

وحید میاں (ڈاکٹر پیرزادہ احمد مسعود) نے نہایت دقت نظر، محنت اور عصری و تاریخی پس منظر میں تحقیق و تدقیق کے ساتھ حضرت خواجہ کے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ اس موضوع پر فارسی اردو اور انگریزی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ان کے پیش نظر رہا ہے۔ وہ تاریخ کا صحیح ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے نقل ور نقل کی روایت کو رد کرتے ہوئے درایت کی روشنی میں حضرت خواجہ کے صحیح حالات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان کی کتاب سوانح خواجہ معین الدین اجمیریؒ ایک مفصل مقدمہ اور بائیس ابواب پر مشتمل ہے متن کتاب میں حسب موقع خاص خاص ماخذ پر تنقید و تبصرہ بھی کیا گیا ہے جس سے ان کی دقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب کا مقدمہ اور اس کا تیرھواں باب تصوف اور تاریخ تصوف کے اعتبار سے نہایت اہم ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر انہیں کامل عبور حاصل ہے ان کے دلائل نہایت واضح ہیں۔ تصوف قبل از اسلام، دور صحابہ، تدوین حدیث، مشاجرات صحابہ، خلافت امویہ و عباسیہ، ائمہ اربعہ

لہ ملاحظہ ہو آب کوثر از شیخ محمد اکرام (فیروز سنز، لاہور، ۱۹۵۲ء) ۲۲۶۔

کی دینی خدمات، عباسی دور میں مختلف مسائل و نظریات کا ظہور اور ان کا رد، تصوف کا تحریک کی صورت میں ظاہر ہونا اور اس کے ارتقا پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ وحدت الوجود پر عالمانہ اور محققانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔

حضرت خواجہ کے نام، مقام پیدائش، سنہ پیدائش، سفر، ہندوستان میں آمد، تبلیغ و اشاعت، اخلاق و عادات غرض حیات خواجہ کا ایک حسین مرقع پیش کیا ہے۔ بلاشبہ فاضل مؤلف کی نہایت کامیاب کوشش ہے۔

سنہ ۱۹۶۰ء میں جب خاکسار بدایوں گیا تو انہوں نے اس کتاب کا مسودہ خاکسار کو مرحمت فرماتے ہوئے کہا۔

سپردم بتو مایۂ خویش را ۔۔۔۔ تو دانی حساب کم و بیش را

میں نے سنہ ۱۹۶۱ء میں یہ کتاب سلمان اکیڈمی کراچی کی طرف سے شائع کرا دی بمقام مسرت ہے کہ علمی و تاریخی حلقوں میں اس کتاب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ چونکہ یہ کتاب نایاب تھی جناب محترم حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کی تحریک پر میاں محمد زبیر احمد صاحب قادری سجادہ نشین حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ (رضا پبلی کیشنز، لاہور) اسے نہایت آب و تاب سے شائع کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کامیابیوں اور کامرانیوں سے نوازے۔[1]

محمد ایوب قادری
۲۸ اگست سنہ ۱۹۸۳ء بروز اتوار

۹/۱۷۶/۴
ناظم آباد، کراچی

---

[1] ناشر (میاں زبیر احمد) نے یہ تعارف جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم سے جناب وحید احمد مسعود کی تصنیف "سوانح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ" کے لئے لکھوایا تھا۔ اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اب جناب وحید احمد مسعود کی تصنیف "سید احمد شہید کی صحیح تصویر" کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

کتابیات

کتاب	مصنف
۱۔ سوانح احمدی	مولوی محمد جعفر تھانیسری
۲۔ حیات طیبہ	مرزا حیرت دہلوی
۳۔ سیرت سید احمد شہید	مولانا ابوالحسن ندوی
۴۔ سید احمد شہید	مولانا غلام رسول مہر
۵۔ برکات اسلام	مولوی محمد جعفر تھانیسری
۶۔ سیف الجبار	مولانا فضل رسول بدایونی
۷۔ باغی ہندوستان	مولانا عبدالشاہد خان شروانی
۸۔ صراط مستقیم	سید احمد شہید رائے بریلوی
۹۔ تقویۃ الایمان	شاہ اسماعیل دہلوی
۱۰۔ تحفۂ محمدیہ	سید اشرف علی گلشن آبادی
۱۱۔ الاستمداد علی اجیال الارتداد	مولانا احمد رضا خان و مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی
۱۲۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز	
۱۳۔ موج کوثر	شیخ محمد اکرام آئی۔ سی۔ ایس
۱۴۔ سوانح قاسمی	مولانا مناظر احسن گیلانی
۱۵۔ روضات	شیخ عبدالحق محدث دہلوی
۱۶۔ تذکرۃ الرشید	مولانا عاشق الٰہی میرٹھی
۱۷۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک	مولانا عبیداللہ سندھی
۱۸۔ الیاقوتۃ الواسطۃ	مولانا احمد رضا خان بریلوی

۱۹۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔

۲۰۔ تذکرہ علماء ومشائخ سرحد مولانا محمد امیر شاہ قادری پشاوری

۲۱۔ امداد المشتاق مولانا اشرف علی تھانوی

۲۲۔ ابو الکلام کی کہانی خود ان کی زبانی عبد الرزاق ملیح آبادی

۲۳۔ حجۃ اللہ البالغہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

۲۴۔ حالات [illegible] وہابیہ

۲۵۔ الکوکبۃ الشہابیہ مولانا احمد رضا خان بریلوی

۲۶۔ مقالات سرسید حصہ شانزدہم

۲۷۔ ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا (انگریزی) از تارا چند

28- MILL'S, HISTORY OF INDIA VOL V.

29- MILL & NELSON, HISTORY OF INDIA 5TH EDITION VOL III.

30- A.B. KIETH, A CONSTITUTION HISTORY OF INDIA 2ND EDITION,1937.

31- HISTORY OF ENGLAND IN THE 18TH CENTURY VOL 4TH.

32- NOTES ON INDIAN AFFAIRAS VOL.11

33- RECORDS OF INDIAN FACTS VOL 1

34- T.G. SPEAR, THE NOBLES.

35- THOMSON EDWORD, THE MAKINGOF INDIAN PRINCES.

36- CAMBRIDGE, SHORT HISTORY OF INDIA.

37- REGENOL REYNOLD, THE WHITE SAHIBS OF INDIA.

38- R.C. DUTE, COMMITTEE OF CIRCUITSMINUTES SEP,15-1925.

39- WOODRUF PHILIP, THE MAN WHO RULED IN INDIA, THE FOUNDERS.

40- LACKY, A HISTORY OF ENGLAND IN THE 18TH CENTURY VOL IV.

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆